شمارہ ۴-۵
زبان و ادب کا ترجمان
ایوانِ ادب
اس شمارے کی قیمت =/۶۰ روپے
خصوصی شمارہ : گوشۂ مجروحؔ سلطان پوری، علی سردار جعفری، حاجی انیسؔ دہلوی

الحاج نعمت اللہ انیسؔ دہلوی
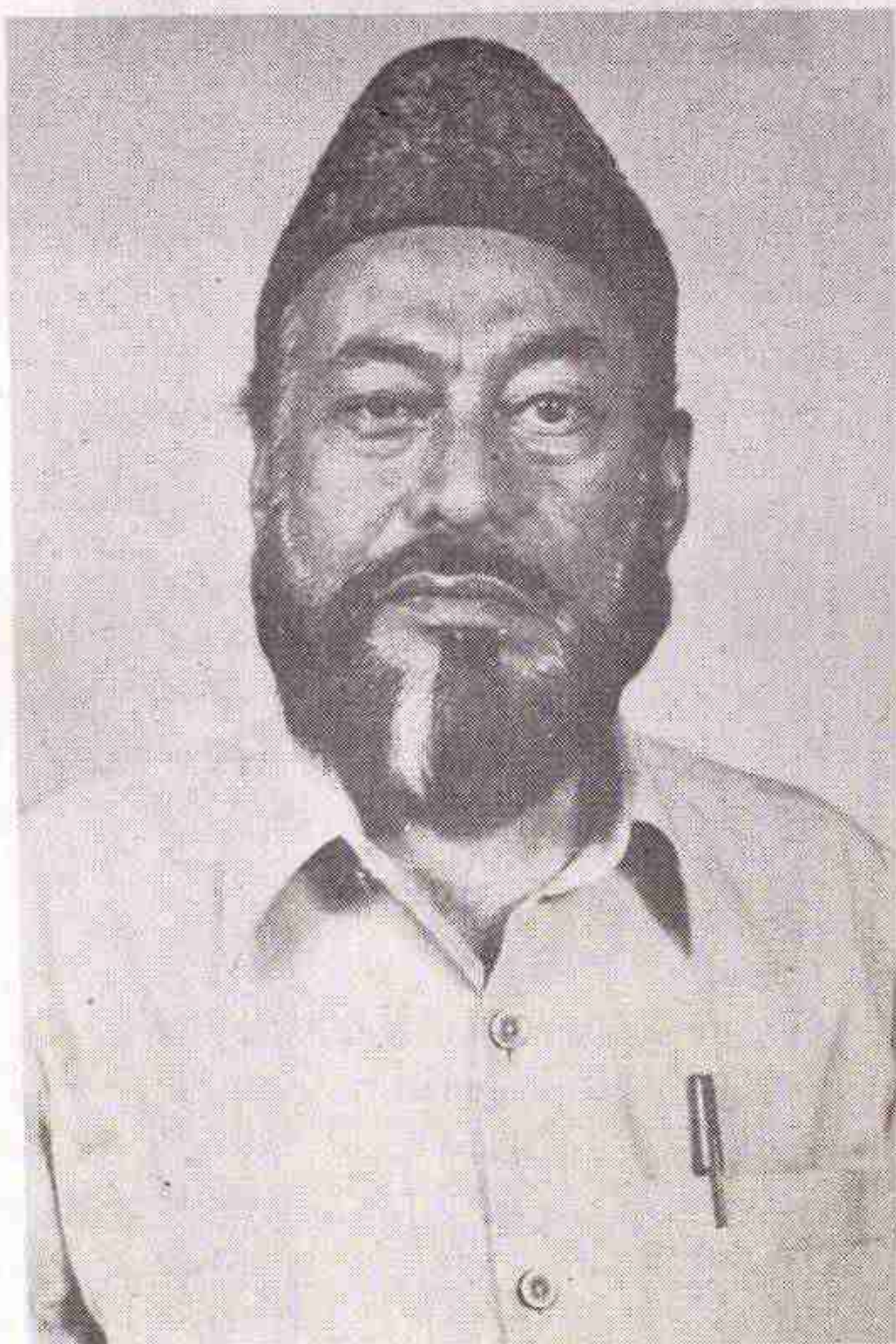
۷ / ستمبر ۱۹۳۰ء ــــــــــــــــــ ۳۰ / دسمبر ۲۰۰۰ء

اسمائے گرامی سفیرانِ سہ ماہی ایوانِ ادب دہلی

لندن	: گلشن کھنہ	دوحہ قطر	:	ملک مصیب الرحمن
دبئی	: شاہدہ سلیم جعفری	جرمنی	:	ارشاد احمد ہاشمی
ابو ظہبی	: ظہور السلام جاوید	بحرین	:	طٰہٰ آفندی
مسقط	: انجمیس	سعودی عرب	:	درویش رمضانی
ناروے	: جمشید مسرور	آسٹریلیا	:	ساوتری گوسوامی
نیپال	: زاہد آزاد	پاکستان	:	مقبول دہلوی
ممبئی	: عبدالاحد ساز	کراچی	:	عارف شفیق
دہلی	: مخمور سعیدی	سری نگر	:	نسرین نقاش
کلکتہ	: ف. س. اعجاز، فراغ روہوی، برکت اللہ خاں			
ہوڑہ	: ضمیر یوسف	بھوپال	:	ظفر صہبائی
۲۴ پرگنہ	: شمیم انجم وارثی	بھوپال	:	طرزی
جموں	: امین بنجارا	حیدر آباد	:	مومن خاں شوق
رام پور	: محمد اطہر مسعود خاں	نجیب آباد	:	مرغوب خاں
پٹنہ	: رضوان احمد	وشاکھاپٹنم	:	عثمان انجم
بنگلور	: ضیاء جعفر	اندور	:	عزیز اندوری
ٹونک	: عزیز اللہ شیروانی	جبل پور	:	شیخ نظامی
سرونج	: محمد توفیق خاں، سیفی سرونجی	مالیر کوٹلہ	:	ڈاکٹر ریاض خلجی
علی گڑھ	: شاہد قمر آفریدی	بلرام پور	:	ڈاکٹر کلیم قیصر
رڑکی	: افضل منگلوری	اودے پور	:	اقبال ساگر
گوالیار	: شکیل گوالیاری	سمستی پور	:	ناشاد اورنگ آبادی
کنیڈا	: ارشد عثمانی	ناگپور	:	انصاری اصغر جمیل
شاہجہاں پور	: ڈاکٹر یوسف گوہر	گجرات	:	شکیل اعظمی
کامٹی	: خلیل انجم	شیوپوری	:	ڈاکٹر مہندر اگروال
جے پور	: محمد شاہد پٹھان	کھرر	:	کرشن پرویز
مغل سرائے	: غلام جیلانی	وارانسی	:	نظر کانپوری

○ سفیران سے التماس ہے کہ وہ "ایوانِ ادب" کو فروغ دیں۔ زیادہ سے زیادہ سالانہ خریدار بنائیں۔ تخلیق کاروں سے معیاری تخلیقات حاصل کر کے ادارے کو بھجوائیں۔ (ادارہ)

بانی: حاجی انیس دہلوی

خصوصی شمارہ ۲۰۰۱ء

خصوصی شمارہ

گوشۂ مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری، حاجی انیس دہلوی

مدیر اعلیٰ: کفایت دہلوی

مدیر (اعزازی): ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی

معاونین: عبدالغنی دہلوی منتظم اعلیٰ: ناصر دہلوی

نگراں: سمیع دہلوی نگراں حصۂ شعری: قمر سنبھلی

قیمت فی شمارہ = /۶۰ روپے سالانہ = /۲۰۰ روپے

بیرون ممالک سالانہ خریداری (بشمول رجسٹری و ڈاک)

پڑوسی ممالک	خلیج و سعودیہ	برطانیہ	دیگر ممالک
=/600 روپے	80 درہم	25 پونڈ	35 ڈالر

پاکستانی قلمکار اپنی نگارشات ہمارے نمائندہ کو درج ذیل پتے پر ارسال کر سکتے ہیں
مقبول دہلوی 10/12 نسبت روڈ، لاہور (پاکستان) فون نمبر: 7227199

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: وحیدہ بیگم (اہلیہ انیس دہلوی مرحوم)

ایوان ادب کا انٹرنیٹ پتہ: www.aiwan-e-adab.com

ترسیل زر و خط و کتابت کا مستقل پتہ:
Aiwan-e-Adab Quarterly
2936, Turkman Gate, Delhi-110006
Ph.: 3230453, 3232714

ایوان ادب کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

کمپوزنگ: رہبر کمپیوٹرز، دہلی۔ طباعت: رہبر آفسیٹ پرنٹرز، دہلی

حسن ترتیب

غزلیں

ذکر رفتگاں

نظمیں

افسانے

رباعیات اور ماہیے

انشائیہ / مزاحیہ

وفیات

تبصرے

حمد

راتوں کو عبادت کرتے ہوئے، یہ دیدۂ تر سبحان اللہ
روشن ہیں ہماری پلکوں پر کیا شمس و قمر سبحان اللہ

جب ذکر کیا اللہ ترا، ہم سوزشِ غم سے چھوٹ گئے
یہ غم سے سلگتی روحوں پر رحمت کا اثر سبحان اللہ

ملتا ہے سکونِ دل کیا کیا مومن کو طوافِ کعبہ میں
اللہ کا گھر پر تو جنت، اللہ کا گھر سبحان اللہ

اُمت میں کیا اُن کی پیدا، اللہ جو ہیں محبوب تجھے
قرآن سا شیریں تر ہم کو بخشا ہے ثمر سبحان اللہ

یہ پیڑ پرندے، سبزہ و گل، یہ بہتے دریا چاندی سے
یہ اوس کی بوندیں پتوں پر، یہ لعل و گہر سبحان اللہ

آتی ہے سہانی چاندنی شب، دن بھر کی سلگتی دھوپ کے بعد
ترتیب سے کیسے چلتے ہیں، یہ شام و سحر سبحان اللہ

لاریب انیسؔ اس دنیا میں ہر چیز عطا ہے اُس کی ہی
یہ عقل و ذہانت کے مظہر، سب علم و ہنر سبحان اللہ

انیسؔ دہلوی

نعت

دلی جذبات پر رہتا نہیں قابو مدینے میں
نکل پڑتے ہیں بس بے ساختہ آنسو مدینے میں

معطّر ذرّہ ذرّہ ہے، مہکتے ہیں در و دیوار
بسی ہے میرے آقاؐ آپ کی خوشبو مدینے میں

خدا کی حکمرانی ہے، محمدؐ کی شہنشاہی
ہوائے کفر کا چلتا نہیں جادو مدینے میں

وہاں پہنچو تو اُن کو سچے دل سے یاد کرلینا
نظر آئیں گے تم کو مصطفیٰؐ ہر سُو مدینے میں

کرم رب کا یہ فیضِ سرورِ کونین ہے بے شک
کہ سونا بن گئی ہے دیکھئے بالو مدینے میں

وہیں کی خاک کا میں رزق بن جاؤں تو اچھا ہے
مرے اللہ پہنچا دے مجھے پھر تو مدینے میں

کرم تھا عام آقاؐ کا انیسؔ اپنے پرائے پر
تھے بیکس کا سہارا آپؐ کے بازو مدینے میں

انیسؔ دھلوی

"**اقبالیات**" پر بے شمار کتابیں

اور جرائد کے "**اقبال نمبر**"

ان کے بعد

کسی "**اقبال نمبر**" کی گنجائش ہے۔۔۔؟

اقبال محدود موضوع نہیں!

۲۱ویں صدی میں اقبال کی معنویت

ایوانِ ادب کی خصوصی پیش کش

اقبال نمبر

تفصیلات اگلے شمارے میں!!

اپنی بات

ایوان ادب کا یہ شمارہ غیر معمولی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔ پہلے مدیر اعلیٰ حاجی انیس دہلوی کی علالت اور پھر رحلت سے جو صورت حال پیدا ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ اس سانحہ سے ہم لوگ ابھی تک نہیں سنبھلے۔

زیر نظر شمارے میں شامل بیشتر مضامین اور گوشے مجروح سلطانپوری اور علی سردار جعفری، حاجی صاحب مرتب کر چکے تھے کسے معلوم تھا کہ ان کے ساتھ ہی ایک اور گوشہ بھی شامل اشاعت ہوگا اور یہ گوشۂ حاجی انیس دہلوی ہوگا۔

حاجی انیس دہلوی نے بہت چاؤ سے "ایوانِ ادب" کی داغ بیل رکھی تھی اور ان کی زبردست خواہش تھی کہ وہ اسے اردو زبان و ادب کا ایسا ترجمان بنائیں جو عوام اور خواص میں یکساں مقبول ہو۔ اس تعلق سے انھوں نے ایک منصوبہ تیار کیا تھا کہ ہر شمارہ کسی زندہ ادیب یا شاعر کی ذات سے منسوب ہو۔ لہٰذا افتتاحی شمارہ صف اول کے معروف شاعر جگن ناتھ آزاد کے لیے مخصوص تھا، دوسرا شمارہ مشہور ادیب جوگندر پال کے نام اور تیسرا شمارہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری خلیق انجم کی کثیر الجہات شخصیت پر خاص نمبر تھا۔ چوتھا شمارہ بھی اردو شعر و ادب کی کسی اہم شخصیت سے متعلق شائع ہوتا لیکن حاجی صاحب اپنی علالت کے باعث اس ذات گرامی کا انتخاب نہ کر سکے۔

"ایوانِ ادب" کے موجودہ شمارے میں تین گوشے ہیں جو مجروح سلطانپوری، علی سردار جعفری، حاجی انیس دہلوی اور وفیات کے تحت مضامین کالی داس گپتا رضا، قتیل شفائی اور ڈاکٹر مغیث الدین فریدی کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس طرح "ایوانِ ادب" کا یہ شمارہ بھی ایک خصوصی اشاعت ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہم حاجی انیس دہلوی کے مرتب کردہ منصوبے کی تکمیل کریں اور "ایوانِ ادب" آپ کی اور حاجی صاحب (مرحوم) کی خواہشات کے مطابق تسلسل سے شائع ہوتا رہے۔ اس اشاعت میں

شمارہ نمبر ۴-۵ شامل ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ جلد ہی شمارہ نمبر ۶ شائع ہوگا اور بعد ازاں شمارہ نمبر ۷ ''اقبال'' نمبر ہوگا۔

اس شمارے میں گوشہ سردار جعفری میں موصوف کی ایسی تخلیقات شائع کی گئی ہیں جو انھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں اینگلو عربک کالج میگزین کے لیے تحریر کی تھیں۔ یہ تمام تحریریں ذاکر حسین کالج کے نامور فرزندان کالج نمبر سے ماخوذ ہیں اور پرنسپل کالج سلمان غنی ہاشمی صاحب کے شکریے کے ساتھ شائع کی جارہی ہیں۔

امید ہے کہ ایوان ادب کی یہ خصوصی اشاعت آپ کی توقعات پر پوری اترے گی۔ ہمیں آپ کے تاثرات اور گراں قدر مشوروں کا انتظام رہے گا۔

☆☆☆ قارئین کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ موجودہ شمارے سے ''ایوانِ ادب'' انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔ اس کا پتہ www.aiwan-e-adab.com ہے۔

(ادارہ)

گوشۂ مجروح سلطان پوری

○

چمن میں آتش گل پھر سے بھڑکانے بھی آئیں گے
خزاں آئی اب صحرا سے دیوانے بھی آئیں گے

❑

الگ بیٹھے ہیں پھر بھی آنکھ ساقی کی پڑی ہم پر
اگر ہے تشنگی کامِل تو پیمانے بھی آئیں گے

❑

یہ دنیا میری روداد محبت سے نہ اکتائے
اسی رو داد میں دنیا کے افسانے آئیں گے

❑

وہ آرہے ہیں سنبھل سنبھل کر، نظارہ بیخود جواں ہے
جھکی جھکی ہیں نشیلی آنکھیں، رُکا رُکا دورِ آسماں ہے

❑

ہم ہیں کعبہ، ہم ہی بُت خانہ، ہمیں ہیں کائنات
ہوسکے تو خود کو بھی اِک بار سَجدہ کیجئے

❑

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

مجروحؔ کی غزل

غزل ہماری آسان ترین اور مشکل ترین صنفِ سخن ہے۔ آسان ترین اس لیے کہ شعر و سخن میں قریب قریب ہر مبتدی اسی صنف میں طبع آزمائی کرتا ہے اور مشکل ترین اس لیے کہ غزل کو ریزہ خیالی کے عیب سے بچالے جانا اور اس کو صحیح معنی میں تغزل بنا کے پیش کرنا ایک معجزے سے کم نہیں، اور یہ معجزہ دکھانے والے شاعروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ اس تعداد کو ہم کتنا مختصر ہی کیوں نہ کرلیں مجروحؔ سلطانپوری کا نام اس فہرست میں ہمیشہ ایک نمایاں اہمیت کا حامل نظر آئے گا۔

ڈاکٹر محمد حسن نے مجروح کی غزل کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''مجروحؔ غزل میں کلاسیکی آئین اور آداب کے قائل ہیں۔'' یہ صحیح ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ راہِ رفتگاں کے آئین اور آداب کو اوّل سے آخر تک قبول نہیں کرتے بلکہ اپنے تیشۂ نظر پر بھروسہ کرتے ہوئے اسے کام میں لاتے ہیں جس سے ان کی غزل میں تاثر کی ایک ہمہ گیر کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور تاثر کی یہی کیفیت مجروحؔ کی غزل کا قابلِ رشک سرمایہ ہے۔

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروحؔ
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

لیکن مجروحؔ کی غزل میں تاثر کی ہمہ گیری کا انحصار صرف اسی ایک بات پر نہیں ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے بلکہ یہ ہمہ گیری اس لیے بھی مجروحؔ کے کلام کی خصوصیت بن گئی ہے کہ ان کی غزل میں ہیئت اور موضوع آپس میں ہم آہنگ ہو گئے ہیں اور اس متوازن انداز سے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا دشوار ہے۔ ہیئت اور موضوع کا اس طرح سے اکائی میں ڈھل جانا ایک ایسا کمالِ فن ہے جو عصرِ حاضر کے غزل گو شعراء میں تو خیر بڑی حد تک مفقود ہے ہی ہمیں اپنے کلاسیکی شعراء میں بھی خال خال نظر آتا ہے۔

ہیئت اور موضوع کی بات کے ساتھ ہی ادب کی ترقی پسند تحریک کے زمانۂ ابتداء و عروج کی طرف ذہن منتقل ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ ادب کی ترقی پسند تحریک کے سامنے جو مقصد تھا اس کے حصول کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہ ایک براہِ راست یا خطیبانہ انداز ہی سے حاصل ہو سکتا ہے کوئی سوچ بچار کی خامی نہیں تھی۔ ان حالات میں ایسا ہی سوچا جا سکتا تھا، اسی لیے غزل ایک بے مصرف اور بے کار صنف قرار پائی۔ اس وقت اگر پوری جماعت کو یہ بات بعید از حقیقت نظر آتی تھی کہ غزل کی تہہ در تہہ معنویت، دروں بینی، انکشاف ذات کا عمل مقصدیت کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے تو اس کا سبب موجود تھا۔ یہ نہیں کہ غزل کے فارم میں ایسی مثالیں نایاب تھیں لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ صرف مسائلِ حیات کو شعر کی زبان دینے کا سوال نہیں تھا بلکہ ایک واضح مقصد کو صنفِ غزل میں نہیں بلکہ تغزل میں ڈھال کے پیش کرنا تھا۔ انتہائے خلفشار کے عالم میں آنے والے انقلاب کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس بے اطمینانی کے دور میں تہذیبی قدروں کو سنبھالنا بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کے پیشِ نظر تھا۔

ان حالات میں مجروحؔ کی غزل نے مقصدیت اور اجتماعی شعور کو اس طرح فن کے ساتھ ہم آہنگ کیا کہ مقصدیت اور اجتماعی شعور نے خود فن کی صورت اختیار کر لی۔

مقصدی شاعری یقیناً باعیب شاعری ہے، اگر مقصد شاعری پہ حاوی ہو جائے۔ لیکن اگر مقصد شاعری میں تحلیل ہو جائے تو پھر وہ مقصدی شاعری نہیں رہے گی، خالص شاعری کہلائے گی۔ ایسی شاعری نظم کی صورت میں ہمارے یہاں موجود تھی لیکن غزل کی صورت میں اس بھرپور انداز سے ہمارے سامنے نہیں آئی تھی جس بھرپور انداز سے مجروحؔ کی غزل میں نظر آئی۔

اس وقت مقصدی شاعری اور خالص شاعری کی بات کرتے ہوئے خالص تغزل کی جس مثال کی طرف میرا ذہن جا رہا ہے وہ ہندوستان میں ان گنت سخن فہموں کی زبان پر ہے۔

جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

اب اس غزل میں رسمِ چمن، نغمہ، فغاں، منزل کارواں، ساغر، پیر مغاں، گل، گلستاں، یہ سب ہماری اردو غزل کے روایتی مستعملات ہیں اور ویسے غزل پر جو اعتراضات ہوتے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ہماری غزل ابھی تک روایتی لفظ و بیان سے پیچھا نہیں چھڑا سکی۔ مجروح نے انہی روایتی مستعملات کو ہاتھ میں لیا اور انھیں تشبیہ اور استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ساری غزل کو ایک ایسا علامتی رنگ دیا کہ ہر لفظ، ہر ترکیب اور ہر بندش اپنا مفہوم تبدیل کرتی چلی گئی۔ گویا اس علامتی اندازِ بیان کے باعث یہ غزل دو مختلف سطحیں لیے ہوئے ہمارے سامنے آتی ہے۔ ایک وہ سطح ہے جو لغوی مفہوم کی حامل ہے، دوسری سطح تہ در تہ معنویت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور ان دونوں کے امتزاج سے اس غزل میں جو کیفیتِ سرمستی و سرشاری پیدا ہو رہی ہے اسی کا دوسرا نام توانائی یا روحِ غزل ہے لیکن ان دونوں سے بڑا کارنامہ اس غزل کا یہ ہے کہ اس میں انفرادی شعور کی جگہ اجتماعی شعور نے لے لی۔ ادب اگر دائمی اقدار کا حامل ہے تو زندگی بھی دائمی اقدار کی حامل ہے اور اس ادب کو جو زندگی کی دائمی قدروں کو اپنے اندر سمولے ''مقصدی ادب'' کہہ کر اسے گردن زدنی قرار دینا غیر علمی اور غیر عملی تنقید ہی کا رویہ ہو سکتا ہے۔ مجروح کے مذکورہ اشعار جو غزل کو اجتماعی شعور سے آشنا کر رہے ہیں اسے اس کیفیت سے بھی لبریز کر رہے ہیں جس سے قاری کا وجدان بھی لذت اندوز ہو رہا ہے اور یہ مختصر سی غزل زندگی کی ابدی حقیقت کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں ادب کی اس حقیقت سے بھی روشناس کر رہی ہے کہ وجدان شعور کی بلند ترین منزل ہے۔

اس غزل کے متعلق سردار جعفری لکھتے ہیں کہ جب مجروح نے مزدوروں کے ایک

جلسے میں اپنی یہ غزل پڑھی تو وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ "مجروح بھی ہمارے شاعر ہیں۔"

مجروح کی غزل کے سامنے جہاں زندگی اور فن کے تقاضے ہیں وہاں اس کی پشت پر ایک تہذیبی اور سماجی پس منظر بھی ہے۔ اس میں سماجی حالات کی ترجمانی بھی ہے اور تہذیبی معاملات کی عکاسی بھی اور ان سب کے امتزاج سے ان کی غزل میں جو ایک بے نام سی کیفیت گداز پیدا ہو جاتی ہے وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔

غزل عشق و محبت کی زبان کا نام ہے۔ لغت نے غزل کے مفہوم کے کئی پہلو ہمارے سامنے رکھے ہیں۔ اس میں بقولِ شمس قیس رازی درد و گداز کی وہ کیفیت بھی آجاتی ہے جو اس وقت غزال (ہرن) کے اندر سے نکلتی ہے جب سگانِ وحشی اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں، لیکن عورتوں کے ساتھ بات چیت کرنے کا معاملہ اپنی جگہ پر رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جنسی لطافت بھی ارکانِ غزل میں بڑی اہمیت کی حامل ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ جنسی کثافت نہ بننے پائے۔ جنسی شاعری اور لمسیاتی شاعری میں کوئی حد فاصل کھینچنا تو دشوار ہے لیکن اس شاعری کی تخلیق خیال کی جس لطافت و طہارت، زبان و فن کے برتنے کے جن آداب اور جس جذباتی پاکیزگی کا تقاضہ کرتی ہے ان کے بیک وقت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونے کی مثالیں ہمیں اردو شاعری میں بہت ہی کم نظر آتی ہیں۔ فراق صاحب اپنی جنسی شاعری کا اپنی بات چیت میں اکثر ذکر کیا کرتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس موضوع پر انھوں نے ہمیں بہت سے خوب صورت اشعار دیے ہیں لیکن نہ جانے وہ جنسی لطافت اور ترغیب جنسی میں کیوں نہ فرق کر سکے ورنہ اس شعر کی داد اپنے سامعین سے طلب نہ کرتے۔

ذرا وصال کے بعد آئنہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

بالخصوص جب اسی غزل میں ایسا لطیف شعر بھی موجود ہے۔

فضا تبسم صبح بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

زمانہ ہوا علی گڑھ میں مشاعرہ ہو رہا تھا جس میں حسرت موہانی نے اپنا کلام بھی پڑھا جسے وہ فاسقانہ کلام کہتے تھے اور خوب داد پائی۔ حفیظ صاحب بھی اس مشاعرے میں شریک تھے اور انھیں بھی حسبِ دستور بہت داد مل رہی تھی کہ انھوں نے ایک شعر پڑھا۔

انجامِ محبت ہو بھی چکا، تم ہنس بھی چکے میں رو بھی چکا
اب اور ابھی تڑپانا ہے یا سینے سے لگ جانا ہے

علی گڑھ کے سامعین بالکل خاموش ہوگئے۔ ایک فرد واحد نے بھی داد نہ دی۔ مشاعرے کے بعد حفیظ صاحب نے سرور صاحب سے اس بات کا ذکر کیا اور اس پر حیرت کا اظہار کیا کہ اس شعر پر بالکل داد نہیں ملی حالانکہ جنسی شاعری حسرت موہانی بھی پیش کر رہے تھے۔ سرور صاحب نے جواب میں کہا کہ حسرت کی جنسی شاعری غزل کے آداب کے اندر تھی۔ آپ کا یہ شعر غزل کے آداب کے اندر نہیں تھا (بعد میں حفیظ صاحب نے یہ شعر اپنی غزل سے خارج کر دیا۔)

تو یہ غزل کے آداب ہیں جو غزل کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ غزل کے اپنے آداب سے مجروح کی غزل عبارت ہے اور جنسیت کے موضوع کو برتنے کا سلیقہ ان آداب کی پہچان ہے۔

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی

مجھے نہیں کسی اسلوبِ شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

جنت بہ نگہ، تسنیم بہ لب، انداز اس کے اے شیخ نہ پوچھ
میں جس سے محبت کرتا ہوں انساں ہے خیالی حور نہیں

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ کے جل گئے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آگئی
وہی لب نہ میں جنہیں چھو سکا قدحِ شراب میں ڈھل گئے

مجروح کے لبوں سے یہ خوشبو نہ جائگی
بخشی جو اس نے دولتِ بیدار دیکھئے

دیکھئے کب تک کلائے جاں رہے اک طرف شوق
دل حریصِ گفتگو اور چشمِ خوباں کم سخن

محبوب کی ان کہی بات کا شاعر کے شعر و نغمہ میں آجانا اور ان چھوئے لبوں کا قدحِ شراب میں ڈھل جانا انکشافِ ذات کا ایک ایسا پہلو ہے جو آدابِ غزل کے حدود متعین کرتا ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جسے اقبالؔ نے وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب کہہ کر اور جگرؔ نے "ہم اس کے نہ ملنے پر ہیں فدا لیکن یہ مذاق عام نہیں" کے پردے میں بیان کیا ہے اور یہ وہ رمز ہے جو فراقؔ ایسے زیرک، بامطالعہ اور خوش گو شاعر کے فہم سے دور رہی اور جس نے ہمیشہ وصال کو فراق پر ترجیح دی۔

یہاں میں ایک بات فنِ لطیف کی تکمیل یا عدم تکمیل کے بارے میں کہنا چاہوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک فن کار اس وقت تک اچھا فن کار رہتا ہے اور فن کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے جب تک اسے یہ یقین ہو کہ وہ اپنا بہترین فن پارہ ابھی تک پیش نہیں کر سکا۔ یہ ذہنی ناآسودگی تخلیقِ فن کا بہت بڑا منبع، بہت بڑا مخزن ہے۔ اسی سے فن کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اپنے بارے میں یہ سوچ لینا کہ میں نے حرفِ آخر لکھ دیا ہے گویا اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو میٹھی نیند سلادینے کے مترادف ہے۔ مجروحؔ اپنی ایک نہایت خوبصورت غزل میں جو ایک میخانۂ الہام کی حیثیت رکھتی ہے فن کار کی اسی ذہنی آسودگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

یوں تو یہ ساری غزل جس کا مطلع ہے۔

اہلِ طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو بھنور کو چشمِ جانانہ کہیں

اول سے آخر تک ایک ہی موڈ، ایک ہی خیال اور ایک ہی جذبہ لیے ہوئے ہے اور فن کار اور فن کے باہمی رشتے کی نشاندہی کر رہی ہے لیکن اس کے مقطع میں مجروحؔ نے تخلیقِ فن کے بارے میں ایک ایسا زندہ اور متحرک تصور پیش کیا ہے جو ہمیشہ سچے اور کھرے فن کاروں کی رہنمائی کرتا چلا جائے گا۔

آرزو ہی رہ گئی مجروحؔ کہتے ہم کبھی
اک غزل ایسی جسے تصویرِ جانانہ کہیں

ہمارے یہاں ایک زمانے میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں نے بہت زور باندھا اور ہم نے دونوں میں ایک حد فاصل قائم کردی حالانکہ دونوں میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ سوال صرف اتنا ہے کہ جس کے دل میں غم ہے اس کا ظرف کتنا ہے۔ عرفی اس مسئلے کو بہت پہلے یہ کہہ کر چھیڑ چکے تھے۔

دردِ دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود
با دگر خام بود پختہ کند شیشہ ما

بلکہ ایک طرح سے اس کی عقدہ کشائی کی جانب اشارہ بھی کر چکے تھے۔ میں اس میں اتنا اضافہ کروں گا کہ دونوں جب تک غمِ ذات نہیں بن جاتے شاعری کا کرشمہ سامنے نہیں آتا۔ مجروحؔ کے یہاں یہ عقدہ خود اپنی گرہ کشائی کرتا نظر آتا ہے۔

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے — جو گھر کو آگ لگائے ہمارے سات چلے
دیارِ شام نہیں منزلِ سحر بھی نہیں — عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے
ہمارے لب نہ سہی وہ دہانِ زخم سہی — وہیں پہنچتی ہے یارو کہیں سے بات چلے

ایک اور خوبصورت پہلو جو ہمیں مجروحؔ کی شاعری میں نظر آتا ہے (اور جس کا تعلق اسی عملِ خود گدازی کے ساتھ ہے جو کسی بھی نوع کی حسین شاعری کی تخلیق کے لیے ضروری ہے) اور وہ ہے ذکرِ وطن کا تغزل میں ڈھل جانا۔ وطن اور حبِ وطن کا ذکر ہماری شاعری میں ایک زمانے سے چلا آرہا ہے۔ لیکن غالباً میری نظر سے ایسی مثال ابھی تک نہیں گذری کہ وطن یا حبِ وطن تغزل کے روپ میں رونما ہوئے ہوں۔ اردو شاعری کو ایرانی شاعری سے بچانے اور خالص ہندوستانی بنانے کا دعوے کرنے والے شاعر کی غزلوں میں بھی یہ کیفیت کہیں نظر نہیں آتی۔ وطن کا ذکر مجروحؔ کے یہاں کچھ اس طرح تغزل میں رچا ہوا ملتا ہے کہ وطن ہر اعتبار سے ایک محبوب کی صورت میں نظر آتا ہے۔ مجروحؔ کے یہاں عشقِ وطن کا رنگ روایتی نہیں ہے، انوکھا ہے، کیونکہ مجروحؔ کے نزدیک وطن چند تہذیبی اقدار کا نام ہے کسی لمبے چوڑے قطعۂ زمین کا نام نہیں۔ اس ضمن میں مجروحؔ کی غزل ایک

منفرد رتبے کی حامل ہے۔ اس غزل میں وطن، وطنیت، جذبہ حب وطن خالص غزل بنتے ہوئے نظر آتے ہیں اور میں اسے شاعری کا معجزہ سمجھتا ہوں۔ یہ وطنیت محض جذباتی انداز کی نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر کا شعور اپنی جھلکیاں دکھا رہا ہے اور جب مجروحؔ کی ذہنی ناآسودگی بھی اس تغزل میں شامل ہو جاتی ہے تو یہ شراب، شراب دو آتشہ بن جاتی ہے۔

غلام رہ چکے توڑیں یہ بندِ رسوائی
کچھ اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں

دشمن کی دوستی ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ
ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

کس نے کہا کہ ٹوٹ گیا خنجر فرنگ
سینے پہ زخم نو بھی ہے داغ کہن کے ساتھ

زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروحؔ
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

بہت ہی تلخ نوا ہوں مگر عزیزِ وطن
میں کیا کروں جو ترا درد بے قرار کرے

پارۂ دل ہے وطن کی سرزمین مشکل یہ ہے
شہر کو ویراں کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں

میں نے اس تحریر کے شروع میں کہیں انفرادی شعور اور اجتماعی شعور کی طرف اشارہ کیا ہے اور ساتھ ہی ادب میں مقصدیت کی بات بھی چھیڑی ہے۔ انفرادی جذبات سے اجتماعی جذبات کی جانب یا مجرد تصورات سے سماجی احساسات کی جانب ترقی پسند ادب کا سفر انجمن ترقی پسند مصنفین کی شعوری کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس ضمن میں مجروحؔ کی علامتی شاعری کے متعلق ایک آدھ بات میں نے کہی ہے۔ سردارؔ جعفری نے "ترقی پسند ادب" میں اس سوال پر مزید روشنی ڈالی ہے اور تصویر کے دونوں پہلوؤں پر مختصر سی بحث کی ہے۔ مجروحؔ کی غزل گوئی کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> "اس سلسلے میں ترقی پسند ادیبوں نے دو طرح کا ادب پیدا کیا ہے۔ ایک وہ ادب جو بہت سادہ اور آسان ہے اور اس لیے عوام کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ ہندوستان جیسے پچھڑے اور ان پڑھ ملک میں اس قسم کے ادب کی بہت ضرورت ہے۔ یہ ادب سے محروم لوگوں میں ادب کا ذوق پیدا کرتا ہے۔ انھیں اور زیادہ بہتر ادب کی طرف راغب کرتا ہے اور انھیں تعلیم دیتا ہے۔ دوسرا ادب وہ ہے جو اعلیٰ درجے کا ہے۔ وہ عوام کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آتا۔ اس ادب کی بھی ضرورت ہے کیوں کہ یہ معیار بلند کرتا ہے۔

ادب کی ان دونوں قسموں کی تخلیق کرنے والے ترقی پسند ادیب ہیں۔ ایک ہی ادیب نے دونوں قسم کی چیزیں لکھی ہیں اور سوچ سمجھ کر ایک مقصد کے تحت لکھی ہیں۔ میں ان دونوں قسموں کی مثالیں مجروح سلطانپوری کی شاعری سے پیش کروں گا۔ سادہ اور آسان معیار کے ادب کی مثال یہ ہے۔

لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا
بھر کے رہے گی دھرتی اپنی، دلیش ہمارا ہو کے رہے گا

روس کا نو سنسار تو دیکھو، دھرتی کا شرنگار تو دیکھو
ایک زمیں کیا لال ابھی ہر ایک ستارا ہو کے رہے گا

صدیوں سے ہر ظلم مٹاتے آئے ہیں اور آج کے دن بھی
جیسے ہم چاہیں گے ساتھی ویسے گذارا ہو کے رہے گا

اعلیٰ درجے کے ادب کی مثال یہ غزل ہے۔

دشمن کی دوستی ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ
ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

جھونکے جو لگ رہے ہیں نسیم بہار کے
جنبش میں ہے قفس بھی اسیر چمن کے ساتھ

اس کے ساتھ ہی سردار جعفری لکھتے ہیں: ''آج ترقی پسند ادیبوں کے سامنے بنیادی سوال عوامی ادب کی تخلیق کا سوال ہے۔'' اپنی اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے جعفری موضوع کے انتخاب اور موضوع کے برتنے کے سوال پر بحث کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''فکر طبقاتی ہوتی ہے اور زاویۂ نگاہ بھی طبقاتی۔ اس لیے وہی فکر صحیح ہو گی جو اپنے تاریخی زمانے میں سب سے زیادہ ترقی پسند طبقے کی فکر ہو اور اسی فکر سے ٹھیک زاویۂ نگاہ پیدا ہو گا۔ اس فکر میں جتنی صفائی اور تیزی ہو گی موضوع میں اتنا ہی نکھار اور ادب میں اتنی ہی دھار آئے گی۔'' اس ضابطے کا انطباق جب ہم غزل پر کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ غزل کے شاعر کے لیے یہ منزل (اگر وہ غزل سے مراد تغزل لیتا ہے نہ کہ صنفِ غزل) نظم کے شاعر کے

مقابلے میں کہیں زیادہ مشکل ہے۔ مجروحؔ اس مشکل سے کس کامیابی اور کس خوبصورتی کے ساتھ عہدہ بر آہوئے ہیں اس کا اندازہ ان کی غزلوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن رقصِ بہار   رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

سنتے ہیں کہ کانٹے سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر یہ عزمِ جنوں، صحرا سے گلستاں دور نہیں
مجروح اٹھی ہے موجِ صبا آثار لیے طوفانوں کے
ہر قطرۂ شبنم بن جائے اک جوئے رواں کچھ دور نہیں

سکھائیں دستِ طلب کو ادائے بے باکی   پیامِ زیرِ لبی کو صدائے عام کریں
زمیں کو مل کے سنواریں مثالِ روئے نگار   رخِ نگار سے روشن چراغِ بام کریں
فریبِ ساقیٔ محفل نہ پوچھئے مجروحؔ   شراب ایک ہے بدلے ہوئے ہیں پیمانے
ہم قفس صیاد کی رسمِ زباں بندی کی خیر   بے زبانوں کو بھی اندازِ کلام آہی گیا

آخر غمِ جاناں کو اے دل بڑھ کر غمِ دوراں ہونا تھا
اس قطرے کو دریا بننا تھا اس موج کو طوفاں ہونا تھا
اب کھل کے کہوں گا ہر غمِ دل مجروحؔ نہیں وہ وقت کہ جب
اشکوں میں سنانا تھا مجھ کو کہ آہوں میں غزل خواں ہونا تھا

مجروحؔ ہیومنزم کا شاعر ہے اور یہی سبب ہے کہ اس کی غزل میں آج کے حقائق میرے سامنے آتے ہیں۔ اس کے نزدیک انسان ہی وہ واحد کسوٹی ہے جس پر زندگی کی تمام کیفیتوں کا کھرا پن پرکھا جا سکتا ہے۔ اسی لیے اُس کی غزل کسی انفعالی کیفیت کے گرد نہیں گھومتی۔ اس کی غزل حوصلہ مندانہ غزل ہے۔ جس کا لہجہ نغمگی سے لبریز ہے۔

وہ جس پہ تمہیں شمعِ سرِ رہ کا گماں ہے   وہ شعلۂ آوارہ ہماری ہی زباں ہے
اب ہاتھ ہمارے ہے عناں رخشِ جنوں کی   اب سر پہ ہمارے کلہ سنگِ بتاں ہے

زنجیر و دیوار ہی دیکھی تم نے تو مجروحؔ مگر ہم
کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں عالمِ زنداں تم سے زیادہ
ہوں جو سارے دست و پا ہیں خوں میں نہلائے ہوئے
ہم بھی ہیں اے دل بہاراں ان کی قسم کھائے ہوئے

ہے یہی اک کاروبارِ نغمہ و مستی کہ ہم — یا زمیں پر یا سرِ افلاک ہیں چھائے ہوئے
دشت و در بننے کو ہیں مجروحؔ میدانِ بہار — آ رہی ہے فصلِ گل پرچم کو لہرائے ہوئے

مجروحؔ کی شاعری خیال اور جذبے کی امتزاج کا ایک نگار خانہ ہے جس میں زندگی کے کئی رنگ جھلک رہے ہیں۔ انسان کی عظمت میں مجروحؔ کا یقین ایک اٹل یقین ہے اور عظمت انسان کا بیان مجروحؔ کی غزل میں خالی خولی جذباتی انداز کا نہیں بلکہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پر مبنی ہے۔ روایت کا احترام اور روایت میں توسیع مجروحؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے جس کے حسن میں پیکر تراشی کے نقوش جا بجا اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ماضی کی دھند اور حال کے دھند لکے میں مجروحؔ خود ہی ایک تابناک مستقبل نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ اپنے قاری کو بھی اس آنے والی تابناکی کی بشارت دے رہے ہیں۔ اندھیرے کی دبیز تہوں کو چیر کر تجلی کو دیکھنا اور خزاں کے پردے میں بہار کا مشاہدہ کرنا بڑی بات ہے لیکن اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ وہ جس اسلوب سے اپنے قاری تک پہنچاتے ہیں اس کی بے تکلف سجاوٹ رہ رہ کر دلوں کو کھینچتی ہے اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مجروحؔ کا احساس اُن کے شاعرانہ حسنِ بیان کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے، افراط و تفریط کے بغیر، اور یہ وہ خصوصیت ہے جو مجروحؔ کو موجودہ دور کے تمام غزل گو شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

●●

صدیق الرحمٰن قدوائی

جو عرض حال بہ طرزِ نگاہِ یار کرے

ہمارے ملک کی صدیوں پرانی اور شاندار زبانی روایت (Oral Tradition) سے ہم آہنگ ہونے والی مشاعرے کی روایت کے ساتھ غزل ہماری نفسیات کا ایک جزو بن چکی ہے۔ مجروح اور غزل باہم اس طرح شیر و شکر تھے کہ دونوں کا خیال ساتھ ساتھ آتا تھا۔ ان کا ترنم تغزل سے ہم آغوش ہو کر جو جادو جگاتا تھا وہ ان کے سننے والوں میں کس پر نہ چلا۔ پھر سماعی اور بصری ذرائع ترسیل سے جو آج کے عہد کے Discourse کا اہم جزو ہیں مجروح کی وابستگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنے فلمی گانوں کے ذریعے نہ صرف ایک خلقت کو مسحور کیا بلکہ اردو زبان کو سرکاری فرامین کے نرغے سے آزاد کرا کر ملک کی کھلی آب و ہوا میں نشو و نما حاصل کرنے کا موقع فراہم کرنے میں براہ راست حصہ لیا۔ مجروح کی ذات میں غزل، موسیقی اور فلم کی سنگت نے انھیں عصر حاضر کے تہذیبی سرمائے میں اضافہ کرنے والوں کی صف اول میں شامل کر دیا۔ چنانچہ ان کے انتقال سے ہمیں جو نقصان ہوا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، مگر اپنی زندگی میں جتنا کچھ وہ کر گئے اس کی بازگشت ختم ہونے والی نہیں۔

مجروح کی شاعری کا آغاز ان کے زیادہ تر ہم عصروں کی طرح کلاسیکی روایت کے سائے میں ہوا۔ مگر بیسویں صدی کے آغاز کے معاشرتی حالات، سیاسی، انفرادی آمادی، روشن خیالی کی تحریکات اور مغربی اثرات کے سبب اسی فضا میں ایک رومانیت بھی پل رہی تھی جس نے متوسط طبقے کے باغیانہ جذبات کو اپنا سہارا دیا۔ ترقی پسند تحریک اسی صورت حال کے بطن سے نمودار ہوئی۔ مجروح کی غزل نے جگر کے زیر اثر آنکھیں کھولیں اور عشق و رندی، وصل و ہجراں، زلف و رخسار کے نغمے گائے۔ یہ طرز جگر صاحب کے دبستان سے

پتہ : اے ۲۔ جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

مخصوص تھا۔ حسن و عشق کی کیف آگیں چشمکیں، رندی و سرمستی کی فضا، کھنکتی ہوئی زلفیں اور قافیے اور سادہ و سہل اظہار کہ شاعر کی پُرترنم آواز کے ساتھ ہر شعر فوراً دل میں اتر کر زبانوں پر چڑھ جائے۔

التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر ان کی کم نگاہی بھی

آخرش مجروحؔ کے بے رنگ روز و شب میں وہ
صبح عارض پر لیے زلفوں کی شام آ ہی گیا

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں آگئی
وہی لب نہ میں جنہیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے

نگاہ ساقی نامہرباں یہ کیا جانے
کہ ٹوٹ جاتے ہیں اس دل کے ساتھ پیمانے

مگر اس کے ساتھ ان کی غزل ایک نئی سمت کی طرف بھی مائل تھی جہاں جگر کے طرز سے انحراف تو نہیں تھا مگر اب وہ پرانی روایت کے اندر اپنی بات کے لیے نیا انداز ڈھونڈ رہے تھے۔ چنانچہ اب اسی قسم کی غزلوں میں ایسے شعر بھی آنے لگتے ہیں۔

حیات لغزش پیہم کا نام ہے ساقی
لبوں سے جام لگا بھی سکوں خدا جانے

فریب ساقی محفل نہ پوچھیے مجروحؔ
شراب ایک ہے بدلے ہوئے ہیں پیمانے

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

مرے عہد میں نہیں ہے یہ نشان سر بلندی
یہ رنگے ہوئے عمامے یہ جھکی جھکی کلاہیں

اور ایسے بے مثل اشعار بھی آنے لگتے ہیں جو اسی راستے کے ایک نئے موڑ کی طرف اشارہ

کرتے ہیں ۔

حرم سے میکدے تک منزل یک عمر تھی ساقی
سہارا گر نہ دیتی لغزش پیہم تو کیا کرتے

اور اب غزل اپنے اس روپ میں نظر آتی ہے جو روایت کی ساری خوب صورتی لیے ہوئے بجی سجائی موسیقی کی لہروں میں کھیلتی ہوئی مانوس استعاروں میں ایک نیا مغنیاتی نظام ساتھ لے کر آتی ہے اور آج جسے ترقی پسند غزل کہا جاتا ہے۔

جھونکے جو لگ رہے ہیں نسیم بہار کے
جنبش میں ہے قفس بھی اسیر چمن کے ساتھ

یہاں اسیر چمن اب بے یار و مددگار، آہ و فریاد میں محو نہیں بلکہ ساری فضا ایک نئے موسم کی آمد آمد کی نوید سے لبریز ہے۔ نسیم بہار کے جھونکوں کے اثر سے قفس کی جنبش ایک نئے طرز کا رقص ہے جس میں ساری فضا شریک ہے۔ یہاں قفس، نسیم بہار اور اسیر چمن کے ذریعے ایک بالکل نیا مضمون باندھا گیا ہے جو مجروح کے عہد کے لیے جذباتی ماحول کی عکاسی غزل کی جانی پہچانی لفظیات میں کر رہا ہے اور کلاسیکی روایت کے اندروں میں معانی کے نئے نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی سلسلے کی ان کی وہ غزل بھی ہے جو اس عہد کی نمائندہ اردو غزلوں میں ہمیشہ یادگار رہے گی جس کے چند اشعار یہ ہیں ۔

جب ہوا عرفاں غم آرام جاں بنتا گیا
سوز جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضمون کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

تقریباً یہی زمانہ تھا جب کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر ترقی پسند تحریک بھی انتہا پسندی کا شکار ہونے لگی۔ غزل تو پہلے سے ہی ترقی پسندوں کے ہاں معتوب تھی جس کے خلاف مجروح

تحریک سے وابستہ رہتے ہوئے بھی اپنے ادبی نقطۂ نظر پر جمے رہے۔ مگر انتہا پسندی کے دور میں ان کی غزل بھی نعرے بازی کی زد میں آگئی جسے خود انھوں نے قبول کیا ہے۔ وہ قید بھی کیے گئے اور یہ پورا دور ترقی پسندی کا وہی دور ہے جسے ہماری تنقید نے بہ آسانی ترقی پسندی کی پوری تحریک پر نافذ کردیا جو ایک دوسرے قسم کی انتہا پسندی کا نتیجہ تھا۔ اس دور میں ادب اور نظریہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار دیے گئے اور نظریہ کی تعریف بھی کچھ یہی ٹھہری کہ مارکسزم کا وہ روپ جو کمیونسٹ پارٹی سرکاری طور پر وقتاً فوقتاً منظور کرے وہی اصل مارکسزم ہے۔ اس کا اثر پوری کمیونسٹ تحریک پر جو ہوا سو ہوا۔ ترقی پسند تحریک کہ زیراثر اس دور میں ادب کو خاصا نقصان پہنچا۔ مجروح کی غزلوں کا رنگ کچھ ایسا بدلا کے جس پر بعد میں وہ خود بھی نادم ہوئے۔ راست، غیر مبہم، سطحی انداز جس میں استعارہ بے لطف ہو کر رہ جاتا ہے۔

سنتے ہیں کہ کانٹے سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر یہ عزم جنوں صحرا سے گلستاں دور نہیں

اب انقلاب اور ادب کی جمالیات دونوں کی بے وقعتی نے کچھ ایسا رنگ دکھایا کہ حسن بھی قدر زائد (Surplus Value) کے دائرے میں آگیا۔

وہ جس کے گداز محبت سے پر نور شبستاں ہے تیرا
اے شوخ اسی بازو پہ تری زلفوں کو پریشاں ہونا تھا

اور یہ امید بھی قوی ہو گئی کہ ہندوستان میں جلد مزدوروں کا ایسا دور آئے گا جب حسن بھی کارخانوں سے بن سنور کر نکلے گا۔

منچلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے

''نذر سویت یونین'' اور یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے۔

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروحؔ
وہ سرزمین کہ ستارے جسے سلام کریں

ترقی پسندی کے اس دور میں ادب کی نظریاتی وابستگی سے مراد سوویت یونین اور زیادہ سے زیادہ چین کے مارکسزم کو حرف آخر سمجھنا، رجائیت اور بلند آہنگ راست انداز، ابلاغ کی جگہ تبلیغ

ہو گئی۔ دراصل آزادی اور انقلاب کی جدو جہد کے دوران پلنے والا آئیڈیل ازم آزادی کے فوراً بعد ٹوٹنے لگا تھا۔ ایک آزاد ترقی یافتہ مساوات پر مبنی، معاشی طور پر خوش حال اور سامراجی اثرات سے بالکل بری ہندوستان جس کا خواب پہلے دیکھا گیا تھا اور امید تھی کہ آزادی کے آتے ہی یہ آرزوئیں پوری ہو جائیں گی، وہ سب کچھ ہوا نہیں بلکہ آج تک جو صورت حال ہے وہ کئی اعتبار سے پہلے سے بھی زیادہ تشویش ناک ہے۔ کمیونسٹ پارٹی نے تو آزادی کے فوراً بعد کے دور کو سامراجی سازش قرار دے کر آزادی کے وجود سے ہی ابتدا میں انکار کیا، پھر تلنگانہ تحریک کے ختم ہونے کے بعد پارلیمانی طرز کی جمہوریت سے مفاہمت کر کے ایک نئی جدو جہد میں شامل ہوئے، مگر ترقی پسند تحریک کی انتہا پسندی کے دور میں بہت سے اہم شاعر اس سے الگ ہو گئے۔ جذبی، اختر الایمان، خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی کے ہاں اس تبدیلی سے تو سب واقف ہیں۔ یہی دور وہ ہے جب مارکسزم کے بارے میں ساری دنیا میں نئے مباحث شروع ہوئے اور اس کی نئی تعبیرات ہوئیں۔ علم و ادب کی دنیا میں اس نئے راستے سے بائیں بازو کی تحریکات نے گہرا اثر ڈالا اور مارکسزم سوویت یونین اور چین کی تعبیرات تک محدود نہیں رہا۔ کمیونزم آیا۔ جنوبی امریکا اور افریقہ میں بائیں بازو کی تحریکات کے زیر اثر ادب ظہور میں آنے لگا۔ خود ہندوستان میں ایک کمیونسٹ پارٹی کی جگہ کئی مارکسسٹ پارٹیاں بن گئیں جن میں دو تو قومی سطح پر پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں بھی نمایاں ہوئیں۔ ہماری ترقی پسند ادبی تحریک اس سارے معاملے سے بالکل بری رہی۔ چنانچہ آزادی کے بعد کی صورت حال کے ساتھ ساتھ ان کے وہ نظریاتی سوتے بھی خشک ہو گئے جن کے ذریعے ادب اور نظریاتی وابستگی کو عصری تقاضوں کے مطابق دیکھا جاسکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدیدیت ترقی پسندی کے رد عمل کے طور پر نمودار ہوئی اور نظریہ کو ہی ادب کے لیے زہر سمجھا جانے لگا اور ایک نئے قسم کا ادب پیدا ہونے لگا جس میں رجائیت، راست ابلاغ، بلند آہنگ، اور انقلابی جدو جہد کی للکار کی جگہ بیزاری، بے سمتی، الجھن، انتشار اور خارجی دنیا کی جگہ اندرون ذات کا چرچا ہونے لگا۔ مجروح اب کم سے کم کہنے لگے اور ترقی پسندوں میں جاں نثار اختر تقریباً غائب ہو گئے اور پھر سامنے آئے تو ایک نئے رنگ کے ساتھ۔ انھوں نے کہا:

اسی سبب سے ہیں عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

مجروح بھی اب ایک نئے انداز کے ساتھ آئے۔ کہنے لگے:

ہجوم دہر میں بدلی نہ ہم سے وضع خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

بہر حال اچھا اور برا ادب ہر زمانے میں تخلیق ہوا ہے مگر اچھے اور برے کی تمیز کا وقت بسا اوقات بعد میں آتا ہے۔ مجروح نے اسی دور کی ایک اور مقبول غزل میں یہ بھی کہا:

چاک جگر محتاج رفو ہے آج تو دامن صرف لہو ہے
اک موسم تھا ہم کو رہا ہے شوق بہاراں تم سے زیادہ

اس دور کے گزر جانے کے بعد مجروح اپنے رنگ تغزل کی طرف واپس آئے اور اب جو غزل انھوں نے کہی وہ فنی پختگی، غنائیت اور معنیاتی تہ داری کے اعتبار سے ترقی پسند شاعروں کی غزل کے اثاثے ہیں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ مجروح نے دوسروں کے مقابلے میں بہت کم لکھا مگر غزل کی صنف کی اہمیت اور اس سے اپنے فطری لگاؤ پر ہمیشہ اصرار کیا۔ ان کے ہم عصر ترقی پسندوں میں سے کچھ جو پہلے غزل کی طرف پھر واپس آئے۔ نظریاتی وابستگی سے انکار تو نہیں کیا گیا مگر اب وہ آن بان نہ رہی۔ پاکستان میں فیض یقیناً بہت اچھی غزل اسی کلاسیکی سج دھج کے ساتھ کہتے رہے مگر چوں کہ شروع سے ہی ان کا رجحان نظم کی طرف زیادہ تھا اس لیے فیض کی غزل کے مقابلے میں ان کی نظم زیادہ وقیع ثابت ہوئی۔ فیض اور مجروح دونوں ہم عصر تھے اور اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جسے اقبال نے "آشفتہ سر، آشفتہ ہو، آشفتہ ہو" کہا ہے۔ معمولی سوال کہ ترقی پسند غزل کے اس قافلے میں کون پہلے نکلا یہاں اس لیے آجاتا ہے کہ خود مجروح بھی اس معاملے میں بہت حساس تھے۔ اگر مجروح کے کچھ اشعار لوگوں نے فیض کے سمجھ لیے تو اس میں حیرت کی بات نہیں کہ غزل کے کلاسیکی رنگ میں شعر کہنے کی یہ قیمت تو اچھے شاعروں کو ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شعر مولانا سید سلیمان ندوی کا ہوگا، مگر ہے۔

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے

مقتل کی وابستگی فیض اور ترقی پسندوں سے کچھ اتنی زیادہ ہے کہ اگر اس کے خالق کے بارے میں سب کو معلوم نہ ہو گیا ہوتا تو بڑی آسانی سے یہ شعر بھی ان میں سے کسی کے کھاتے میں

ڈالا جاسکتا ہے۔ دراصل غزل کی صنفی پابندیوں پر توجہ اتنی زیادہ رہی ہے کہ اس کی اندرونی گنجائش (Space) کی طرف عموماً دھیان نہیں جاتا۔ سیکڑوں سال تک ڈھلنے والی فارسی اور اردو کی کلاسیکی روایت میں غزل کی لفظیات نے دنیا اور زندگی کے ہر پہلو کے اظہار کے لیے تجربے کی ایک فضا بھی بنائی۔ اس کے اندر جسمانی اور جنسی لذتوں سے بھرپور عشق کی کیفیات، تصوف کے الوہی نغموں اور خودی و بے خودی کے فلسفیانہ آہنگ سے بنے ہوئے ہالے میں پہنچنے والے عشق تک سب کچھ شامل رہا۔ ترقی پسندوں میں جذبی اور مجاز سے لے کر مجروح و فیض تک سب نے غزل کی اس گنجائش کو اور زیادہ وسیع کر دیا۔ دار و رسن، مقتل و زنداں، زاہد و محتسب، رہبر و رہزن، شام و سحر، نور و ظلمت، رندی و مستی، دیر و حرم، دشت و بیاباں، گل و بلبل جیسے وہ مانوس استعارے ہیں جن کے سائے میں اردو والوں کے مذاق شعر کی صدیوں تک تربیت ہوتی رہی ہے۔ یہی استعارے جب انقلاب کا پیغام لے کر آئے تو زمانے اور نسل (Generation Gap) کے پردے بھی اُٹھ گئے اور ان ہی کے اندر جذبات کے وفور اور احساس کی شدت کو کلاسیکی اظہار پر قابو رکھتے ہوئے کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ اظہار پر قابو جب ڈھیلا ہو گیا تو وہ غزل بھی وجود میں آ گئی تھی جس کے بارے میں اب خود مجروح نے کہا:

> "میری غزل کے بعض وہ اشعار جو نعرہ زنی کی حد میں آجاتے ہیں محمود نہیں گردانے گئے بلکہ میرے ساتھ ستم یہ ہوا کہ میری پوری غزل کو انھیں بعض عیوب سے منسوب کر کے بڑے تو بڑے چھوٹ بھیے بھی جو ہاتھ میں آیا لے کر میدان میں آ گئے تب سے یہ سنگ باری آج تک جاری ہے۔ میری خوبیوں کو نظر انداز کر کے صرف چند خامیوں کو میرا معیار فن ٹھہرا لیا گیا۔" (مشعل جاں، ص ۱۶)

بہر حال یہ زمانہ گزر گیا اور اب ہم آج غزل کے پورے منظر نامے پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ اگرچہ آج کی غزل جذبی، مجاز، فیض اور مجروح کے کلاسیکی طرز اظہار سے آگے بڑھ کر اپنا روایتی ہیئتی نظام قائم رکھتے ہوئے ایک نئے دور میں سفر کر رہی ہے۔

جہاں تک مجروح و فیض کے درمیان فرق کا معاملہ ہے تو میرے نزدیک فیض کے ہاں غزل کا یہ اسلوب تصوف سے زیادہ متاثر ہے اور اس میں ابہام کی بنا پر اندرونی گنجائش بھی

زیادہ ہے۔ ان کے ہاں تلمیحات پر انحصار بھی مجروحؔ سے بہت زیادہ ہے جن کے ذریعے وہ پاکستان کی سیاست کے درمیان خود اپنے وجود، اپنے جیسے لوگوں کی زندگی اور اپنے نظریاتی احتجاج کو دیکھتے ہیں۔ مجروحؔ تصوف کی جگہ زمینی عشق کی سرمستیوں کے درمیان اپنی تشبیہات و استعارات تلاش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں غزل اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ نکھرتی چلی جاتی ہے۔ طرز اور رنگ، کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو فیضؔ کی غزل کا شجرہ غالبؔ سے جب کہ مجروحؔ کا مزاج مومنؔ سے جا کر ملتا ہے۔ مگر یہ تو سطح کے اوپر اوپر تیرتی ہوئی سی بات ہے۔ دونوں کو اس طرح کے خانوں خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا کہ بالآخر فیضؔ اور مجروحؔ بنیادی طور سے ایک ہی شعری دبستان کے افراد یعنی ترقی پسند ہیں۔

مجروحؔ کے اس دور کے متعدد اشعار برعظیم کے اردو والوں کی یادداشت میں سما چکے ہیں اور ترقی پسندی کے لیے مایۂ افتخار ہیں۔ مثلاً

یہ کوئے یار یہ زنداں یہ فرش میخانہ
انھیں ہم اہل تمنا کا نقش پا کہیے

وہ ایک بات ہے کہیے اسے طلوع نشاط
کہ تابش بدن و شعلۂ حنا کہیے

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

لوگو مری گل کاری وحشت کا صلہ کیا
دیوانے کو ایک حرف دل آویز بہت ہے

وہ تو کہیں ہیں اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہ یار کی طرح

اس طرح سے کچھ رات کو ٹوٹے ہیں ستارے
جیسے وہ تری لغزش پا دیکھ رہے ہیں

روک سکتا ہمیں زندان بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیواروں سے چھن جاتے ہیں

اس طرح وہ یادگار غزلیں جن میں اشعار کا انتخاب مشکل ہے، ان کے مطلعوں سے

ہی اندازہ ہو سکتا ہے:

- اہل طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
- ہمیں شعور جنوں ہے کہ جس چمن میں رہے
- چمن ہے مقتل نغمہ اب اور کیا کہیے
- جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
- خنجر کی طرح بوئے سمن بہت ہے
- گر رات مری صبح کی محرم تو نہیں ہے
- مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
- جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا
- ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح

یہ غزلیں اتنی مقبول ہوئی ہیں کہ ان کے مصرعے مجروحؔ کی نغمہ ریز آواز کے ساتھ مدتوں کانوں میں گونجتے رہیں گے۔ مجروحؔ ان شاعروں میں ہیں جن کے متعدد اشعار ان کی زندگی ہی میں ضرب المثل بن چکے ہیں چنانچہ اردو غزل کا وہ سرمایہ جو ہماری آج کی عمومی مجلسی تہذیب کا جزو بن چکا ہے، اس میں مجروح کا حصہ یادگار رہے گا۔ اس میں شک نہیں کہ مجروحؔ کی وفات کے ساتھ غزل کا وہ دور ختم ہوا جس کے سر پر جگر صاحب کا سایہ تھا اور دبستان جگر میں جو حسن و عشق کی سرمستیوں، محفلوں، میکدوں اور شبستانوں کے سرد و خروش سے عبارت تھا ترقی پسندی کے ولولہ و عزم، زنداں کی باد و ہوا، زنجیروں کا نغمہ اور کارزار حیات کا غوغا و غلغلہ لے کر شامل ہونے والے مجروح اور صرف مجروحؔ تھے۔ یہ سب کچھ ان کے ساتھ ختم ہوا۔

●●

محمد علی صدیقی

ترقی پسند غزل کے نقیب مجروح سلطانپوری

انہوں نے غزل کی کلاسیکی روایت میں رمزیت کو نغمہ بنایا ھے

مجھے مجروح سلطان پوری سے متعدد بار ملنے کا اتفاق ہوا، وہ انتہائی خلیق، متین اور پر بہار شخصیت تھے۔ وہ مشرقی علوم کے فارغ التحصیل تھے۔ شاعری میں جگر مراد آبادی سے متاثر تھے، مجروح صاحب کے بعض اشعار اس درجہ مقبول ہوئے کہ انھیں دوسرے شعراء کے ساتھ منسوب کردیا گیا۔ یہ رجحان بہ ذات خود اس حقیقت کا غماز ہے کہ مجروح کا مخصوص رنگ اس قدر مقبول ہو چکا تھا کہ جو شاعر مجروح کے قریب تر ہوتا، اس شاعر کے پرستار مجروح کے بعض اشعار اپنے محبوب شاعر کی تخلیق سمجھنے میں تکلف نہ برتتے۔ میں نے مجروح صاحب سے عرض کیا کہ یہ اچنبھے کی بات نہیں۔ ایک ہی نظریے اور روایتی تغزل کے لیے جذبۂ پسندیدگی رکھنے والے شعراء کے ساتھ یہ مماثلتیں لابدی ہیں۔

آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کی دل نواز شخصیت اور پر تاثیر شاعری ہمیں ان دنوں کی یاد دلاتی رہے گی جب ترنم، تغزل اور انقلابی لب و لہجہ کی حکمرانی تھی۔ غزل نے مجروح کے ذریعہ ثابت کیا کہ روایتی زبان اور علامتوں کے ذریعہ بھی جدید تر انقلابی موضوعات شاعری میں ڈھل سکتے ہیں۔ مجاز اور فیض نے بھی اسی دعوے کی صداقت پر صاد کیا ہے۔

انھوں نے اپنے آخری دورۂ پاکستان کے موقع پر مجھ سے فرمائش کی کہ میں ان کے شعری مجموعے "غزل" کے پاکستانی ایڈیشن کے لیے مقدمہ لکھوں۔ میں نے تعمیل ارشاد کی وہ اس مضمون سے اس قدر خوش ہوئے کہ انھوں نے اسے اپنی شاعری پر لکھے گئے جملہ مضامین میں زیادہ معروضی اور مؤثر قرار دیا۔ وہ مضمون آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

غزل، یقینی طور پر، ایک منفرد صنف سخن ہے۔ برصغیر میں اس صنف سخن کی روز

افزوں مقبولیت اور خصوصیت کے ساتھ آزادی کے بعد سے اردو کے علاوہ بعض دیگر زبانوں میں بھی غزل کی جانب میلان بلکہ یورش بذات خود اس حقیقت کی غماز ہے کہ "غزل" اپنی مخصوص یعنی Lyrical شکل میں نسبتاً زیادہ مقبول ہے۔ بعض حضرات لفظ "مقبول" سے اس قدر خائف ہوتے ہیں کہ اپنی مخالفت میں ان افراد کی جانب پیٹھ کر کے بیٹھ جاتے ہیں جو "تغزل" کی موجودگی یا مقبولیت پر اصرار کر کے "خلافِ غزل" شاعری کے مضامین کی وسعت اور نیرنگیوں کے منکر نہیں ہو پاتے۔

مجروح سلطان پوری نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اسے ایک طرف غزل کی کلاسیکی کا دور کہا جاسکتا ہے تو دوسری طرف بدلتی ہوئی زندگی کی لے پر ترتیب ایک نئے شعری آہنگ اور اسلوب کی تلاش کا وقفہ بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔ مجروح سلطان پوری نے نئے نئے تقاضوں کی جانب تغزل ہی کے راستے سفر کیا چوں کہ ان کا خیال تھا کہ بعض ترقی پسند نقادوں نے نئے نئے شعری مواد کے لیے نئے ہئیتی پیکروں پر اصرار کر کے ایک نوع کے Formalism ہی کی تائید کی تھی۔ شاید یہ حضرات اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ غزل سے تغزل منہا کر کے سب کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن تغزل برقرار رکھتے ہوئے کھردرے حقائق کا بیان نہ صرف بہت مشکل ہے بلکہ جان جوکھم کا کام ہے، اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب کلاسیکی غزل کی روایت کا سماجی و معاشی اور سیاسی تاریخ کے سیاق میں مطالعہ کیا جائے۔ آزادی کی تحریک اور آزادی کے بعد کے تعمیر نو کے دور میں کلاسیکی سرمایہ کی جانب جس بے توجہی کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور اب یہ حالت ہے کہ اس بے توجہی کے باعث کلاسیکی روایت میں گندھے ہوئے شعراء بھی بذاتِ خود کلاسیکی شعراء کی صف میں آکھڑے ہوئے ہیں وہ انتہائی افسوسناک ہے۔ آزادی بذات خود ایک نعمت ہے بشرطیکہ یہ واقعتاً آزادی ہو لیکن آزادی کا ایک مفہوم اپنی روایت کے سوتوں کی زیادہ بہتر طور پر دریافت اور نئے دور کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی روشنی میں "روایت" کے زندہ عناصر کی از سرِ نو دریافت بھی ہے۔ کم سے کم پاکستان کی حد تک اردو شاعری کی فارسی روایت سے پہلو تہی کی گئی اور صرف ان علمی آثار پر توجہ مرکوز کی گئی جو معتقدات کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے جس کی وجہ سے اب وہ کشادگی نظر مفقود ہوتی نظر آرہی ہے جو ادب اور معتقدات کے خوبصورت آمیزہ سے پیدا ہوئی ہے۔

مجروح سلطان پوری سیاسی رمزیت کے استعاروں سے مزین نادرِ روزگار غزل گو

ہیں۔ مجروح کے یہاں کلاسیکی غزل کی علامتیں اور استعارے بعض خفیف سی تبدیلیوں کے ساتھ ایک ایسی معنوی، نفسیاتی اور لفظیاتی دنیا بساتے ہیں جس نے سیاسی رمزیت میں ڈوبی ہوئی جدید غزل کو ہم عصری صداقتوں کا پیکر بنادیا ہے۔ ان کے کلام میں موجزن صوفیانہ شاعری کے استعارے، ناز و نیاز، پروانہ و شمع، شاہ و گدا، دریا و قطرہ اور ساقی و مے وغیرہ ہی نہیں بلکہ طوفان، سیاہی، سفینہ، سحر، فلک، شمع، راہی، گیسو، صبح، طوفان، اسیر زنداں، زنجیر، خار، گل، گلستاں، میکدہ، ساقی، شراب، جام، حرم، محتسب، صیاد، راہ، راہزن، شب اور مشعل جیسے درجنوں ایسے استعارے ملتے ہیں جو مجروح سلطان پوری کی مسیحا لفظی کے باوصف قارئین شاعری کے لیے زندہ علامتوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ مجروح روایتی معانیاتی نظام سے نئے عہد کی سیاسی حقیقتوں کے انشراح کا کام کچھ اس طرح لیتے ہیں کہ یوں گمان گزرتا ہے کہ مجروح کی شاعری کی صورت میں جو کچھ ظہور پذیر ہوا ہے وہ کلاسیکی غزل کی ترقی پسند ادب میں حیات نو کے لیے ضروری تھا۔

ظاہر ہے غزل میں سیاسی رمزیت کی ابتدا بذات خود کوئی اہم واقعہ نہیں۔ خواجہ منظور حسین نے اپنی تصنیف "اردو غزل کا روپ بہروپ" میں اس موضوع کے ساتھ کافی انصاف کیا ہے لیکن بعض ترقی پسند نقادوں نے غزل کے بارے میں قدرے منفی رجحان کا ساتھ دیا اور بعد میں ترقی پسندانہ ETHOS کی غزل کو فیض احمد فیض کے ساتھ اس قدر لازم و ملزوم قرار دیا کہ مجروح سلطان پوری پس پشت جاتے دکھائی دیے۔ بلا شک و شبہ فیض اور مجروح ترقی پسند تحریک کے دو دو اہم شاعر ہیں لیکن فیض اور مجروح کی شاعری کے لہجوں میں بین فرق ہے۔ ان اشعار میں بھی جنہیں بعض مجروح کے سہل نگار قارئین اور مبصرین نے فیض احمد فیض کے نام سے موسوم کردیا ہے صرف لہجے کا فرق مجروح اور فیض کے درمیان واضح حد فاصل کھینچ دیتا ہے۔

مرے عہد میں نہیں ہے یہ نشان سر بلندی
یہ رنگے ہوئے عمامے یہ جھکی جھکی کلاہیں

حادثے اور بھی گزرے تیری الفت کے سوا
ہاں مجھے دیکھ مجھے، اب میری تصویر نہ دیکھ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

مجروحؔ کے مندرجہ بالا اشعار ان اشعار میں سے ہیں جنہیں بعض مبصرین نے فیض احمد فیضؔ کے رنگ کے اشعار گردان کر اپنی "لغزش فہم" کا ثبوت دیا ہے حالانکہ لہجے کا فرق صاف بتا رہا ہے کہ مجروحؔ "ایقان" کی بے پناہ جرأت اور اعتماد کی وجہ سے فیض احمد فیضؔ کے مقابلے میں زیادہ قطعیت پسند Categorical ہیں۔ فیض احمد فیضؔ کی بعض نظموں کی سطریں یا ابتدائی کلام کی غزلیں اس لہجے کو چھوتی ہوئی ملتی ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ فیض کی غزل میں قطعیت کم ہوتی چلی جاتی ہے یہ ضرور ہے کہ مجروحؔ سلطان پوری اور فیضؔ کے شعری ڈکشن میں کافی مماثلت ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ مجروحؔ کی شناخت فیضؔ کے علی الرغم غزل ہی سے ہے، مجروحؔ کی غزل، فیض کے مقابلے میں، روایت کے خمیر میں زیادہ گندھی ہوئی ہے اور اس پر مغربی شاعری کے اثرات کی چھاپ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جب ترقی پسندوں کے ایک بڑے حلقے نے غزل کی ساخت پر حملے کیے اور اسے سراسر مصنوعی قرار دیا تو غزل کی مدافعت خاصی مشکل نظر آتی تھی۔ سجاد ظہیر نے "ذکر حافظ" میں ظ۔انصاری سے جس مسئلہ پر اختلاف رائے کیا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ ظ۔انصاری غزل میں ترقی پسندانہ فکر کا نفوذ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور سمجھتے تھے

مجروحؔ نے جب شاعری کی ابتداء کی تو ان پر کلاسیکی فارسی روایت کے اثرات بہت گہرے تھے۔ وہ جگرؔ مراد آبادی کو اپنا معنوی باپ سمجھتے ہیں اور اس تعلق خاطر کے سبب ان کی شاعری میں ساقی، جام، گل و بلبل، گلستان اور صیاد کی علامتیں کچھ اس درجہ شیر و شکر ہو چکی ہیں کہ اگر مجروحؔ نے ان علامتوں کے علاوہ دیگر بہت سی علامتوں کو اپنے ایک مخصوص معانیاتی اور سیاسی نظام فکر کے ساتھ مربوط نہ کیا ہوتا تو وہ جگرؔ کے رنگ میں شعر کہنے والے ایک شاعر کے طور پر شمار ہو کر منظر عام سے غائب بھی ہو چکے ہوتے۔ ہر چند کہ جگر کے رنگ میں خود جگرؔ سے بڑا شاعر ہونے کی گنجائش ذرا کم ہی ہے لیکن مجروحؔ جس فلسفہ

زیست کے ساتھ شیفتگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اس کا جنون موجودہ زمانے کی طبقاتی کشمکش میں قد و گیسو سے دار و رسن تک پھیلا ہوا ہے۔

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

مجروحؔ اس شعر کے ساتھ ہی ایک منفرد غزل گو کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔ غالبؔ کے یہاں یہی مضمون ایک فرق کے ساتھ آیا تھا۔ غالبؔ روشن خیالی کے راستے حقیقت پسندی کی جانب منعطف ہوئے تھے جب کہ مجروحؔ ظلم و استحصال کی معلوم اور نامعلوم آگہی اور ذات و کائنات کے آشوب سے گزرتے ہوئے اس آدرش کی جانب آتے ہیں جہاں شاعری محض تفننِ طبع کی بجائے اجتماعی تقاضوں کا معاہدہ بن جاتی ہے۔ مجروحؔ نے "تغزل" کی قیمت پر سیاسی آدرشوں اور سیاسی آدرشوں کی قیمت پر "تغزل" کو خیر باد نہ کہنے کا جو عزمِ صمیم کر رکھا ہے اس کی وجہ سے وہ ایک نوع کے ہیئت پرست شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ مجروحؔ کی غزل کا محبوب کلاسیکی شعراء کے غزل کے محبوب سے چنداں مختلف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجروحؔ تغزل سے بھرپور کام لیتے ہیں۔

التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی

دور دور مجھ سے وہ اس طرح خراماں ہے
ہر قدم ہے نقشِ دل ہر نگہ رگِ جاں ہے

ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ
سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے

نہ مانگوں بادۂ گلگوں سے بھیک مستی کی
اگر ترے لب لعلیں مرا یہ کام کریں

سکھائیں دستِ طلب کو ادائے بیباکی،
پیامِ زیرِ لبی کو صلائے عام کریں

مجروحؔ اور فیضؔ کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فیضؔ اپنی نظموں کے حوالے سے بین الاقوامی موضوعات پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں ان کی

شاعری کا Ethos بڑی حد تک ناظم حکمت، نیرودا اور لورکا کی بین الاقوامی فکر کے ساتھ ہم رشتہ ہے اور اس لیے ان کی غزلوں میں بھی مجروح کے مقابلے میں وسیع تر فریم ورک کار فرما نظر آتا ہے۔ فیض اپنے مخملی اور شیریں لہجے میں اپنی مخصوص افتادِ طبع کے حوالے سے کافی اجنبی Shades نکالتے ہیں۔ اس کے برخلاف مجروح کی غزل کا خمیر ''روایتی میکدہ'' کی فضاؤں سے اٹھا ہے۔ مجروح ترقی پسند غزل کے ایک رجحان ساز شاعر ہیں جنھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ روایتی شاعری کی لغت نئے تقاضوں پر پوری اترتی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

غلام رہ چکے، توڑیں یہ بندِ رسوائی
کچھ اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن، جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

ہم قفس! صیاد کی رسمِ زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی اندازِ کلام آ ہی گیا

عہدِ انقلاب آیا، دورِ آفتاب آیا
منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے

منچلے بُنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

فیض احمد فیض، خود مجروح کے خیال کے مطابق، جدید اردو شاعری کے میر تقی میر ہیں۔ اس خیال کی روشنی میں دونوں شاعروں کے مابین فرق کی تفہیم کافی آسان ہو جاتی ہے۔ مجروح کی غزلوں میں جس نوع کی "سپردگی" کی فضا ملتی ہے، وہ مجروح ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ مجروح نے اپنی شاعری میں "قد و گیسو" سے دار و رسن تک کا فاصلہ جس خوش دلی اور سرمستی کے ساتھ طے کیا اور بڑی چابک دستی کے ساتھ "منزل" اور "مسافت" کے فرق کو ظاہر کیا ہے، وہ جدید ترقی پسند غزل کا مہتم بالشان باب ہے۔ مجروح کی شاعری انقلاب کے لیے دیدہ و دل فرش راہ ہے۔ وہ معاشرہ کی جملہ خرابیوں کی وجہ طبقاتی سماج کے اندر لابدی آویزش تلاش کرتے ہیں۔ بعض نقادوں نے مجروح اور فیض کی غزل میں سیاسی رمزیت کے بارے میں کچھ اس قسم کے دعوے کیے ہیں جیسے کہ ان دو شعراء سے پہلے اردو غزل سیاسی رمزیت سے ناآشنا ہو۔ یہ بات نہ صرف حقیقت سے بعید ہے بلکہ خود مجروح اور فیض کی تفہیم میں بھی مزاحم ہے۔ میر تقی میر کے بعض اشعار بھی سیاسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ انشاء، سودا، مصحفی، آتش، میر درد، ذوق، حالی، شبلی، شرر، اقبال، ظفر علی خان، محمد علی جوہر اور حسرت کے یہاں بھی کہیں کہیں سیاسی رمزیت موجود ہے لیکن مجروح اور فیض و مجاز سے پہلے جذبی نے جس نوع کی سیاسی رمزیت سے اپنی غزل کو متعارف کرایا ہے وہ تصوف کے معانیاتی اور اسلوبیاتی نظام کی طرز پر ایک واضح سیاسی نظام حیات کے تابع ہے۔ فیض بڑی حد تک ترقی پسند رہتے ہوئے بھی "تغزل کے بارے میں اس قدر شعوری نہیں جس قدر کہ مجروح۔ فیض اور مجروح کے مابین یہی وہ بنیادی فرق ہے جو خط فاصل کا درجہ رکھتا ہے۔

مجروح نے جس روایت کے اندر رہ کر شاعری کی وہ تصوف کی نکتہ رسی اور جزرسی سے عبارت ہے۔ مجاز سے حقیقت اور حقیقت سے مجاز کا رقص سرمدی لاکھ وجدانی سہی لیکن یہ بذات خود ظاہری قیود میں گفتار معاشرہ کو ایک ایسی باطنی حقیقت کا چہرہ دکھانے کے مترادف ہے جہاں سچ مصلحت کا جامہ پہن کر باطل نہیں ہو جاتا۔ مجروح نے جس دور میں شاعری شروع کی وہ آزادی کی عظیم الشان تحریک کا زمانہ تھا۔ یہ قوم پرستی سے بین الاقوامیت، ذات سے اجتماعیت اور ذاتی مسرت سے اجتماعی مسرت کی جانب سفر کا زمانہ تھا۔ ہر دور نئی حقیقتوں اور مماثلتوں کا ادراک لایا تھا۔ شاعروں نے اس دور کی مناسبت سے مختلف تجربات کیے۔ بعض غزل گو شاعروں نے بعض استعارات کو خفیف سے فرق کے ساتھ اس درجہ ہم

عصری بنانے کی سعی کی کہ وہ روایت سے درایت کی منزل پر جا پہنچے۔ فیض نے اپنی Images کے ذریعے اکثر و بیشتر مغربی شاعری کے ارتعاشات کو "اردوانے" کے رجحان کی ابتدا کی اور یہ کام اس قدر مہارت سے کیا کہ ان کے استفادہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ فیض سوئن برن، روسیٹی، نیرودا اور لورکا سے بے حد متاثر ہیں اور انھوں نے جا بجا ان شاعروں کے مخصوص رویوں سے استفادہ کیا ہے۔

فیض کی شاعری بسا اوقات Psychedelic کیفیات کی حامل نظر آتی ہے۔ اس کیفیت کا ظہور اس وقت ممکن ہوتا ہے جب انقلاب بمنزلہ عشق کے ہو جاتا ہے لیکن مجروح کے یہاں بسا اوقات ترک نظر آتی ہے جس کی وجہ سے وہ نظریہ سے آزاد ہو کر صرف انسان دوستی کے جذبات تک محدود رہتے ہیں۔ اقبال نے غزل کے بارے میں بڑی پتے کی بات کہی تھی، یہ بات غزل کے بارے میں اس لیے کہی جا سکتی ہے کہ اقبال نے ہماری کلاسیکی شاعری کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، وہ غزل پر ہی صادق آسکتا ہے۔ اقبال نے غزل کے مزاج میں Butterfly Imagination کی پھبتی کسی ہے اگر اقبال زیادہ فیاضی کا مظاہر کرتے تو یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ غزل کا ہر شعر ایک نظم ہوتا ہے اور اسی طرح ایک غزل میں جتنے اشعار ہوتے ہیں اتنی ہی نظمیں ہوتی ہیں۔ اقبال نے غزل کی ہیئت کے بارے میں مغربی شاعری کی روایت کے دائرہ میں رہ کر اعتراض کیا ہے اور غزل جیسی محبوب صنفِ سخن کے بارے میں ہماری شیفتگی سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شاید ہم من حیث المجموع، ارتکاز توجہ کی صلاحیت سے عاری ہیں اور اسی لیے غزل کی طرف جھکتے ہیں۔ شاید مجروح کی غزل پر "ارتکاز توجہ" کا الزام نہ لگ سکے۔ ان کی بیشتر غزلوں پر "غزل مسلسل" کا گمان گزرتا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ اس صدی کے تیسرے عشرے میں رونما ہونے والی معاشی اتھل پتھل نے اس صدی کے انسان کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا جب اخبارات کے تجارتی اور مالیاتی امور سے متعلق صفحات یک بیک اہم ہو گئے۔ کلاسیکی معاشیات کے بڑے بڑے ستون تیزی سے گرنے لگے اور اس درجہ واضح نظر آنے لگے کہ ادب کی وہ ساری تعریفیں غزل میں تغزل اور مواد Content کو ہیئت Form سے علیحدہ خیال نہ کرتی تھیں غلط ثابت ہونے لگیں۔ ایک طرف یورپ میں تھامس مان نے کہا کہ "اس دور کا مقدر سیاسی ہے" تو دوسری طرف منشی پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ (36ء)

میں اس خیال افروز حقیقت کا اعلان کیا کہ ''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔'' ترقی پسندوں کے اثرات زائل کرنے کے لیے حلقۂ ارباب ذوق وجود میں آیا۔ ترقی پسند ہوں یا حلقۂ ارباب ذوق کے وکلاء، غزل بلکہ تغزل پر ہر دو جانب سے زد پڑی، یہ وہ دور تھا جب اصغر، فانی، حسرت اور جگر، ثاقب، یاس یگانہ، جمیل مظہری اور درجنوں کم اہم غزل گو غزل کا جادو جگائے ہوئے تھے۔

فیض احمد فیض کے پہلے مجموعۂ کلام ''نقش فریادی'' (1941ء) کی پہلی غزل میں تغزل ہی تغزل ہے۔ اس مجموعہ میں غزل کی حد تک سیاست دوراں کے ساتھ جسم و جاں کا رشتہ استوار ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

حسن مرہون جوشِ بادۂ ناز
عشق منت کشِ فسونِ نیاز
ہو چکا عشق اب ہوس ہی سہی
کیا کریں فرض ہے ادائے نماز

فیض کے پہلے مجموعہ کلام میں پہلا ''سیاسی'' شعر غالباً یہ ہے۔

پاپوش کی کیا فکر ہے، دستار سنبھالو
پایاب ہے جو سوچ گزر جائے گی سر سے

دوسرے شعر میں بھی کچھ عجیب سا لطف ہے

صبا پھر ہمیں پوچھتی پھر رہی ہے
چمن کو سجانے کے دن آرہے ہیں

اس کے برخلاف مجروح کا مجموعہ ''غزل'' جس ترتیب سے سامنے آیا ہے اس کے مطابق فیض کے یہاں غم روزگار کی دلفریبی کے مفہوم سے ملتا ہوا شعر اس طرح آیا ہے۔

حادثے اور بھی گزرے، تری الفت کے سوا
ہاں مجھے دیکھ مجھے، اب میری تصویر نہ دیکھ
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کردیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

فیض کے شعر میں کہیں بھی ''میں''، ''مجھے'' یا ''میری'' نہیں ہے جب کہ مجروح

کے یہاں "مجھے" کی تکرار اور "مری تصویر" سے جس نوع کا "اصرار" ملتا ہے وہ فیض کے یہاں مفقود ہے۔ یہی فیض اور مجروح کے لہجہ کا فرق ہے۔ مجروح کے یہاں پہلا سیاسی شعر یہ ہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ مجروح کا تمام تر زور ترقی پسند غزل کی "گیسوئے خم بہ خم" کی مشاطگی پر ہے۔ وہ ترقی پسند نقطۂ نظر سے تمام تر اتفاق رائے کے باوجود جس میں انسان دوستی، استحصال سے پاک معاشرہ کا قیام، سائنسی فکر کی بالادستی اور بین الاقوامیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے جستجو شامل ہے، روایتی غزل کی شیریں کلامی سے دست کش نہیں ہوپاتے۔ وہ "مواد" اور "ہیئت" کے متناسب آمیزہ پر یقین رکھتے ہیں، یہ ایک ایسا کمال ہے جسے مجروح نے بخوبی حاصل کیا ہے۔ اس مضمون میں مجروح اور ان کے ہم عصروں کا تقابلی مطالعہ مقصود نہیں لیکن وہ تمام شعراء جنہوں نے مجروح کی غزل کا تتبع کیا ہے مجروح کی منفرد اہمیت بلکہ قیادت سے انکار نہیں کر سکتے۔ ●●

ڈاکٹر حنیف الدین فوقؔ

میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

مجروحؔ سلطان پوری نے غزل کو نئی معنویت سے ہم کنار کیا

چراغ بجھتے چلے جا رہے ہیں سلسلہ وار
میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے

ادب کی قد آور شخصیات رفتہ رفتہ معدوم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ دنیائے ادب کے لیے یہ ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مجروحؔ سلطان پوری بھی راہی ملکِ عدم ہوئے۔ مجروحؔ صاحب کا شمار بر صغیر کے ان شعراء میں ہوتا ہے، جو اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں اور جن کا اپنا ایک آہنگ ہے۔ وہ صاحب طرز بھی تھے اور صاحب اسلوب بھی۔

یہ انتہائی افسوس ناک صورت حال ہے کہ بعض اخبارات نے انھیں صرف فلمی گیت نگار کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور بعض اخبارات نے ان کے ترقی پسندانہ رجحانات کو ان کی شناخت کا بنیادی وسیلہ قرار دیا ہے۔ فلمی گیت نگاری یقیناً ان کی شہرت کا باعث بنی، لیکن یہ ان کی شخصیت کا ایک پہلو ہے۔ ترقی پسندی بھی ان کی ذات کا ایک حوالہ ہے۔ مجروحؔ سلطان پوری ایک فطری شاعر تھے، اور کسی فطری شاعر کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنا ایک غیر فطری عمل ہے۔

مجروحؔ سلطان پوری غزل کے نہایت خوش فکر شاعر تھے۔ غزل گوئی میں ان کا جداگانہ اسلوب تھا، جو آگے چل کر ان کی شناخت بنا۔ انھوں نے ادب کی جمالیاتی روایات کو ہمیشہ عزیز رکھا۔ ان کی غزلوں میں احتجاجی عنصر کے ساتھ ساتھ رنگِ تغزل بھی نمایاں ہے۔ فلمی گیت نگاری ان کی ضرورت تھی، لیکن اس میدان میں بھی انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار رکھا اور ایسے گیت لکھے جو فلمی دنیا ہی کا نہیں، ادب کا بھی گراں قدر سرمایہ ہیں۔

x-x-x

مجروحؔ سلطان پوری کی شاعری میں بدلتی ہوئی زندگی کے بدلتے ہوئے معیارات

کلاسیکی مناسبت، رومانیت اور غنائیت کے ساتھ اس طرح مل گئے ہیں کہ ان کی آواز اپنے دور کی اہم آواز بن گئی ہے۔ یہ شاعری کا کیمیائی عمل ہے، جو سماجی حقائق کو آہنگ اور تلازماتی پیکروں میں ڈھال کر ذہن کو روشنی اور جمالیاتی مسرت عطا کرتا ہے۔ مجروحؔ سلطان پوری ان شاعروں میں سے ہیں جن سے مجموعی طور پر شاعری اور خاص طور پر غزل کی شاعری کو ترقی پسندانہ آگاہی اور تہذیبی توانائی حاصل ہوئی۔ بقول میرؔ "مے کدہ اک جہان ہے گویا" مجروحؔ سلطان پوری ہر موضوع، جذبے یا احساس کو غزل کی زبان میں ادا کر دینے کے قائل ہیں۔ جدید نظم کے آغاز کے وقت بھی غزل پس پشت پڑ گئی تھی۔ لیکن اقبالؔ سے لے کر حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ تک غزل نے پھر نئی آب و تاب سے جلوہ گری کی۔ اسی طرح ترقی پسند تحریک نے موضوعاتی شاعری پر زیادہ توجہ دی تھی جس کے لیے نظم گوئی کا قالب زیادہ موزوں تھا۔ لیکن فراقؔ، فیضؔ، یگانہؔ اور مجازؔ نے غزل کو پھر نئی رمزیت اور نئی معنویت سے ہم کنار کیا، مجروحؔ سلطان پوری نے غزل کی ایمائیت اور استعاراتی دروبست کو ضروری سمجھا ہے لیکن ان واسطوں سے انھوں نے عصری شعور کی ترجمانی کی ہے اور ترقی پسندانہ تصورات کو تقویت پہنچائی ہے۔

وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) نے کہا تھا کہ "ساری دنیا میں اس خیال سے زیادہ کوئی طاقت ور نہیں جس کا وقت آگیا ہو۔" اس کے برخلاف یہ بھی کہا جاسکتا ہے اور کہا گیا ہے کہ کوئی طرزِ فکر یا ذہنی رجحان نہیں بلکہ یہ حرکتِ عوام ہے جو انقلابی امکانات کو متعین کرتی ہے۔ شاید وقت آنے اور حرکت عوام میں کوئی ایسا رشتہ ہے کہ ایک کو دوسرے میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ اس بیدار ذہن اور اس مضطرب دل کا ذکر بھی ضروری ہے جو کسی فکری صداقت کو اپنے وجود کے پورے ذخیرۂ شوق کے ساتھ پیش کر کے اسے ایسا روشن اور تابناک بنا دیتا ہے کہ سب اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ڈائیلان تھامس (Dylan Thomas) نے اپنی ایک نظم میں حال کے کرب و انحطاط کو پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ "میرا ایک اور شریف النفس دل گواہ رکھتا ہے۔ تمام محبت کے ممالک میں جو تلاش سے بیدار ہوں گے۔" غزل کی زبان اپنی دل آسائی اور اپنے رموز و علائم رکھتی ہے جو ذاتی کیفیتوں اور اجتماعی صورتوں دونوں کے اظہار پر قادر ہیں۔ اسی زبان میں اپنی شاعرانہ بصیرت کا اظہار کرتے ہوئے مجروحؔ سلطان پوری کہتے ہیں کہ۔

جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا
سوز جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا
میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
میں تو جب مانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا
جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایان شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا
دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

مجروحؔ کی شاعری میں موسیقی کی جو لے ہے، اس نے انھیں فلموں کی گیت نگاری میں بہت کامیاب کیا۔ شاعرانہ نغمگی کے اعتبار سے ترقی پسند شعراء میں مجازؔ، فیضؔ اور مجروحؔ الگ مقام رکھتے ہیں۔ مجروحؔ نے آرزو اور ساحر لدھیانوی کی طرح فلمی گیتوں کا درجہ بھی بلند کیا۔ لیکن شاعرانہ اعتبار سے فیضؔ کی گوشۂ زنداں سے آتی ہوئی آواز جو غرورِ عشق کا بانکپن رکھتی ہے، وہ اپنی اثر انگیزی میں مختلف حیثیت کی حامل ہے۔ مجروحؔ نے بھی دار و زنداں کی بات خوبی سے کہی ہے۔

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

مگر یہ خود سہنے کا نہیں ساتھ دینے کا انداز ہے۔

ہوا اسیر کوئی ہم نوا تو دور تلک
بہ پاس طرز نوا ہم بھی ساتھ ساتھ چلے

مجموعی شاعرانہ شعور کے اعتبار سے یقیناً فیضؔ زیادہ بلند درجے پر فائز ہیں مگر مجروحؔ نے جو شاعرانہ نقوش بنائے ہیں ان کی رنگینی اور پرکاری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بعض مقامات پر سماجی زندگی کی ہیئت تنظیم اور مدارج ترقی کے اعتبار سے مجروحؔ نے شاعرانہ آگاہی کی بہتر ترجمانی کی ہے۔ فیضؔ انقلاب کی راہ میں محبوب کو حائل سمجھتے اور "مجھ سے پہلی

سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" کی صدا بلند کرتے ہیں۔ حالانکہ مجاز آنچل سے پرچم بنا لینے کی اچھائی کو پیش کر رہے تھے اور مجروح نے پوری شاعرانہ شیفتگی کے ساتھ کہا ہے کہ۔

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

کہیں کہیں مجروح نے بڑی جمالیاتی سرشاری سے کہا ہے کہ۔

نہ ہم قفس میں رکے مثل بوئے گل صیاد
نہ ہم مثال صبا حلقۂ رسن میں رہے
کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے
ہوئے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے

پھر یہ شکوہ بھی کہ۔

زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروح
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

مجروح کی شاعری کو ابلاغ کا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا اور ترقی پسند تحریک نے اجتماعی انداز نظر بھی فراہم کر دیا تھا۔ لیکن مجروح کے کلام کی آراستگی میں کلاسیکی شاعری کے کئی عناصر شامل ہیں اور جگر، حسرت، بابا کبیر داس کی آواز بازگشت بھی ان کے اشعار میں مل جاتی ہے۔ جگر کے شاعرانہ آہنگ نے مجروح کو متاثر کیا ہے، حسرت کہتے ہیں کہ۔

پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو
تم بھی حسرت اٹھو سلام کرو

اور مجروح کا شعر ہے کہ۔

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

بابا کبیر داس کہتے ہیں کہ۔

کبیر کھڑا بجار میں لیے لوہاٹھی ہاتھ
جو گھر جارے آپنا چلے ہمارے ساتھ

مجروح کا شعر ہے کہ۔

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

ایسے تمام اثرات کے باوجود مجروحؔ کی شاعری اپنا جداگانہ مزاج اور وہ عصری احساس رکھتی ہے جو اسے حال ہی نہیں، مستقبل میں، صنعتی دور کے ماورائے اخلاق رشتوں کی واقفیت عطا کرتا ہے۔ آج کے عالمی بازارِ اقتصادیات میں جہاں ہر شے فروخت ہوتی ہے۔ مجروحؔ کے اس شعر کے تیور دیکھیے۔

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

بہتر انسانی معاشرے کے لیے سماجی زندگی میں انقلاب کے تصور نے ترقی پسند تحریک کی راہ نمائی کی تھی لیکن اس تصور کو معروضی حقائق کی روشنی میں پیش کیا تھا اور تبدیلی کے لیے ضابطے بھی فراہم کیے تھے۔ لیکن یہ ضابطے ماضی کی فرسودگی کی نفی کرتے ہوئے بھی ماضی کی قدرِ انسانیت کی نفی نہیں کرتے۔ چنانچہ فیضؔ، مجازؔ، مخدومؔ، احمد ندیم قاسمی اور مجروحؔ سلطان پوری بھی ماضی کی انسانی روایات اور ماضی سے حاصل شدہ جمالیاتی اکتسابات کو نیا اور انقلابی مفہوم دیتے ہیں۔ مجروحؔ کہتے ہیں کہ۔

ہماری راہ میں آئے ہزار مے خانے
بھلا سکے نہ مگر ہوش کے قرینوں کو
پستیِ زمیں سے ہے رفعتِ فلک قائم
میری خستہ حالی سے تیری کج کلاہی بھی
دیکھ کلیوں کا چٹکنا سرِ گلشن صیاد
زمزمہ سنج مرا خونِ جگر ہے کہ نہیں
ہجومِ دہر میں بدلی نہ ہم سے وضعِ خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

اینگلز نے Anti-Duhring میں کہا ہے کہ ''بنجر نفی صرف داخلی اور انفرادی ہے۔ کسی شے کا مرحلہ ترقی نہ ہوتے ہوئے یہ ایک ایسا خیال ہے جسے باہر سے داخل کیا گیا ہے۔ چوں کہ اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اس لیے نفی کرنے والا بھی دنیا کے ساتھ ایسا جھگڑا

کرنے والا ہے جو بد مزاجی سے ہر شے میں جو موجود ہے یا کبھی ہوئی ہے تمام تاریخی ارتقاء کے ساتھ عیب تلاش کرتا ہے۔" (ص 476 تیسرا ایڈیشن) اس کتاب میں اینگلز نے ترقی کے نام پر لاف زن اور نمائشی دعویدار خود (Duhrin) پر تنقید کی ہے جس کی تمام کوششوں کا ماحصل اپنی ذات کی نمود ہے، مگر مجروح کا بھی ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔ شاید عام جلسے جلوسوں کی سیاست میں ایسے عناصر کو ابھرنے کا زیادہ موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ مجروح سلطان پوری کو بھی یہ کہنا پڑا کہ۔

تجھے نہ مانے کوئی تجھ کو اس سے کیا مجروح
چل اپنی راہ بھٹکنے دے نکتہ چینوں کو

مجروح سلطان پوری ان شاعروں میں سے ہیں جن کا عوام سے مکالمہ رہا ہے (پر مجھے گفتگو عوام سے ہے میر) لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی تہذیبی روایات کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان کی تہذیبی نظر نے اپنے ماحول کے ساتھ جو مطابقت قائم کی اس میں تاریخی پیش قدمی کی خصوصیات بھی شامل ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے عصری خلفشار نے انتشار کا رخ بھی کیا ہے لیکن پیچیدہ زندگی کی تمام پیچیدگیوں کے باوجود مجروح سلطان پوری نے اپنی تازگی احساس کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ ان کی شاعری ایک سلسلۂ فکر سے منسلک ہے لیکن اس میں ان کی تہذیبی صورت گری کی انفرادی شان اور گرمیٔ احساس کی الگ آن بھی ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

ہم روایات کے منکر نہیں لیکن مجروح
سب کی اور سب سے جدا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں

●●

نعیم بازید پوری، جدہ

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے

مجروح سلطانپوری بدھ اور جمعرات 24-25 مئی کی درمیانی شب بمبئی میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ مجروح ترقی پسندوں کے سرخیلوں میں تھے، حقیقت پسندوں کے امیروں میں ان کا شمار تھا۔ کبھی کبھی رجعت پسندوں کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے لیکن ایسے ہی جیسے شاخ گل سے وابستہ کسی پھول کو سونگھنے کی کوشش میں کبھی کبھی آس پاس کے پتے آنکھوں میں چند ثانیے کے لیے چبھ جاتے ہیں لیکن پھول کی خوشبو اس چبھن پر غالب آجاتی ہے۔ وہ مشاعروں کے کامیاب ترین شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ فلمی شاعری میں اس وقت شاید ہی کوئی ان کے قد و قامت کی ہمسری کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ ادبی شاعری کے شہریاروں میں بھی انھیں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ فلمی دنیا سے وابستہ ایک ایسے شاعر تھے جس کا ادبی قد شاعروں سے بھی نکلتا ہوا نظر آتا تھا۔ مشاعروں کے ٹکٹ بیچنے کے لیے ان کا نام آج بھی بہت بڑا حوالہ تھا۔ خالص علمی اور ادبی بحث میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ ایسی ہمہ جہت شخصیت ان کے معاصرین میں شاید ہی کسی کی ہو۔ وہ بے پناہ رومانی شاعری بھی کرتے تھے مگر نیاز فتح پوری جیسی رومانیت سے، جسے آسیبی رومانیت کہا جاسکتا ہے، وہ متاثر نہیں تھے۔ مجروح ایسے سخنور بے مثل تھے جنھوں نے اس زمانے میں جسے فیض، مجروح، جذبی، مخدوم اور علی سردار جعفری کا مشترکہ زمانہ کہہ سکتے ہیں، اردو شاعری کو نادر لب ولہجہ عطا کیا۔ ان کے شعروں کی جھنکار پائل اور سلاسل دونوں کی آوازوں کا حسین امتزاج تھی۔ مجروح نامساعد حالات کے باوجود استقلال مجسم تھے۔ وہ بے حد معاملہ فہم اور حالات کا صحیح ادراک رکھنے والے شاعر تھے اور فخریہ کہتے تھے۔

ہجوم دہر میں بدلی نہ ہم نے وضع خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
ہاتھ آگیا ہے دولت بیدار کی طرح

مجروحؔ اور ان کی شاعری کی شائستگی ان کے اس ماحول کی دین تھی جس میں وہ پلے بڑھے تھے۔ ان کی تہذیب سلطان پور اور فیض آباد کی ساختہ پرداختہ تھی۔ ابتدائی تعلیم دینی مدارس میں حاصل کی۔ عربی اور فارسی پر عبور حاصل کیا۔ زانوئے تلمذ مشاہیر اور اکابر علم و فن کے سامنے تہہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ولی دکنی سے جگر مراد آبادی تک طویل اور برسہابرس پر محیط دور کی شعری روایات ان میں رچ بس گئی تھیں اور یہی وہ مضبوط جڑیں تھیں جن کے طفیل وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہو کر انتہائی کامیاب ہوئے۔ کیسے کیسے لوگوں نے اپنی وضع قطع بدل لی مگر وضع قطع بدلنے والے ان لوگوں کی کوئی پختہ تہذیبی اساس نہیں تھی جب کہ مجروحؔ کی تہذیبی اور تمدنی بنیاد بہت مستحکم تھی۔ وہ آخری عمر تک رہن سہن، بود و باش کھانے پینے، ملنے جلنے، اٹھنے بیٹھنے اور بڑوں چھوٹوں کے ساتھ مراسم میں انتہائی صحتمند رویہ کے حامل رہے۔

مجروح کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اردو غزل کے بہت بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ اس کے بہت بڑے سرپرست، پاسبان اور محافظ بھی تھے۔ ایک دور ایسا بھی آیا جب انھیں اپنے ترقی پسند ساتھیوں کی طرف سے بھی غزل کو لاحق خطرات کا احساس ہوا اور وہ تمام تعلقات بالائے طاق رکھ کر غزل کے دفاع میں لگ گئے۔ نظم کو غزل پر ترجیح دینے والوں سے انھیں شکایت تھی کہ انھوں نے غزل کو غزل کی طرح برتے بغیر ہی اس کی مخالفت شروع کر دی ہے۔

ان کا خیال تھا کہ غزل کا دائرہ وسیع اور ہمہ گیر ہو گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجروحؔ تمام عمر اقبالؔ کے بہت بڑے پرستار رہے۔ ان کی اقبالؔ پسندی کا اندازہ ان کے اس فارسی شعر سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے ایک بار علی گڑھ میں یوم اقبالؔ کے جلسے میں اپنا کلام سنانے سے قبل کہا تھا۔

اے خاتم رسالت پیغمبران شعر
تاج سر رسالت شعری کلاہ تو

اقبالؔ سے حد درجہ متاثر مجروحؔ ترقی پسند تحریک کو بھی اردو غزل کا محاذ سمجھتے تھے۔ ترقی پسندی اور رومان کا دلنواز آمیزہ مجروحؔ کی شاعری میں کتنے اور کیسے جلوے دکھاتا ہے۔ آپ بھی دیکھئے۔

پہلے بھی تیز رو تھے پہ اس دلنشیں کے ساتھ
یہ چشم نم یہ مستی رفتار دیکھنا

سیدھی ہے راہ شوق پہ یونہی کبھی کبھی
خم ہوگئی ہے کوچہ دلدار کی طرح

قدم کو فیض جنوں سے وہ آبلہ ہے نصیب
جو خار راہ کو بھی شمع رہگذار کرے

دست پرخوں کو کف دست نگاراں سمجھے
قتل گہہ تھی جسے ہم محفل یاراں سمجھے

آپ مجروحؔ کو پڑھتے جائیے سنتے جائیے اور سر دھنتے جائیے۔ رفتہ رفتہ ان کی شاعری، ان کے خیالات شعر و سخن سے بلند ہو کر علم و حکمت تدبر اور تعقل فکر و دانش کا اثاثہ بنتے نظر آتے ہیں، ایسا اثاثہ جس میں بلا کی آفاقیت ہے۔

جب ہوا عرفاں تو غم آرام جاں بنتا گیا
سوز جاناں دل میں سوز دیگراں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے سات چلے

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

مجروحؔ سلطان پوری عملاً ترقی پسندی کی تحریک یا کسی انقلابی تحریک سے وابستہ نہیں رہے بلکہ ایک عرصہ تک وہ ان لوگوں کی شہ رگ بنے رہے جو انقلابی تحریک سے وابستہ تھے، جنہیں ہم الٹرا پروگریسیو کہہ سکتے ہیں۔ ان کی طبیعت کی سادگی، مقصد کی پاسداری کا شدید احساس ان کا بہت بڑا سرمایہ تھا۔ انھوں نے برے دنوں میں بہت سے ان ترقی پسندوں کی ہر طرح مدد کی جنہوں نے بعد میں خود ان پر "عافیت کوشی" کا الزام بھی لگایا۔ وہ جو کہتے ہیں "دامے درمے سخنے" تو انھوں نے یقیناً بہت سے لوگوں کی "سخن" سے بھی مدد کی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے اشعار کو عرصہ دراز تک بلکہ بعض حلقوں میں حال حال تک دوسروں کا کارنامہ سمجھا جاتا رہا۔

بہت سال قبل جب وہ پاکستان آئے تو کراچی آرٹس کونسل میں نام نہاد ترقی پسند طلباء نے ان پر اعتراض کرتے ہوئے ان کی "عافیت کوشی" پر نکتہ چینی کی۔ مجروحؔ ان "لونڈوں" کو تو خیر کیا جواب دیتے، اپنی روایتی متانت سے وہ شاندار غزل بنائی جسے سنتے وقت بہت سے نام نہاد سورماؤں کو سر جھکا کر بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ غزل کے بعض شعر ہیں۔

چاک جگر محتاج رفو ہے آج تو دامن صرف لہو ہے
اک موسم تھا ہم کو رہا ہے شوق بہاراں تم سے زیادہ

جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشنِ چراغاں تم سے زیادہ

مجروحؔ مریدانِ میر میں شمار تو ہوتے تھے مگر میرؔ کی طرح نیچے دروں اور نیچے پروں شاعری نہیں کرتے تھے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح میرؔ کبھی کبھی مکمل "دروں" کا انداز اختیار کرتے تھے، مجروحؔ اسی طرح، کبھی کبھی نہیں، بلکہ اکثر بالکل دو ٹوک بات کہہ دیا کرتے تھے۔

اب کھل کے کہوں گا ہر غم دل مجروحؔ نہیں وہ وقت کہ جب
اشکوں میں سنانا تھا مجھ کو آہوں میں غزل خواں ہونا تھا

ہم اہل عشق ہیں، نہیں حرف گنہ سے کم
وہ حرف شوق جو سر محفل کہا نہ جائے

باراں کے منتظر ہیں سمندر یہ تشنہ لب
احوال میزبانیِ ساحل کہا نہ جائے

مجروح نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک اردو شاعری اور بالخصوص غزل کی بے پناہ خدمت کی۔ ان کی خدمات گراں مایہ کا ذکر ایک چھوٹے سے مضمون میں کرنا یقیناً بہت مشکل ہے۔ اس لیے مضمون ختم کرتے ہوئے میں حضرت مجروح کے اس شعر کا سہارا لینا پسند کروں گا کہ:

ادائے طول سخن کیا وہ اختیار کرے
جو عرض حال بہ طرز نگاہ یار کرے

●●

انیسؔ دہلوی

مجروحؔ کی فلمی شاعری

فلمی دنیا ادبی دنیا سے ان معنوں میں مختلف ہے کہ اس شاہراہ پر ہر کس و ناکس کا گزر نہیں ہوتا۔ ادبی دنیا میں شعراء کی ایک طویل فہرست ہے لیکن ان میں سے چند ایک کے حصے میں شہرت آئی اور وہ بھی وقتی شہرت۔ فلمی دنیا میں وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ اداکاروں کی طرح بہت جلد کسی کا سورج آسمان کی بلندیوں کو چھوتا ہے تو آناً فاناً میں عرش سے فرش پر آجاتا ہے۔ زمانے کے تقاضے بدلتے ہیں، فیشن بدلتے ہیں، بالوں کے اسٹائل تبدیل ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اداکاری کے جوہر بھی تبدیلی کا شکار ہو جاتے ہیں یہ بڑی ہی دلکش، دلفریب، آنکھوں کو خیرہ کرنے والی دنیا ہے لیکن اس میں چند ایک ہی وہ خوش نصیب ہیں جن کا سورج کبھی غروب نہیں ہوا۔ فلمی دنیا سے جو شعراء منسلک رہے اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچے انھوں نے شاعری ہی نہیں کی بہت سے ہتھکنڈے بھی استعمال کیے، جائز اور ناجائز۔ البتہ ایک سچا غزل گو ایسا بھی رہا ہے جس نے کبھی پینترے نہیں بدلے، کرتب نہیں دکھائے بلکہ ۱۹۴۵ء سے آج تک یعنی فلم "شاہجہاں" سے "قیامت سے قیامت تک" شاعری کی منفرد ڈگر پر چلتا رہا۔ وہ ہیں مجروحؔ سلطانپوری۔

جگر مرحوم کے ساتھ ایک مشاعرے میں ممبئی گئے تو یہ شعر پڑھا

شب انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ بجھا دیا کبھی اک چراغ جلادیا

تو فلمی دنیا کو پسند آگئے۔ فلمی دنیا کے اپنے اصول اپنے معیار اقبال ڈے کے موقع پر ممبئی میں عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ ایسے ہی ایک مشاعرے میں جب مجروحؔ نے اپنی غزل کا ساز چھیڑا تو مشہور پروڈیوسر ڈائریکٹر اے آر کاردار، محبوب صاحب مرحوم اور شانتارام نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ اس نوجوان کو فلمی دنیا میں رونق افروز ہو کر فلمی شاعری کے چراغ کو

روشن رکھتے ہوئے عروج تک جانا چاہیے۔ یہ فلمی دنیا کے لیے بھی خوش آیند بات ہوگی۔ یوں تو فلمی دنیا کے لیے گیت لکھنا بہت سہل دکھائی دیتا ہے لیکن جب اس کی تہہ میں جایئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دشوار مرحلہ ہے۔ شاعری میں تو بس جذبات کا اظہار کردینا ہی کافی ہوتا ہے مگر فلمی گیت کہانی اور گانے کے ماحول اور خاص کر کرداروں کے مزاج کو ذہن میں رکھ کر لکھا جاتا ہے۔ انترے کے استعمال پر عبور رکھنا بھی ضروری ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے، جب عوام کی ذہنی سطح کو سمجھتے ہوئے مصرعے کی برجستگی کا خاص اہتمام کیا جائے۔ یہ گیت ہی ہیں جو عوام کے جذباتی رشتوں کو سمجھنے میں معاونت رکھتے ہیں اور ان کے لیے فضا سازگار کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ فلمی دنیا سے وابستہ شعراء میں شکیل بدایونی، راجہ مہدی علی خاں، شلیندر، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، قمر جلال آبادی، گلزار، حسرت جے پوری کے ساتھ ساتھ مجروح اپنے منفرد لب و لہجے سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ تقریباً ۴۵ سال سے فلمی دنیا سے وابستہ ہیں اور آج بھی ان کا شاعرانہ مزاج فلمی گیتوں میں ڈھل کر انقلاب برپا کرتا ہے۔ چاہے وہ رومانی گیت کیوں نہ ہو۔

فلم "شاہجہاں" کا مشہور مکھڑا تھا......

کرلیجئے چل کر میری جنت کے نظارے
جنت یہ بنائی ہے محبت کے سہارے

جو مدتوں عوام و خواص کی زبان پر جاری رہا۔

زنداں کی صعوبتیں برداشت کرنے والے اس شاعر کو جوشیلے گیت لکھنے کی بنا پر بھی گرفتار کیا گیا لیکن وہ جوانی کی امنگوں اور انقلاب کی ترنگوں میں اتنے ڈوب چکے تھے کہ وہاں سے نکلنا ان کے بس سے باہر تھا۔ انسان کو ہر حال میں اپنے اوپر قابو نہیں رہتا لیکن جن فنکاروں میں فن کی عظمت پوشیدہ ہوتی ہے وہ کچھ ضدی مزاج بھی ہوتے ہیں۔ اس کی صرف ایک مثال یہاں کافی ہے۔ فلم "انداز" کے گیت زیادہ جوشیلے تھے جس کی پاداش میں اُس زمانے میں ممبئی کے چیف منسٹر (سابق وزیر اعظم) مرارجی ڈیسائی نے سیاسی صورت حال کے پیش نظر گرفتاری کا وارنٹ جاری کردیا۔ مجروح کم بیش ایک سال تک زیر زمین رہے۔ سجاد ظہیر، جو راولپنڈی سازش کیس میں پاکستان میں اسیر تھے ان کی رہائی کے واسطے احتجاجاً ایک جلسہ اور مشاعرہ منعقدہ کیا۔ دوستوں، عزیزوں کے باربار منع کرنے کے باوجود

مجروحؔ مشاعرے میں گئے اور وہی انداز اختیار کیا جو حکومت کو ناروا لگا۔ مجروحؔ کو مشاعرے کے بعد پولیس نے پھر تھام لیا۔ پولیس اسٹیشن لے گئے، وہاں معافی مانگنے کے لیے کہا گیا تو مجروحؔ نے بہت سخت الفاظ میں کہا۔ ''میرے لہجے سے آپ کو اختلاف ہو تو ہو مگر جو باتیں اپنے شعروں میں کہتا ہوں وہ بالکل درست ہیں۔ معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''۔ لہٰذا ایک سال تک نظر بند رہے واپس آئے تو ترنگ میں اضافہ ہو گیا۔

ایک زمانے میں فلمی نغمہ نگار مختلف اخبارات ورسائل میں ایک دوسرے کے لیے حوصلہ افزا خیالات لکھتے تھے۔ وہ دور بھی دراصل روایتوں کا دور تھا۔ روایت شکن جب تک روایت پرست نہیں ہو گا وہ مکمل طور پر روایت شکن نہیں ہو سکتا۔ مجروحؔ یوں بھی جاگیر داری نظام سے وابستہ تھے لیکن ادب دوستی اور ادب نوازی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔

ادب اور زندگی کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے اور رہے گا۔ حق بات کہنے میں مجروحؔ کبھی خاموش نہیں رہے، اس کا ایک واقعہ کراچی میں پیش آیا۔ جب مجروحؔ کراچی سے مشاعرے میں پہنچے تو ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی، میزبان شعراء نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مشفق خواجہ نے مجروحؔ کو ایک کتاب میں ایک ناقد کی رائے سے آگاہ کیا اور الزام بھی مجروحؔ کے سر تھوپ دیا۔ ناقد نے تحریر کیا تھا کہ مجروحؔ خود کو فیضؔ سے بڑا شاعر تصور کرتے ہیں اس پر مجروحؔ نے جلسہ گاہ میں کہا اگر میں فیضؔ سے بڑا شاعر نہیں تو چھوٹا بھی نہیں ہوں۔ اس طرح کی چشمکیں ہر زمانے میں رہی ہیں اور رہیں گی لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا مجروحؔ، فیضؔ کے ہم پلہ شاعر ہیں؟ یہاں فیضؔ اور مجروحؔ کے کلام کو ایک بار پھر کھنگالنا ہو گا اور ان تمام موضوعات کی نشاندہی کرنی ہو گی جہاں دونوں شاعروں نے تقریباً ایک ہی عنوان پر غزل یا نظم کہی۔

مجروحؔ نے فلمی دنیا سے وابستہ ہونے کے بعد کئی اہم تبدیلیاں بھی کیں۔ عرصہ دراز سے جدائی کے نغمے ہی مقبول تھے۔ دراصل فلم کی کہانی المیہ سے دوچار رہتی تھی۔ جدائی، ہجر کے غم زدہ نغموں کی فراوانی رہتی تھی۔ دوسرے قسم کے گیتوں کی کم گنجائش ہوتی تھی۔ مجروحؔ نے دوگانوں میں ظرافت، شوخی، شرارت کو متعارف کرایا اور وہ بھی اس سلیقے سے کہ آج تک دوگانوں کا رواج بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ایسے گیتوں میں مختصر الفاظ میں سلیقہ سے بات کہنا ایک ہنر سمجھا جاتا ہے اور اس ہنر نے مجروحؔ کی فلمی شاعری کو عروج دیا ہے۔ ان کے علاوہ مزاحیہ گیتوں کو بھی مجروحؔ نے روشناس کرایا۔ یہی نہیں فلمی دنیا کی

رنگا رنگی مصروفیات کام کی زیادتی سے فنکار تھک جاتے ہیں اور اس تھکاوٹ کو دور کرنے کا واحد سہارا وہ پارٹیاں ہیں جو فنکاروں کی تھکن کو دور کر کے ان میں زندگی کا ایک نیا حوصلہ عطا کرتی ہیں۔ ایسی ہی محفلوں میں یوم پیدائش، فلم کی کامیابی پر سلور جوبلیاں خاص طور پر منائی جاتی ہیں مجروح نے جہاں مزاحیہ گیتوں کی بنیاد ڈالی وہاں سالگرہ کے گیت ایک خاص دلکشی کے ساتھ پیش کیے۔ ظاہر ہے جب کوئی نیا گیت لکھا جائے گا نیا ماحول ہوگا نیا انداز ہوگا۔ نئی سچویشن ہوگی تو اس کے لیے غزل کے علاوہ اخلاقی، صوفیانہ، فلسفیانہ، ولیش بھگتی، برتھ ڈے جیسے مستعمل الفاظ کو اتنی خوبصورتی سے استعمال کیا کہ ایک تو وہ بالکل نئے معلوم ہونے لگے دوسرے ہمارے مزاج اور کلچر کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے مثال کے طور پر ماشاء اللہ، ہائے اللہ، انشاء اللہ، واللہ وغیرہ یہ اس قسم کے الفاظ ہیں جو صوتیاتی اہمیت کو بھی دوبالا کرتے ہیں۔ ان سے بھرپور صنف کی نمائندگی بھی ہوتی ہے پھر کچھ روزمرہ محاورے بھی ہیں جن کی اپنی شناخت ہے۔

مجروح ترقی پسند شاعروں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس تحریک کے عروج و زوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کے ساتھ رہے۔ بعض غزلوں کے اشعار اتنے مشہور ہوگئے کہ ان پر ترقی پسند شاعر فیض کا گمان ہوتا ہے کیونکہ مجروح بھی بالعموم ظلم و ستم سے نفرت کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے گیتوں کو فیض، مجاز اور مخدوم کی طرز پر نہیں رہنے دیا اس سے آگے بڑھے انھوں نے اختلاف بھی کیا۔ لیکن فلمی دنیا اور اس کے گیتوں کی شان ہی نرالی ہے۔ بہت سے ترقی پسند شاعر ان کے پیش رو ہیں مثال کے طور پر علی سردار جعفری، مجاز، جذبی، مخدوم انھوں نے سب کا احترام بھی کیا۔ ان میں سے سردار جعفری نے بھی کچھ دنوں فلموں سے وابستگی اختیار کی لیکن وہاں ان کے قدم نہیں جم سکے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ایک طبیب نبض پر ہاتھ رکھ کر مرض کی تشخیص کرتا ہے اسی طرح مجروح (انھوں نے طب بھی پڑھی اور بطور طبیب پریکٹس بھی کی ہے) بھی فلمی دنیا کے نباض ہیں۔ ان کی فکر فلمی دنیا میں اپنے گیتوں سے اُجالا کرتی ہے اور فلمی شاعری کے چراغ کو روشن رکھے ہوئے ہے۔

مجروح ترقی پسند ہوں یا جدیدیت کے علمبردار، لیکن فلمی دنیا میں انھوں نے اپنا سکہ ڈھالا اور خوب چلایا اور اس کاوش میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں۔ اردو غزل میں تو واقعی

وہ منفرد لب و لہجے کے مالک ہیں لیکن فلمی نغموں میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور یہ مرتبہ کوئی چھوٹا نہیں۔

فلمی شاعری مجروحؔ کے لیے ذریعہ عزت نہیں، ذریعہ معاش ہے لیکن مجروحؔ اپنی فلمی شاعری کو زیادہ معیاری بھی نہیں سمجھتے۔ وہ بلاشبہ رچا ہوا جمالیاتی ذوق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فلمی گیتوں میں بھی مختصر پیرائے کو اہمیت دیتے ہوئے اس میں بڑی سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔

میں نے اس موضوع کا انتخاب اس لیے کیا کہ مجروحؔ کی شاعری میں جو غزلیں نظمیں ہیں ان کی تعداد انگلیوں پر گن لیجیے۔ لیکن آج تک فلمی نغموں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہو گئی ہے یہ کچھ اہم بات نہیں ہے کہ مجروحؔ نے اپنے فن اور پیشے کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ موجودہ عہد تو روایت شکنی سے عبارت ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ ۶۰ء کے بعد روایتوں کو جس طرح توڑا گیا ان کی حیثیت کو جس طور پر مجروح کیا گیا ایسے حالات میں روایتوں کو قائم رکھنا اور ان پر چلنا اور اپنے گیتوں میں استعمال کرنا خود بہت بڑی انفرادیت ہے۔ عام ڈگر سے ہٹ کر چلنے والوں میں اپنی شاہراہ خود بنانے والوں میں مجروحؔ کا نام بھی ایک خاص اہمیت اور احترام کا حامل ہے۔

ایک زمانہ تھا جب فلمی دنیا میں پردیپ اور پنڈت مدھوک کے گیتوں کا آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا لیکن مجروح واحد شاعر ہیں جنھوں نے ان کے ہی سامنے، ان کی ہی حیات میں اپنی شاعری کا چراغ روشن کیا اور آفتاب کی ان بلندیوں کو چھوا کہ جہاں کسی دوسرے شاعر کا پہنچنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ●●

پیش لفظ ''مشعلِ جاں''

گفتنی ناگفتنی

اس عہد تجارت میں جب کے حسن فطرت کو جنس اور زر گل کو زر نقد میں تبدیل کیا جاچکا ہے، دیکھیے ان اصناف ہنر کا کیا انجام ہوتا ہے جنہیں ہم شعر و سخن، رقص و موسیقی اور صورت گری کہتے ہیں کہ اب تو یہ بھی اشیائے فروختنی میں شامل ہو چکے ہیں اور اس دردناک ماحول میں لازمی طور پر ہم اہل فن بھی بیچے اور خریدے جاتے ہیں۔ برسوں پہلے میں نے اسی المناکی کا نوحہ لکھا تھا

ہم ہیں متاع کوچہ وبازار کی طرح　　اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

جب کہ آج کے ہندوستان میں تو اس زبان ہی کے لالے پڑگئے ہیں جسے ہم اردو کہتے ہیں اور جس مظلوم زبان کا میں شاعر ہوں۔ ابھی جس کو میں نے نوحہ کہا یہ شعر غزل کا ہے کہ میرا فن غزل ہی ہے، ''ترقی پسند غزل۔'' اس کی واضح ابتدا میں نے ۱۹۴۵ء میں کی جب سیاسی مضامین غزل والوں میں مقہور اور خود غزل ترقی پسندوں میں مردود قرار دی جاچکی تھی۔ اس تنہائی و بے بسی کے عالم میں بس ایک یقین میرا رہبر تھا کہ غزل میں اپنے عہد کے کس موضوع کو کب خوبی سے بیان نہیں کیا گیا جو آج نہیں بیان کیا جاسکتا۔ ہاں وہ حرف برہنہ، جو نظم کا امتیاز اس دور کے ترقی پسندوں میں سمجھا جاتا تھا، غزل اتنی تنگی کبھی نہیں رہی کہ اس کی بنیاد ہی رمز و کنائے پر ہے۔ اشاریت ہی تو اس کا ملبوس ہے چنانچہ میری غزل کے بعض وہ اشعار جو نعرہ زنی کی حد میں آجاتے ہیں محمود نہیں گردانے گئے بلکہ میرے ساتھ ستم ہی یہ ہوا کہ میری پوری غزل کو انھیں بعض عیوب سے منسوب کر کے بڑے بڑے چھوٹ بھیّے بھی جو ہاتھ میں آیا لے کر میدان میں آگئے اور تب سے یہ سنگ باری آج تک جاری ہے۔ میری خوبیوں کو نظر انداز کر کے صرف چند خامیوں کو میرا معیار فن ٹھہرایا گیا، گو اس ہنگامہ دار و گیر کے باوجود میرا یقین ایک لمحے کو بھی متزلزل نہیں ہوا اور

میں نے اور میرے ساتھیوں نے ترقی پسند غزل کو ایک تازہ روایت کی حیثیت دے کر ہی دم لیا۔ البتہ رہی میری کم گوئی تو شاید یہ یاروں کی کم نگہی و سرد مہری کا ردعمل ہو۔ یہ تو درست ہے کہ میری پشت پر کوئی دستِ شفقت کبھی نہیں رہا، مجھے زندہ رکھا تو میرے غیر جانب دار سننے اور پڑھنے والوں نے، خواہ وہ کسی طبقے سے ہوں۔ میری غزل کو کسی صنفِ سخن سے کمتر نہیں جانا۔ میرے کتنے ہی اشعار آج اردو دنیا والوں کی تحریروں میں دیکھے اور ان کی زبانوں میں سنے جا سکتے ہیں البتہ وقت کی یہ ستم ظریفی ضرور رہی کہ ان میں سے کئی اشعار دوسروں کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ میری تراشیدہ تراکیب لفظی کو دوسروں کا مال سمجھا جاتا ہے چنانچہ اہلِ نظر کی بے بصری کا علاج میرے پاس اس کے سوا اور نہ رہا کہ میں آپ اپنی ملکیت کا اعلان کروں مگر میرے اس مجبور رویے کو خود ستائی سے تعبیر کیا جانے لگا تو میں نے اس محاذ پر خاموشی اختیار کر لی، گویا چپ رہوں تو مغضوب اور کچھ بولوں تو مغضوب:

کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

اب رہا نفسِ غزل کی اپنی حیثیت اور میری محبوبہ بننے کا سوال تو بزرگوں نے تو کمالِ فن اسی کو تسلیم کیا ہے کہ خوبی کے ساتھ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی بیان کر دیے جائیں چنانچہ اس معیار پر اصنافِ سخن کو پرکھا جائے تو بڑی زیادتی ہوگی اگر غزل کو ملکۂ سخن نہ تسلیم کیا جائے۔

میرے بہت ہی عزیز سید محمد مہدی علی گڑھ کا یہ مشورہ درست ہے کہ جب میرا مجموعۂ کلام نئی غزلوں کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوا اسے ۱۹۵۶ء ہی کا شائع شدہ سمجھا گیا کیونکہ میں نے ہمیشہ اپنے مجموعے کا نام "غزل" ہی رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر نئے ایڈیشن کو پڑھنے والے وہی سنہ ۱۹۵۶ء کا پرانا ایڈیشن سمجھتے رہے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اس بار مجموعے کا نام "غزل" کے بجائے کوئی اور مثلاً "مشعلِ جاں" رکھ دیا جائے۔ میری تہہ داری نے حق تلفیوں کا زہر اس قدر پیا ہے کہ کوئی سمجھے نہ سمجھے ملا واحدی کے اس شعر کے بغیر یہ گفتگو ختم نہیں ہوتی

موجِ آں دود کہ امسال بہ ہمسایہ رسید　　　　زآتشے ہست کہ در خانۂ من پار گرفت

صید عزیزاں
مجروح
۲؍ اپریل ۱۹۹۱ء، بمبئی

کلام

مجروح سلطان پوری

○

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمے میں آگئی
وہی لب نہ میں جنہیں چھو سکا قدحِ شراب میں ڈھل گئے

وہی آستاں ہے وہی جبیں وہی اشک ہے وہی آستیں
دلِ زار تو بھی بدل کہیں کہ جہاں کے طور بدل گئے

تجھے چشم مست پتہ بھی ہے کہ شباب گرمیِ بزم ہے
تجھے چشمِ مست خبر بھی ہے کہ سب آبگینے پگھل گئے

انہیں کب کے راس بھی آچکے تری بزمِ ناز کے حادثے
اب اٹھے کہ تیری نظر پھرے جو گرے تھے گر کے سنبھل گئے

مرے کام آگئیں آخرش یہی کاوشیں یہی گردشیں
بڑھیں اس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے

۱۹۴۶ء

○

دستِ منعم مری محبت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سرِ بازار سہی

بول کچھ بول مقید لبِ اظہار سہی
سرِ منبر نہیں ممکن تو سرِ دار سہی

پھر بھی کہلاؤں گا آوارۂ گیسوئے بہار
میں ترا دامِ خزاں لاکھ گرفتار سہی

آنے دے باغ کے غدار مرا روزِ حساب
مانگے تنکا نہ ملے گا یہی گلزار سہی

جست کرتا ہوں تو لڑ جاتی ہے منزل سے نظر
حائلِ راہ کوئی اور بھی دیوار سہی

جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میں تو جب مانوں کہ بھر دے ساغرِ ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیرِ مغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

۱۹۴۸ء

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

مگر اے ہم قفس کہتی ہے شوریدہ سری اپنی
یہ رسمِ قید و زنداں ایک دیوارِ کہن تک ہے

کہاں بچ کر چلی اے فصلِ گل، مجھ آبلہ پا سے
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

میں کیا کیا جرعۂ خوں پی گیا پیمانۂ دل میں
بلا نوشی مری کیا اک مئے ساغر شکن تک ہے

نہ آخر کہہ سکا اس سے مرا حالِ دلِ سوزاں
مہِ تاباں کہ جو اس کا شریکِ انجمن تک ہے

نوا ہے جاوداں مجروحؔ جس میں روحِ ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

۱۹۵۱ء

(آرتھر روڈ جیل، بمبئی)

اہلِ طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو، بھنور کو چشمِ جانانہ کہیں

دار پر چڑھ کر لگائیں نعرۂ زلفِ صنم
سب ہمیں باہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں

یارِ نکتہ داں کدھر ہے؟ پھر چلیں اُس کے حضور
زندگی کو دل کہیں اور دل کو نذرانہ کہیں

تھامیں اُس بُت کی کلائی اور کہیں اس کو جُنوں
چوم لیں مُنہ اور اسے اندازِ رندانہ کہیں

سُرخی مے کم تھی میں نے چھو لیے ساقی کے ہونٹ
سَر جھکا ہے، جو بھی اب اربابِ میخانہ کہیں

تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہیے میکدہ
لب ہی لب ہم نے تو دیکھے کس کو پیمانہ کہیں

پارۂ دل ہے وطن کی سرزمیں مشکل یہ ہے
شہر کو ویراں کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں

اے رُخِ زیبا بتادے اور ابھی ہم کب تلک
تیرگی کو شمع، تنہائی کو پروانہ کہیں

آرزو ہی رہ گئی مجروحؔ کہتے ہم کبھی
اِک غزل ایسی جسے تصویرِ جانانہ کہیں

۱۹۵۸ء

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صِفات، چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے سات چلے

دیارِ شام نہیں، منزلِ سحر بھی نہیں
عجب نگر ہے یہاں دِن چلے نہ رات چلے

ہمارے لب نہ سہی وہ دہانِ زخم سہی!
وہیں پہنچتی ہے یارو کہیں سے بات چلے

سُتونِ دار پہ رکھتے چلو سَروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

ہُوا اسیر کوئی ہمنوا تو دور تلک!
بپاسِ طرزِ نَوا ہم بھی ساتھ سات چلے

بچا کے لائے ہم اے یار پھر بھی نقدِ وفا
اگرچہ لٹتے ہوئے رہزنوں کے ہات چلے

پھر آئی فصل کہ مانندِ برگِ آوارہ
ہمارے نام گُلوں کے مُراسلات چلے

قطارِ شیشہ ہے یا کاروانِ ہم سفراں
خرامِ جام ہے یا جیسے کائنات چلے

بُلا ہی بیٹھے جب اہلِ حَرم تو اے مجروحؔ
بغل میں ہم بھی لیے اِک صنم کا ہات چلے

۱۹۶۲ء

○

مرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرمِ سفر نہ ہو
نہیں ہے مرا کوئی نقشِ پا جو چراغِ راہگذر نہ ہو
رخِ تیغ سے جو نہ ہو کبھی سحر ایسی کوئی نہیں مری
نہیں ایسی ایک بھی شام جو تہِ زلفِ دار بسر نہ ہو
مرے ہاتھ ہیں تو بنوں گا خود میں اب اپنا ساقیِ میکدہ
خمِ غیر سے تو خدا کرے لبِ جام بھی مرا تر نہ ہو
میں ہزار شکل بدل چکا چمنِ جہاں میں سن اے صبا
کہ جو پھول ہے ترے ہاتھ میں، یہ مرا ہی لختِ جگر نہ ہو
ترے پا زمیں پہ رکے رکے، ترا سر فلک پہ جھکا جھکا
کوئی تجھ سے بھی ہے عظیم تر یہی وہم تجھ کو مگر نہ ہو
شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

۱۹۵۱ء
(بائیکلہ جیل، بمبئی)

○

وہ جس پہ تمہیں شمعِ سرِ رہ کا گماں ہے
وہ شعلۂ آوارہ ہماری ہی زباں ہے
اب ہاتھ ہمارے ہے عناں رخشِ جنوں کی
اب سر پہ ہمارے گلۂ سنگِ بتاں ہے
بس پھیر کے منہ خار قدم کھینچ رہے تھے
دیکھا تو نہاں قافلہ، ہم سفراں ہے
چبھتے ہی بنی خار جفت پائے خزاں میں
کیا کیجیے بہت ہم کو غمِ لالہ رخاں ہے
کام آئے بہت لوگ سرِ مقتلِ ظلمات
اے روشنیِ کوچۂ دلدار کہاں ہے
اے فصلِ جنوں ہم کو پئے شغلِ گریباں
پیوند ہی کافی ہے اگر جامہ گراں ہے
مجروحؔ کہاں سے گہر گندم و جو لائیں،
اپنی تو گرہ میں یہی چشمِ نگراں ہے

۱۹۶۰ء

○

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اُٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
ہاتھ آگیا ہے دولتِ بیدار کی طرح

وہ تو کہیں ہے اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہِ یار کی طرح

سیدھی ہے راہِ شوق، پہ یونہی کہیں کہیں
خم ہو گئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں،
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

اب جاکے کچھ کھلا ہنرِ ناخنِ جنوں،
زخمِ جگر ہوئے لب و رخسار کی طرح

مجروحؔ لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

۱۹۶۳ء

○

سوئے مقتل کہ پئے سیرِ چمن جاتے ہیں
اہلِ دل جام بہ کف سر بہ کفن جاتے ہیں

آگئی فصلِ جنوں، کچھ تو کرو دیوانو
ابر صحرا کی طرف سایہ فگن جاتے ہیں

اُس کو دیکھا نہیں تم نے کہ یہی کوچہ و راہ
شاخِ گل شوخیِ رفتار سے بن جاتے ہیں

وہ اگر بات نہ پوچھے تو کریں کیا ہم بھی
آپ ہی روٹھتے ہیں آپ ہی مَن جاتے ہیں

بلبلو، اپنی نوا فیض ہے اُن آنکھوں کا
جن سے ہم سیکھنے اندازِ سخن جاتے ہیں

جو ٹھہرتی تو ذرا چلتے صبا کے ہمراہ
یوں بھی ہم روز کہاں سوئے چمن جاتے ہیں

کٹ گیا قافلۂ اہلِ جنوں بھی شاید
لوگ ہاتھوں میں لیے تارِ رسن جاتے ہیں

روک سکتا ہمیں زندانِ بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

۱۹۷۳ء

○

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو، ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک کیے ہیں ہم نے عزیزو، چار گریباں تم سے زیادہ

چاکِ جگر محتاجِ رفو ہے، آج تو دامن صرف لہو ہے
اِک موسم تھا ہم کو رہا ہے، شوقِ بہاراں تم سے زیادہ

عہد وفا یاروں سے نبھائیں نازِ حریفاں ہنس کے اُٹھائیں
جب ہمیں ارماں تم سے ہوا تھا اب ہیں پشیماں تم سے زیادہ

ہم بھی ہمیشہ قتل ہوئے اور تم نے بھی دیکھا دُور سے لیکن،
یہ نہ سمجھنا ہم کو ہوا ہے، جان کا نقصاں تم سے زیادہ

جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشنِ چراغاں تم سے زیادہ

دیکھ کے اُلجھن زُلفِ دو تا کی، کیسے اُلجھ پڑتے ہیں ہوا سے
ہم سے سیکھو، ہم کو ہے یارو، فکرِ نگاراں، تم سے زیادہ

زنجیر و دیوار ہی دیکھی تم نے تو مجروحؔ، مگر ہم
کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں، عالمِ زنداں تم سے زیادہ

۱۹۸۰ء

○

بنامِ کوچۂ دل دار گل برسے کہ سنگ آئے
ہنسا ہے چاک پیراہن نہ کیوں چہرے پہ رنگ آئے

بچاتے پھرتے آخر کب تلک دستِ عزیزاں سے
اُنہیں کو سونپ کر ہم تو کلاہِ نام و ننگ آئے

ہنسو مت اہلِ دل اپنی ہی جانو بزمِ خوباں میں
چلے آئے اِدھر ہم بھی بہت جب دل سے تنگ آئے

کہاں صحنِ چمن میں بات کوئے سر فروشاں کی
اِدھر سے سادہ رُو نکلے اُدھر سے لالہ رنگ آئے

کرو مجروحؔ تب دار و رسن کے تذکرے ہم سے
جب اُس قامت کے سائے میں تمہیں جینے کا ڈھنگ آئے

۱۶ر جون ۱۹۸۱ء

اس باغ میں وہ سنگ کے قابل کہا نہ جائے
جب تک کسی ثمر کو مرا دِل کہا نہ جائے

شاخوں پہ نوکِ تیغ سے کیا کیا کھلے ہیں پھول
اندازِ لالہ کاریِ قاتل کہا نہ جائے

کس کے لہو کے رنگ ہیں یہ خارِ شوخ رنگ
کیا گُل کتر گئی رہِ منزل کہا نہ جائے

باراں کے منتظر ہیں سمندر پہ تشنہ لب
احوالِ میزبانیِ ساحل کہا نہ جائے

میرے ہی سنگ و خشت سے تعمیرِ بام و در
میرے ہی گھر کو شہر میں شامل کہا نہ جائے

زنداں کھلا ہے جب سے ہوئے ہیں رہا اسیر
ہر گام ہے وہ شورِ سلاسل کہا نہ جائے

ہم اہلِ عشق میں نہیں حرفِ گنہ سے کم
وہ حرفِ شوق جو سرِ محفل کہا نہ جائے

جس ہاتھ میں ہے تیغِ جفا اس کا نام لو
مجروحؔ سے تو سائے کو قاتل کہا نہ جائے

۲ر نومبر ۱۹۸۱ء

خنجر کی طرح بوئے سمن تیز بہت ہے
موسم کی ہوا اب کے جنوں خیز بہت ہے

راس آئے تو ہے چھاؤں بہت برگ و شجر کی
ہاتھ آئے تو ہر شاخ ثمر ریز بہت ہے

لوگو مری گُل کاری وحشت کا صلہ کیا
دیوانے کو اِک حرفِ دِل آویز بہت ہے

مُنعم کی طرح پیرِ حرم پیتے ہیں وہ جام
رندوں کو بھی جس جام سے پرہیز بہت ہے

مصلوب ہوا کوئی سَرِ راہِ تمنا
آوازِ جرس پچھلے پہر تیز بہت ہے

مجروحؔ سُنے کون تری تلخ نوائی
گفتارِ عزیزاں شکر آمیز بہت ہے

۳ر فروری ۱۹۷۶ء

○

مجھ سے کہا جبریل جنوں نے یہ بھی وحیِ الٰہی ہے
مذہب تو بس مذہبِ دل ہے باقی سب گمراہی ہے
وہ جو ہوئے فردوس بدر تقصیر تھی وہ آدم کی مگر
میرا عذاب دربدری میری ناکردہ گناہی ہے
حرفِ طلب سینے میں کچل دو شرطِ وفا ٹھہری ہے یہی
کاٹ کے رکھ دو اپنی زبان فرمان ظلِ الٰہی ہے
سنگ تو کوئی بڑھ کے اٹھاؤ شاخِ ثمر کچھ دور نہیں
جس کو بلندی سمجھے ہو، ان ہاتھوں کی کوتاہی ہے
پھر کوئی منظر، پھر وہی گردش کیا کیجئے اے کوئے نگار
میرے لیے زنجیرِ گلو میری آوارہ نگاہی ہے
دورسے اس کو چاکِ ملامت جان کے ناصح خوش بہت ہیں
لیکن میرے گریباں پر تو اُس کاجل کی سیاہی ہے
بہرِ خدا خاموش رہو بس دیکھتے جاؤ اہلِ نظر
کیا لغزیدہ قدم ہیں اُس کے کیا دزدیدہ نگاہی ہے
دید کے قابل ہے تو سہی مجروحؔ تری مستانہ روی
گرد ہوا ہے رختِ سفر رستے کا شجر ہمراہی ہے

مارچ ۱۹۸۸ء

لتا منگیشکر کے نام

مجھ سے چلتا ہے سرِ بزمِ سخن کا جادو
چاند لفظوں کے نکلتے ہیں میرے سینے سے
میں دکھاتا ہوں خیالات کے چہرے سب کو
صورتیں آتی ہیں باہر مرے آئینے سے

ہاں مگر آج مرے طرزِ بیاں کا یہ حال
اجنبی کوئی کسی بزمِ سخن میں جیسے
وہ خیالوں کے صنم اور وہ الفاظ کے چاند
بے وطن ہوگئے اپنے ہی وطن میں جیسے

پھر بھی کیا کم ہے جہاں رنگ نہ خوشبو ہے کوئی
تیرے ہونٹوں سے مہک جاتے ہیں افکار مرے
میرے لفظوں کو جو چھو لیتی ہے آواز تری
سرحدیں توڑ کے اڑ جاتے ہیں اشعار مرے

تجھ کو معلوم نہیں یا تجھے معلوم بھی ہو
وہ سیہ بخت جنہیں غم نے ستایا برسوں
ایک لمحے کو جو سُن لیتے ہیں نغمہ تیرا
پھر اُنہیں رہتی ہے جینے کی تمنا برسوں

جس گھڑی ڈوب کے آہنگ میں تو گاتی ہے
آیتیں پڑھتی ہے سازوں کی صدا تیرے لیے
دم بدم خیر مناتے ہیں تری چنگ و رباب
سینۂ نے سے نکلتی ہے دُعا تیرے لیے

نغمہ و ساز کے زیور سے رہے تیرا سنگار
ہو تیری مانگ میں تیرے ہی سروں کی افشاں
تیری تانوں سے تری آنکھ میں کاجل کی لکیر
ہاتھ میں تیرے ہی گیتوں کی حنا ہو رخشاں

قلم

جس فارسی شعر پر اس نظم کی بنیاد ہے، اس کے لیے اُردو میں اگر دو چار قافیے ہیں بھی تو انتہائی مجہول قسم کے اس لیے مثلث ٹیپ کے مصرعوں میں "م" کا التزام کافی سمجھتا ہوں۔ (مجروح)

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

یہ سازِ اوّلیں دستِ اَزل کا
یہ کاتب عشق کی پہلی غزل کا
نگارِ علم کا پہلا یہ محرم

در و بامِ حرم پیدا اسی سے
جمالِ بُت جہاں آرا اسی سے
اِسی کا جلوۂ نقش ابن حریم

زبان دی اس نے برگِ بے زباں کو
لبِ گفتار سنگ و استخواں کو
لکیروں کو ادائے رقص پیہم
بنادے حرف یہ وقتِ رواں کو
ورق پر نقش کردے رفتگاں کو
قلم کرتا ہے کارِ اسمِ اعظم

یہی تو شمع ہے بزمِ جہاں میں
یہی چوبِ جرس ہر کارواں میں
یہی جادہ بہ منزل گاہِ عالم

خمِ حرف اِس کا محرابِ ہنر ہے
سیاہی سُرمہ اہلِ نظر ہے
جو نقطہ ہے وہ خالِ روئے آدم

اگر دستِ سعادت میں ہے مامون
نمو کرتا ہے مثلِ شاخِ زیتون
بیاضِ شعلہ پہ لکھتا ہے شبنم

یہ اِنسان جو امیرِ بحر و بر ہے
قلم لے لو تو پَل میں جانور ہے
کسی بن میں کہیں کرتا پھرے رم

یہ نکتہ سر براہوں کو بتاؤ
یہ مصرعہ کج کلاہوں کو سناؤ

قلم شمشیر پر بھی ہے مقدم

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم قلم کش رابدولت می رسانم
مگر اہلِ قلم کی خود یہ توقیر
جسے دیکھو وہی عبرت کی تصویر
کرے تاریخ بھی کس کس کا ماتم

فلاطون و ارسطو شیخ و رازی
خرد نے جن سے پائی سرفرازی
سر اُن کے بھی کسی دربار میں خم

وہ فردوسی و سعدی ہوں کہ خسرو
بہت دیکھی ہے ان کی بھی قلمرو
خود آوارہ، بساطِ رزق درہم
جناب میر و سودا مثل غالب
رہے نان شبینہ ہی کے طالب
سبھی کے ہاتھ اِک لقمہ رہا کم

نشانِ عہد حاضر جوش و اقبال
نہ بدلا ان کی صبح و شام کا حال
قلم ان کے بدل دیتے تھے موسم

غرض ارباب دانش اے خداوند
کہاں تک جنس بازاری کے مانند
قلم کو بیچ کر کھاتے رہیں غم

گئی شاہی تو اب ہے زخم خواری
ہماری چارہ جو، سرمایہ داری
لہو لیتی ہے تب دیتی ہے مرہم

قلم کو کہیے کیا اس دستِ بد میں
عصائے خضر ہے گویا لحد میں
کہ افعی ہے کفِ وحشی میں برہم

کہاں صنعت میں اس پُر فن کی تمثیل
قلم ہی میں قلم کی گاڑ کر کیل
بناتی ہے صلیب ابنِ آدم

نہ پہچانا جو داغ اپنے لہو کا
نہیں کھینچا جو دامن فتنہ جو کا
تو پھر کیا ہے علاج چشم پر نم

x-x-x

میرا سفر
"ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ایم"
(رومیؔ)
پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیئے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگِ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہہ میں
کلیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح سے ہنستی ہوئی
گوشۂ
علی
سردار
جعفری

ساری شکلیں کھو جائیں گی
خوں کی گردش، دل کی دھڑکن
سب راگنیاں سو جائیں گی
اور نیلی فضا کی مخمل پر
ہنستی ہوئی ہیرے کی یہ کنی
یہ میری جنت، میری زمیں
اس کی صبحیں، اس کی شامیں
بے جانے ہوئے، بے سمجھے ہوئے
اک مشتِ غبارِ انساں پر
شبنم کی طرح رو جائیں گی
ہر چیز بھلا دی جائے گی
یادوں کے حسین بت خانے سے
ہر چیز اٹھا دی جائے گی
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا
سردار کہاں ہے محفل میں

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی، کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سرسبز ہتھیلی پر لے کر
شبنم کے قطرے تولوں گا
میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا
رُخسارِ عروسِ نَو کی طرح
ہر آنچل سے چھن جاؤں گا
جاڑوں کی ہوائیں دامن میں
جب فصلِ خزاں کو لائیں گی
سوکھے ہوئے پتوں سے میرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروفِ سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صُراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مَر کے امر ہو جاتا ہوں
●●

پروفیسر محمد حسن

ایسا کہاں لاؤں کہ تجھ سے کہیں جسے

علی سردار جعفری کو آخری سلام

سردار جعفری سے ملاقات تو بہت بعد میں ہوئی مگر نام بہت پہلے سن رکھا تھا۔ 1937ء میں جب پہلی بار بعض صوبوں میں کانگریس کا راج قائم ہوا تو اتر پردیش میں بھی کانگریس کی حکومت قائم ہوئی اسی زمانے میں اردو کی تین کتابوں پر ڈھائی سو یا پانچ سو روپے کے انعامات ملے۔ اسرار الحق مجاز کا مجموعہ کلام آہنگ علی سردار جعفری کا افسانوں کا مجموعہ اور سید سبط حسن کی تاریخ سے متعلق کوئی کتاب کا نام یاد نہیں۔ تینوں دوستوں نے انعام کی یہ رقم جمع کر کے رسالہ "نیا ادب" نکالنے کا ارادہ کیا۔ سید حسن ظہیر کا ایک مکان حضرت گنج کے نواح میں خالی پڑا تھا وہاں دفتر قائم ہو گیا اور رسالہ اس مفلوک الحالی کی حالت میں نکلنے لگا۔ حیات اللہ انصاری کانگریس کے اردو اخبار "ہندوستان" کے مدیر تھے جس میں ڈاکٹر محمد اشرف کے مضامین قسط وار چھپا کرتے تھے۔

میری ملاقات نہ سردار جعفری سے تھی نہ "نیا ادب" سے البتہ ان دونوں کے نام سنا کرتا تھا پھر جب 1942ء لکھنؤ یونیورسٹی کے بی اے میں داخلہ لیا تب قریب سے تو نہیں دور سے ان دونوں سے واقفیت ہوئی۔

سردار سے میری ملاقات تو بہت بعد کو ہوئی مگر غائبانہ ملاقات البتہ خاصی تفصیلی ہو گئی۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں دستور یہ تھا کہ ایک سال مسلمان امیدوار یونین کا صدر ہوتا تھا اور اس سال سکریٹری ہندو ہوتا تھا اس کے بعد دوسرے سال ہندو صدر اور مسلمان امیدوار سکریٹری منتخب ہوتا تھا۔ سردار جعفری نے جس سال لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا یعنی داخلہ

پتہ: D-7 ماڈل ٹاؤن، دہلی۔ 110009

خدجہ

لینے کے چند ماہ بعد ہی صدارت کے امیدوار ہوئے۔ مقابل تھے لکھنؤ یونیورسٹی کے پرانے طالب علم علی جواد زیدی اور حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ نووارد سردار جعفری منتخب ہوئے۔

علی سردار جعفری علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے تھے۔ وہیں پہلی بار اسرالحق مجازؔ کی ملاقات علی سردار جعفری سے ٹینس کورٹ میں ہو گئی تھی جہاں دونوں ٹینس کھیلنے جایا کرتے تھے دونوں میں کوئی بھی ان دنو ادبی دنیا میں مشہور نہیں ہوا تھا مگر یہ دوستی ادبی شہرت مل جانے کے بعد بھی قائم رہی۔

علی گڑھ کی یادوں میں فلک نما کوٹھی کی یادیں بھی تھی جہاں سلطانہ رہتی تھیں جن سے سردار نے شادی کی اور جنھیں اپنی نظم "میرا سفر" کے ایک مصرعہ میں اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

ہر عاشق ہے سردار یہاں ہر معشوقہ سلطانہ ہے علی گڑھ میں سردار جعفری کا زمانہ خاصہ طوفانی زمانہ تھا۔ دراصل اس زمانے میں علی گڑھ بڑے انقلابی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ وہاں ڈاکٹر علیم بھی تھے اور پروفیسر حبیب بھی۔ خواجہ منظور حسین بھی تھے اور شبیہہ الدین لائبرین بھی یک طرف خاکساروں کے لیڈر بھی اسٹاف میں شامل تھے اور دوسری طرف ڈاکٹر ضیاء الدین جیسے لوگ بھی تھے مگر علی گڑھ میں سردار جعفری کی اس دور کی سرگرمیوں کی تفصیلات معلوم نہیں البتہ وہاں سے نکلے تو ان پر مارکسزم اور کمیونزم کے اثرات غالب تھے اور ان دونوں سے بڑھ کر قوم پرستانہ خیالات تھے جو ملک کو آزاد دیکھنے اور ہر قسم کی طبقاتی اور دقیانوسی ظلم و ستم سے محفوظ دیکھنے کی خواہش سے عبارت تھے۔

اس زمانے میں ایک عجیب حادثہ ہوا۔ سرمارس گائران دنوں ہندوستانی کی عدالت عالیہ کے جج تھے اور بعد میں دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی مقرر ہو گئے تھے۔ انہونے باغیانہ سرگرمیوں کے الزام میں متیم الدین فاروقی کو دہلی یونیورسٹی سے نکال دیا کیوں کہ انھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف سخت تقریر کی تھی اس پر قوم پرست طلبا نے ہڑتال کی اور ان پر لاٹھا چارج ہوا۔

علی سردار جعفری ان دنوں لکھنؤ آ گئے۔ سرمارس گائر غالباً لکھنؤ یونیورسٹی کا کانووکیشن ایڈریس پڑھنے کے لیے لکھنؤ آئے تو سردار جعفری کی سربراہی میں ان کے خلاف مظاہر کیا گیا، لاٹھی چارج ہوا اور سردار کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

جب اتر پردیش میں کانگریس کی حکومت قائم ہوئی اور "نیا ادب" نکلنے لگا تو سردار جعفری نے سبط حسن اور مجاز سے مل کر اس رسالے کے ذریعے قدامت پرستی اور بیرونی حکومت کے خلاف آزادی کی آواز اٹھائی۔ یہ مہم ہر قسم کی قدامت پسندی کے خلاف تھی۔ ''انگارے'' نام سے افسانوں کا جو انتخاب چھپا تھا وہ ضبط ہو چکا تھا اور اسے فحش قرار دیا گیا تھا۔ ''انگارے'' کی اسی روایت آزادئ تحریر و تقریر کو "نیا ادب" نے اپنا منشور بنا رکھا تھا۔

"نیا ادب" نے اردو ادب میں نیا رجحان پیدا کیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ترقی پسندی کی طرح میلان عام کیا۔ تھوڑے دنوں بعد جوش ملیح آبادی کا رسالہ 'کلیم' بھی اس میں شامل کر لیا گیا اور ان کا نام "نیا ادب" اور "کلیم" قرار پایا۔ رسالے کے شمارے خاصی بے ترتیبی سے نکلے۔ مالی دشواریاں بھی تھیں، جن سے بعض کا ذکر سردار جعفری نے 'لکھنؤ کی پانچ راتیں' میں کیا ہے۔ خاص طور پر وہ واقعہ جب یہ لوگ کسی دوست کے ہاں 'نیا ادب' کا زر سالانہ وصول کرنے گئے تھے اور انہوں نے جو کرنسی نوٹ دیا اس کی نقدی بھی ان تینوں دوستوں کے پاس نہ تھی یا کسی طرح ایک انگیزی (امریکی) سپاہی اپنے کتے کا نام نپولین رکھ کر اسے مے فیئر سینما لکھنؤ کے سامنے اس کا نام سے اسے پکار رہا تھا۔ ان تینوں کی قومی غیرت جوش میں آئی اور انھوں نے ایک بازاری کتے کو نیلسن نام دے کر پکارنا اور چمکارنا شروع کیا۔ اس پر اس انگیریز یا امریکی سپاہی کو غصہ آگیا اور نوبت مار پیٹ تک پہنچی۔ اتفاق سے ان دوستوں کے ساتھ ایک کشمیری چک نامی 'پائنیر' کے سب ایڈیٹر تھے وہ تنومند تھے اور انھوں نے اس انگریز یا امریکی کی پٹائی کر دی۔

سردار جعفری کے بیان کے مطابق مجاز اس دوران ناچ ناچ کر ''بول اری او دھرتی بول'' گیت کے بول دہرانے لگے۔

اسی رسالہ 'نیا ادب' کے ایک شمارے میں محمد حسن عسکری کا افسانہ 'پھسلن' چھپا تھا جو بعض لوگوں کے بیان کے مطابق فراق صاحب سے حسن عسکری کے ذاتی تعلقات کا افسانہ ہے مگر اس افسانے کو فحش قرار دیا گیا۔ نیا ادب ہی پر منحصر نہیں اس دور کے نئے ادب میں ترقی پسندی اور عریاں نگاری کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں تھی۔ حد یہ ہے کہ 'انگارے' میں بھی سجاد ظہیر اور احمد علی تک افسانوں میں عریانی بھی موجود ہے اور اس زمانے کے معیار کے برخلاف مذہبی اور سماجی اعتبار سے قابل اعتراض تھا۔

'نیا ادب' جلد ہی بند ہو گیا اور سردار جعفری جیل کے پہلے تجربے کے بعد سیاست کی

طرف زیادہ متوجہ ہو گئے۔ ان کی شاعری میں بھی یہی ہنگامی لہجہ در آیا۔ آخر کار 1942ء میں کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی ہٹی اور پارٹی کا باقاعدہ دفتر ممبئی میں قائم ہوا اور اس کا اخبار 'قومی جنگ' شائع ہونے لگا تو سردار جعفری بھی بمبئی پہنچے اور پارٹی میں کل وقتی کارکن ہو گئے۔ 'قومی جنگ' (اردو) کی ادارت میں بھی سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف کے ساتھ شامل ہوئے اور پارٹی کی ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں بھی شریک ہو گئے۔ اسی زمانے میں انڈین پیپلز تھیٹرز کی تحریک شروع ہوئی اور اس کے لیے بھی سردار جعفری نے کئی گیت اور ڈرامے لکھے۔ بعد کو 1947ء کے لگ بھگ 'یہ کس کا خون ہے' نام کا ڈراما بھی خواجہ احمد عباس کے ساتھ مل کر لکھا۔

پھر کمیونسٹ پارٹی کی سیاست نے ایک نئی کرٹ لی۔ 1946ء میں ہندوستانی بحریے کی بغاوت ہوئی اور اس بغاوت کی کمیونسٹ پارٹی نے بھرپور حمایت کی۔ اس پر نظمیں سردار جعفری نے بھی لکھیں اور اسے انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیا۔ یہ صحیح بھی تھا کیوں کہ انگریز حکومت نے اسے خطرے کی گھنٹی سمجھ کر ہندوستان کو آزاد کرنے کی ٹھان لی اور آخر کار لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 1947ء میں تقسیم ہندوستان کا منصوبہ بنایا۔ ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان وجود میں آ گیا۔ فسادات اور لاکھوں آدمی ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر ہو گئے۔

اسی زمانے میں کمیونسٹ پارٹی نے انقلابی حکمت عملی اپنائی اور 1948ء میں پارٹی نے انقلاب کا نعرہ دیا تلنگانہ اور شمھاگا کی تحریکیں شروع ہوئیں ملک بھر میں طویل ہڑتال کا نعرہ دیا گیا مگر ہڑتال کہیں نہیں ہوئی۔ سردار پٹیل وزیر داخلہ تھے۔ انھوں نے پارٹی پر پھر پابندی لگا دی اور اسی دوران سردار جعفری پھر جیل چلے گئے۔ البتہ اسی زمانے میں پارٹی کے ایک خفیہ سرکلر میں سردار جعفری کے جیل میں اسٹاف سے دوستی بڑھانے اور مراعات حاصل کرنے کے الزام میں پارٹی سے نکالے جانے کی اطلاع بھی ملی۔

تحریک ختم ہو گئی مگر سردار جعفری کی شاعری کا رنگ نہیں بدلا۔ ان کی شاعری کا رنگ خالص ہنگامی تھا ان کی نظموں میں نعرہ بازی کی گونج تھی ایک مضمون کو روگنگ سے باندھنے کا انداز تھا، تقریر کا لب وہ لہجہ تھا اور یہی لب وہ لہجہ سردار جعفری کی شاعری کے ذریعہ وقت کا ستور بنا جا رہا تھا۔ سردار کو بھی اس کا احساس تھا چنانچہ اس سے الگ جو دوسرے شعری لہجے رائج تھے ان کی سخت تنقید سردار نے رسالہ 'شاہراہ' دہلی کے مختلف مضامین میں کی۔ پہلا مضمون جذبی کے نام ایک خط کی شکل میں تھا جس میں اعتراض کیا گیا ہے کہ عمومی

لہجے میں شاعری غلط فہمی پیدا کر سکتی ہے شاعری میں وضاحت ضروری ہے۔ جذبی نظم 'نیا سورج' میں تمثیل کے ذریعہ آزادی پر تبصرہ تھا یہی اعتراض سردار نے بعد میں تمثیل کے ذریعہ آزادی پر تبصرہ تھا یہی اعتراض سردار نے بعد میں فیض کی نظم 'یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر' پر بھی کیا کہ یہی بات تو قدامت پسند جن سنگھی بھی کہہ سکتا ہے۔ فراق صاحب کا ایک مضمون 'شاہراہ' میں چھپا تھا اس کی مخالفت میں سردار نے 'یہ ترقی پسندی نہیں ہے' کے عنوان سے جوابی مضمون لکھا۔ غرض جلد ہی سردار کی شعری ہی نہیں فکری جہت بھی متعین ہو گئی۔ اور یہ جہت تھی براہ راست ہنگامی شاعری کی جہت۔ اس کے لیے سردار نے نظم کو راشد، میراجی کی گرفت سے آزاد کر کے نئی معنوی جہت بخشی تھی اور ان کی طویل نظموں میں تکرار کے باوجود تقریر کا سا انداز تھا۔ یہ دور تھا بھی نظم کا دور اور کم سے کم ہندوستان میں نظم کا اسلوب طے کرنے میں سردار جعفری کی شاعری کا ایک اہم مرتبہ تھا۔

'نئی دنیا کو سلام' گو 1946ء کے لگ بھگ چھپی تھی مگر اس میں بھی آزاد نظم کے ٹکڑوں سے براہ راست خطیبانہ انداز بیان اختیار کیا گیا تھا اسی رنگ سخن کو سردار نے 'پتھر کی دیوار' اور 'خون کی لکیر' میں اور آگے بڑھایا اور اس میں شک نہیں کہ یہی رنگ سخن کم سے کم ہندوستان میں عام ہو گیا۔ غزل کی طرف شعرا کی توجہ کم ہونے لگی حد یہ ہے کہ جگر مرادآبادی جیسے ٹھیٹھ غزل گو شاعر بھی یا تو نظم نما غزلیں کہنے لگے یا پھر براہ راست 'ساقی سے خطاب' جیسی نظم ہی کہنے لگے۔

غرض یہ دور کم و بیش سردار کا دور کہا جا سکتا ہے اسی دور میں وہ شاعری کی طرف تیزی سے رجوع ہوئے اور ان کی شعریت سے تقریباً محروم نظموں کو کسی قدر مقبولیت بھی ملی مگر ان کا لہجہ اور اسلوب دونوں ہنگامی تھے اور

ایک طرف گورکی ایک طرف ایلیٹ

جیسے مصرعے جلد ہی سپاٹ گردانے جانے لگے۔

سردار جعفری اس منزل پر بھی تھک ہار کر بیٹھ جانے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اسی زمانے میں 'ترقی پسند ادب' نام کی کتاب لکھی جو اس دور کی ترقی پسند کو تقریباً سبھی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ احتشام حسین، ممتاز حسین اور ان دونوں سے بڑھ چڑھ کر خود سجاد ظہیر اور مجنوں گورکھپوری نے کبھی ترقی پسند تحریک پر

کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی۔ سجاد ظہیر نے 'روشنائی' لکھی بھی تو محض تحریک کے تنظیمی پہلو کو پیشِ نظر رکھا اور باقی باتیں ضمنی طور پر تھیں ہاں عزیز احمد نے ترقی پسند ادب کے نظریے اور تحریک پر پہلی مستقل کتاب لکھی تھی اور آج بھی اس تحریک پر کسی جائزے کو منصفانہ اور غیر جانبدارانہ کہا جا سکتا ہے تو عزیز احمد ہی کی کتاب ہے۔ سردار جعفری نے تمام ترقی پسند نقادوں کے برعکس ترقی پسندی کا خاصہ سخت گیر رویہ اپنایا۔ حد یہ ہے کہ پریم چند، راشد اور سعادت حسن منٹو بھی ان کی ضربِ کلیمی سے نہ بچے بعد کو سردار خود بھی شاید اتنے شدت پسند نہیں رہے تھے جو اقبال سے ان کی غیر معمولی عقیدت سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس زمانے کے قصے، حکایتیں اور واقعات تو بے شمار ہیں مگر ان سب سے قطع نظر کرنا واجب ہے۔ آخر ہوا یہ کہ سردار کمیونسٹ پارٹی سے ستو باہر آ گئے مگر نہرو پر نظمیں اور حکومت ہند کی خارجہ حکمت عملی کی ستائش ان کی شاعری میں جگہ پانے لگی۔ ریڈیو اسٹیشن پر ان کے کلام کے نشر نہ ہونے پر پابندی بھی ہٹی بلکہ وہ اس کے اعزازی مشیر قرار دیے گئے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان 1965ء کی لڑائی تاشقند معاہدے پر ختم ہوئی تو سردار نے جنگ کی حمایت میں بھی نظمیں لکھیں اور جب تاشقند کا سمجھوتہ ہوا تو اس پر اپنی معرکۃ الآرا نظم لکھی جس کا کیسٹ حال ہی میں بھارتیہ جنتا پارٹی والے وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی نواز شریف سے ملاقات کرتے وقت پاکستان لے گئے تھے۔

اسی دوران سردار جعفری نے اپنی سرگرمیاں مختلف شعبوں میں بہت تیز کر دیں۔ اول تو ایک صنعت کار اور ادب نواز دوست شیام کرشن نگم کے تعاون سے ہندوستانی ٹرسٹ بمبئی میں قائم ہوا اور اردو کی مختلف اصناف کے انتخابات شائع ہونے لگے دوسرے غالب، کبیر اور میرابائی کے کلام کا انتخابات اردو ہندی رسم الخط میں شائع ہوا جسے سردار نے مرتب کیا تھا۔ تیسرے سہ ماہی رسالہ 'گفتگو' کا آغاز ہوا جو خاصہ ضخیم رسالہ تھا اور ہر قسم کے ادبی مال مسالے سے مالا مال تھا یہی دور جدیدیت کے عروج اور ترقی پسندی پر ان کے بڑھتے ہوئے حملوں کا زمانہ بھی تھا مگر 'گفتگو' نے خاصہ بین بین کا رویہ اختیار کیا۔ چوتھے سردار نے فلم سازی بھی شروع کر دی اور 'گیارہ ہزار لڑکیاں' نام کی فلم بنائی جو چلی نہیں۔ کچھ ہی سال بعد اپنے معاصر اردو شاعروں پر ٹیلی ویژن پر کئی قسطوں میں ایک سلسلہ بھی پیش کیا۔

اور اسی کے ساتھ ان کی شاعری اور ان کی فکر کا سفر بھی جاری رہا۔ شاعر کی حیثیت

سے انھوں نے کئی بین الاقوامی مذاکروں میں شرکت کی اور ایک زمانہ وہ بھی تھا جو دنیا کے انقلابی فن کاروں میں ایلیا ایرن برگ، لوئی اراگاں اور پبلو نرودا کے ساتھ سردار جعفری کا نام بھی لیا جاتا تھا۔ پھر وہ دور بھی آیا کہ سردار نے قاہرہ کے کسی قہوہ خانے میں اپنی مشہور اور نہایت مسجع نظم 'تین شرابی' سنائی اور در و دیوار جھوم اٹھے۔ پھر پبلو نرودا ہی کی ایک نظم سے متاثر ہو کر ان کی نظم 'میرا سفر' لکھی گئی جو بعض اضافے اور ترمیموں کے باوجود نرودا کی نظم ہی کا چربہ تھی مگر اردو میں بے حد مقبول ہوئی۔ آج بھی ذاتی طور پر میرے لیے سردار جعفری غزل کے تین اشعار اور تین نظموں کے شاعر ہیں جن میں بلا شبہ 'تین شرابی' اور 'میرا سفر' نظمیں شامل ہیں اور غزل کے وہ تین شعر جن میں وہ بے پناہ مصرعہ بھی ہے (جس نظم کی نشان وہی باقی رہ گئی ہے اس کی نشان وہی کیا ضرور ہے۔)

راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا

جی ہاں! راستے سب بند تھے تو اب انقلاب کے بجائے اعزاز و اکرام کی طرف متوجہ ہونے کا بھی وقت آ گیا تھا اور انقلابی رویے کی تبدیلی کا اظہار 'ایک خواب' اور مجموعے کے چند سطری دیباچے اور خود اس نظم کے لہجے اور نفس مضمون سے ہو جاتا ہے اور آخر تک انھوں نے یہی رنگ نبھایا۔ یعنی سیاسی حزب مخالف سے گریز اور ارباب اقتدار کو 'قومی' لیڈر شپ کی حمایت۔

پھر انعامات اور مشاعروں کے سلسلے تھے۔ انھیں جب بھی کوئی بڑا انعام ملا مبارک باد کے چند جملوں کے خط میں یہ شعر ضرور لکھا:

ترے جواہر طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

یعنی خوش قسمتی تو لعل و گہر کی ہے کہ وہ تیری کلاہ تک جا پہنچے ہیں اور کیا کیا اور کیسے کیسے انعام اور کیسے کیسے لوگوں کے ہاتھ سے انعام ملے۔ سردار ہی کا ظرف تھا کہ ان سب کو قبولیت ملی۔

مشاعروں میں بھی سردار نے اکثر اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ ان کے لہجے میں ایک منفرد قسم کی دلکشی تھی جو مصرعے اور اشعار تو کیا نثر کے جملوں میں زندگی پیدا کر دیتی تھی۔ نہ جانے کس کا مصرعہ ہے:

حیات بانٹ رہا تھا وہ مے فروش نہ تھا

یہی کیفیت سردار کی شعر خوانی ہی نہیں گفتگو کی بھی تھی اور نثر کے سجے سنورے جملے پڑھنے کی بھی۔ مشاعروں میں ملک کے باہر دور دراز کے شہروں اور ملکوں کے مشاعروں میں بھی انھیں یہی ملکہ اپنے ملک سے کہیں بڑھ چڑھ کر مقبولیت حاصل تھی۔ کینیڈا اور لندن اور دبئی کی مخلصوں میں ان کی تقریر اور شعر خوانی کی مقبولیت دیکھ چکا ہوں۔

ان کی تحریروں میں خصوصیات کے ساتھ ذکر واجب ہے ان کی انگریزی میں لکھے ہوئے مضامین کا جن میں سے صرف دو کا تذکرہ ہی کافی ہوگا ایک اردو کے بارے میں 'انڈین لٹریچر' بمبئی کے شمارے میں ہے۔ جس میں اردو میں اردو کی لسانی انفرادیت پر زور دیا گیا ہے اور مدلل انداز میں اردو کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا ''السٹریٹڈ ویکلی'' میں ان کی پچھلی بار علالت کے موقعے پر شائع شدہ ایک مضمون ہے جب انھیں دل کا دورا پڑا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ جو لوگ آئیں وہ بیماری اور موت کا ذکر نہ کریں مگر خود ڈاکٹر سے لے کر تمام آنے جانے والوں تک کی تمام تر گفتگو انھیں دونوں موضوعات پر ہوتی تھی اور انھیں احساس نہیں ہوتا تھا۔

سردار جعفری چلے گئے دکھ ہے تو یہ کہ ایسی بے پناہ صلاحیتوں والا ایک ہی ادیب ہمارے درمیان تھا اور وہ بھی اپنی پایا تھا کہ موت نے اس کے ہاتھوں سے قلم اور زبان سے جادو چھین لیا۔ آخری دور کی شاعری ہی میں شعری کیفیات کی بوقلمونی جلوہ دکھانے لگی تھی کہ خاموشی کا پیغام آگیا۔ اب انتظار ہے ت وان کا جن کے بارے میں سردار جعفری نے 'میرا سفر' میں لکھا تھا کہ ان کی زبان سے بولوں گا اور ان کی آنکھوں سے دیکھوں گا۔

آج بھی یہ خیال آتا ہے کہ غالب کے لفظوں میں سردار جعفری کے لیے بھی قدرت نے جو صلاحیتیں اور جس قسم کے کمالات ودیعت کیے تھے وہ سو میں سے ایک فی صد بھی پوری طرح ظہور میں نہ آئے پھر بھی اس نامکمل سے اظہار نے اردو ہی کو نہیں ہماری پوری قومی زندگی کو منور کیا۔ بقول شخصے جادو الفاظ میں نہیں شخصیت میں ہوتا ہے اور جب یہ شخصیت تھی سردار جعفری کی جس کا اظہار بہت تھوڑا سا اظہار سردار کی ہمہ جہات سر گرمیوں میں ہوا اور اسی شکوے کے ساتھ یہ سلسلہ ختم ہو گیا:

نہ بزم آسمان و یک ذرہ در سماع
آں ہم بہ کام دل نہ فشاند آستین خویش

(نو آسمانوں کی وسعت میں ایک ذرہ رقص میں ہے اور اسے بھی اتنی وسعت نہیں ملی کہ جی بھر کر اپنی آستینیں پھیلا سکے)

اس مضمون کا خاتمہ سردار جعفری کے میرے نام آخری خط سے کرتا ہوں جو انھوں نے بمبئی سے 20ر جنوری 1998ء کو لکھا تھا:

''برادرم تسلیم!

گیان پیٹھ انعام پر مبارک باد کا شکریہ!

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

اس سال نثر و نظم کی دو جلدیں شائع کرنے کا خیال ہے۔ نظم کا انتخاب کر لیا ہے۔ نثر کے مضامین جمع کرنا ہیں۔

فی الحال چند کتابیں شائع ہو رہی ہیں جو مارچ اپریل تک آجائیں گی۔

۱۔ غالب کا سومنات خیال، اردو مرکز، پٹنہ ۲۔ کبیر بانی (ہندی) راج کمل، نئی دہلی
۳۔ کبیر بانی (اردو) انجمن ترقی اردو، دہلی ۴۔ دیوانِ غالب (ہندی، اردو) دہلی
۵۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں (ہندی) راج کمل ۶۔ سرمایۂ سخن (شاعری کی لغت) مکتبہ جامعہ
۷۔ اقبال، کمیونزم اور اسلام پر انگریزی میں کتاب۔ پٹنہ
۸۔ گیان پیٹھ انعام کی تقریب سے پہلے منتخب نظموں کا شعری مجموعہ (ہندی)

اس وقت اردو کی پانچ کتابیں بازار میں ہیں:

۱۔ پتھر کی دیوار (پاکٹ بک) بمبئی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔
۲۔ ایک خواب اور ۳۔ لہو پکارتا ہے
۴۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں ۵۔ پیغمبرانِ سخن (بمبئی)

تہنیت کا دوبارہ شکریہ۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا
سردار جعفری

●●

مظہر امام

سردار جعفری کی ہمہ جہتی

سردار جعفری (یا علی سردار جعفری) ایک عرصے تک ہمارے ادب کی ایک بڑی متنازعہ شخصیت رہے ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں 1955ء کے بعد خصوصاً اکثر سوالیہ نشان قائم کیے گئے اور ان کی تنقیدی آرا کو بھی ہدف بنایا گیا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود سردار جعفری کی مقبولیت اور اہمیت میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ محمد حسن عسکری نے کرشن چندر پر لکھے ہوئے اپنے خاکے (1954ء) میں یہ بات کہی ہے کہ ادبی قدر و قیمت سے قطع نظر کم از کم دس سال تک کرشن چندر کی حیثیت ادیب سے کچھ زیادہ رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہی بات سردار جعفری کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں میں جو ہردلعزیزی کرشن چندر اور سردار جعفری کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ یعنی اردو پڑھنے والوں نے جو قربت ان سے برسوں محسوس کی ہے وہ بقول عسکری "محض ادیبوں سے محسوس نہیں ہوتی۔" اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ کرشن چندر اور سردار جعفری کے دور عروج (یعنی پوری پانچویں دہائی اور چھٹی دہائی کے ابتدائی چند برس) میں ممکن ہے کرشن چندر سے بہتر افسانہ نگار اور سردار جعفری سے بہتر شاعر موجود رہے ہوں، لیکن اس دور کے مزاج اور اس دور کی تہذیب کو سمجھنے کے لیے دونوں سے بہتر کوئی اور حوالہ نہیں ہو سکتا۔

سردار جعفری کی اہمیت اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ جدیدیت کے عروج کے زمانے میں بھی، جب ان پر اور ان کے ترقی پسند رفیقوں پر مسلسل حملے ہو رہے تھے، وہ بے حوصلہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے "گفتگو" کا اجرا کیا۔ نئے اور جدید لکھنے والوں کو بھی اس کے صفحات میں فراخ دلی سے جگہ دی۔ حتیٰ کہ اپنے ابتدائی شمارے کے اداریے کا آغاز ہی شہریار کی ایک مختصر نظم سے کیا جس کا آخری مصرع ہے:

پتہ: 176/B, Pocket-1, Mayur Vihar, Delhi-110091

کہ اسی پہ حملہ ہے رات کا

سردار جعفری اپنے نظریات پر سختی سے قائم رہنے کے باوجود ادب کی مملکت میں اپنے اونچے منصب پر بدستور فائز رہے۔

سردار جعفری 29؍ نومبر 1913ء کو اتر پردیش کے ایک قصبے بلرام پور میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں تاریخ پیدائش کا باقاعدہ ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا، اس لیے ان کی تاریخ پیدائش میں بھی اختلاف رہا ہے۔ برسوں تک ان کا سن پیدائش 1914ء لکھا جاتا رہا ہے۔ ان کی بہن ستارہ جعفری نے ان کی تاریخ پیدائش 26؍ نومبر 1913ء لکھی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے بزرگوں سے یہی تاریخ سنی تھی، لیکن سردار بھائی کو 29؍ نومبر یاد تھی۔ بہر حال اب متفقہ طور پر یہی تاریخ تسلیم کی جاتی ہے۔ نومبر کا مہینہ تو بہر حال طے ہے۔ سردار نے اپنی منظوم سوانح عمری ''نومبر میرا گہوارہ'' اسی مناسبت سے لکھی ہے۔ اسے انھوں نے اپنی سترویں سالگرہ کے موقع پر لکھنا شروع کیا تھا اور انھیں دنوں اس نظم کا ایک حصہ انھوں نے سری نگر دوردرشن کے مشاعرے میں سنایا تھا۔ انھوں نے طویل عمر پائی۔ پورے چھیاسی سال آٹھ مہینے؛ اور انھوں نے اپنی زندگی کا آخری وقت تک نہایت جائز مصرف لیا۔ اپنی علالت کے تین مہینوں کے علاوہ انھوں نے کبھی اپنی ادبی، سماجی اور دانشورانہ سرگرمیوں میں کمی نہیں کی۔

سردار جعفری کے والد ریاست بلرام پور میں عہدیدار تھے۔ دین دار اور قناعت پسند تھے۔ حلال کی روٹی کے قائل تھے۔ سردار جعفری کے بچپن میں والدہ کے زیورات بک گئے، لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ گھر میں افلاس ہے۔ بچپن میں ہی سردار اور ان کی بہنیں شرلاک ہومز کی کہانیوں، راشد الخیری کے ناولوں اور عظیم بیگ چغتائی کی کتابوں میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ انھیں چھے سال کی چھوٹی عمر میں مدرسہ سلطان المدارس، لکھنؤ میں داخل کرایا گیا تھا تاکہ وہ ''مولوی'' بنیں، لیکن وہاں کی فضا انھیں راس نہ آئی اور وہ وہاں سے بھاگ نکلے۔ پھر انگریزی تعلیم کے لیے ان کا داخلہ اسکول میں کرایا گیا۔

ریاست بلرام پور میں محرم بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔ مجلسیں بڑے اہتمام سے منعقد ہوتی تھیں۔ انیس کے مرثیوں کا بڑا چرچا تھا۔ سردار پانچ سال کی عمر سے ہی منبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگے تھے۔ انھوں نے بچپن میں قرآن بہار کے ایک مولوی

صاحب سے پڑھا۔ پیغمبروں کی کہانیاں بھی ان ہی سے سنیں۔ شروع سے ہی ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ سچائی اور صداقت کے لیے جان کی بازی لگادینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ انھوں نے بچپن سے ہی افلاس اور غربت کی بدترین صورتیں دیکھیں۔ انھیں یہ سوال پریشان کرنے لگا کہ یہ لوگ غریب کیوں ہیں، ان پر ظلم کیوں ہو رہا ہے اور اس پر کوئی احتجاج کیوں نہیں کرتا۔ اسی زمانے میں وہ گاندھی جی کی خودنوشت ''تلاشِ حق'' اور پلوٹارک (Plutarch) کی کتاب ''یونان اور روم کے مشاہیر'' سے بہت متاثر ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں وہ کالج کی تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے۔ وہاں انھیں اختر حسین رائے پوری، مجاز، جاں نثار اختر، سعادت حسن منٹو وغیرہ کی رفاقت ملی۔ منٹو ہی نے انھیں وکٹر ہیوگو اور گورکی سے آشنا کرایا اور بھگت سنگھ کے مضامین پڑھنے کو دیے۔ ڈاکٹر محمد اشرف اور ڈاکٹر عبدالعلیم علیگڑھ میں سردار کے استادوں میں تھے۔ اس طرح وہ اشتراکیت سے قریب آئے۔

سردار جعفری کی بڑائی ان کی Versatility میں مضمر ہے۔ وہ ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شاعرانہ حیثیت سب سے مقدم ہے۔ تاریخِ ادب میں ان کا نام ان کے شاعرانہ مرتبے کی بنا پر ہی باقی رہے گا۔ ان کی شاعری کا آغاز کس سن میں ہوا، اس کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ بچپن سے ہی انیس کا کلام ان کے کانوں میں پڑتا رہا۔ ان کا پہلا قابلِ ذکر شعر جو ان کے حافظے میں محفوظ رہا، وہ یہ تھا:

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز مرثیہ نگاری سے ہوا۔ انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ سولہ سترہ سال کی عمر میں 1930ء میں لکھا۔ اس کا پہلا بند یہ ہے:

آتا ہے کون شمعِ امامت لیے ہوئے
اپنی جلو میں فوجِ صداقت لیے ہوئے
ہاتھوں میں جامِ سُرخ شہادت لیے ہوئے
لب پر دعائے بخششِ اُمّت لیے ہوئے
اللہ رے حُسن فاطمہ کے ماہتاب کا
ذرّوں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

"تیسرے مصرعے میں "جامِ سُرخ" کی ترکیب توجہ طلب ہے، آگے چل کر یہ ان کی زندگی کا استعارہ بنا۔

علی گڑھ کی طالبِ علمی کے زمانے میں وہ باقاعدہ ترقی پسندانہ، باغیانہ اور احتجاجی نظمیں لکھنے لگے۔ ان پر جوشؔ کا اثر غالب تھا۔ اپنی ایک ناپسندیدہ تقریر کے باعث وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نکال دیے گئے۔ انھوں نے اپنی بی اے کی تعلیم اینگلو عربک کالج، دہلی میں مکمل کی اور آگے تعلیم کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی آ گئے۔ ان کی شاعری زوروں پر تھی۔ مجازؔ کا ساتھ تھا۔ دونوں نے مل کر تین چھوٹی چھوٹی کتابیں انھیں دنوں یعنی 1938ء میں شائع کیں۔ ان میں مجازؔ کا مجموعہ کلام "آہنگ" حیات اللہ انصاری کے افسانوں کا مجموعہ "انوکھی مصیبت" اور سردار جعفری کے افسانوں کی کتاب "منزل" شامل تھی۔ اس وقت سردار جعفری نے اپنے شعری مجموعے کی بجائے اپنے افسانوی مجموعے کی اشاعت کو ترجیح دی حالاں کہ ان کی افسانہ نگاری قابلِ لحاظ بھی نہیں تھی۔ مجازؔ اس وقت اپنی شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں پر تھے۔ ممکن ہے جعفری نے مجازؔ کے ساتھ اپنا مجموعہ پیش کرنا اپنے حق میں مناسب نہ سمجھا ہو۔ ظاہر ہے یہ فیصلہ درست تھا۔ انھوں نے "منزل" کی اشاعت کے بعد افسانہ نگاری نہیں کی۔ وہ اپنے آپ کو "ناکام افسانہ نگار" کہا کرتے تھے۔ البتہ چند سال بعد 1946ء میں انھوں نے ایک خوبصورت افسانہ "چہرو مانجھی" کے نام سے لکھا۔ یہ مشرقی بنگال کے پس منظر میں ماہی گیروں سے متعلق ایک اثر انگیز افسانہ ہے۔ اس کے اسلوب پر کرشن چندر کا اثر نمایاں ہے۔ ویسی ہی جذباتیت بھی در آئی ہے۔ لیکن خوبصورت نثر اور شاعرانہ اسلوب کے ایک نمونے کے طور پر اسے آج بھی دلچسپی سے پڑھا جانا چاہیے۔ جعفری نے حقیقی رنگ دینے کے لیے اس افسانے کو رپورتاژ کا نام دیا ہے۔

سردار جعفری کو بحث و مباحثے کا شوق اوائل عمر سے ہی تھا اور طالبِ علمی کے زمانے میں ہی انھوں نے اس فن میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ کئی معرکے سر کیے تھے اور انعامات پائے تھے۔ سردار جعفری کی تقریروں میں Oratory (خطابت) اور Debate (بحث و تمحیص) دونوں طرح کی خصوصیات گھل مل گئی تھیں۔ خطابت کے لطف کے ساتھ ان کی گفتگو نہایت مدلل اور persuasive ہوتی تھی اور ان کی تقریر کے دوران ان سے اختلاف کے پہلو شاذ ہی نکلتے تھے۔

افسانے کے علاوہ نثر میں تنقید سے ان کی دلچسپی بھی علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں شروع ہوئی۔ ان کا ایک مضمون "جدید اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات" 1936ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میگزین میں شائع ہوا تھا، جس میں اور باتوں کے علاوہ انھوں نے 'بلینک ورس' کے تجربے کی بھی مخالفت کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس مضمون کے آٹھ دس سال بعد ہی وہ ترقی پسندوں میں آزاد نظم کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے تسلیم کیے گئے۔

اپریل 1939ء سے ترقی پسند مصنّفین کا باقاعدہ ترجمان "نیا ادب" کے نام سے لکھنؤ سے شائع ہونے لگا۔ اس کے ادارے میں مجاز، سبطِ حسن اور علی سردار جعفری کا نام تھا، لیکن "نیا ادب" کا سب سے زیادہ کام سردار ہی کرتے تھے۔ مضامین کی فراہمی، کتابت و طباعت، رسالے کا جساب کتاب ایک طرح جعفری ہی کے ذمے تھا۔ اس کے پہلے شمارے میں سردار کا ایک مضمون "ترقی پسند مصنّفین کی تحریک" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ شاید یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ محمد حسن عسکری کی بدنام کہانی "پھسلن" جس کا موضوع ہم جنسی ہے، ترقی پسندوں کے اسی خاص الخاص رسالے "نیا ادب" میں چھپی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نئے ادیبوں پر عریاں نویسی اور فحش نگاری کے الزامات شدومد سے لگائے جا رہے تھے۔ اس لیے جب یہ کہانی الٰہ آباد سے ایک نئے افسانہ نگار کی جانب سے موصول ہوئی تو "نیا ادب" کا ادارتی عملہ اس کی اشاعت کے سلسلے میں جلد کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر رہا۔ اس موقع پر سردار جعفری نے رہنمائی کی اور ڈی ایچ لارنس کا ایک مضمون دکھایا جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ جنسی تجربات کے ذکر یا جنسی رشتے سے لذت یابی کے بیان کو فحاشی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اگر اس اظہار سے عورت کی تحقیر اور مرد کی فتح یابی کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ یہ سند ملی تو کہانی شائع کر دی گئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت بھی سردار کے مطالعے کا دائرہ محدود نہیں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ جب محمد حسن عسکری ترقی پسندوں کی کھلم کھلا مخالفت کرنے لگے تو اس افسانے کی اشاعت کو لے کر "نیا ادب" کی پالیسی پر سخت اعتراض کیے گئے۔ شاید ایسے ہی اعتراضات کا اثر تھا کہ جب اکتوبر 1945ء میں حیدر آباد میں ترقی پسندوں کی ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں عریاں نگاری کے خلاف ایک قرارداد سبطِ حسن نے پیش کی اور سردار جعفری نے اس قرارداد کی حمایت میں ایک زبردست تقریر کی، لیکن شاید بہتوں کو یہ

جان کر حیرت ہو کہ جہاں نوجوان اس قرارداد کی حمایت کر رہے تھے، وہاں قاضی عبد الغفار اور حسرت موہانی جیسے ثقہ بزرگوں نے یہ کہتے ہوئے کہ جو جذبہ یا احساس ادب کا حصہ بن گیا اسے عریاں کیسے کہا جا سکتا ہے، اس قرارداد کی مخالفت کی۔ حسرت موہانی نے کہا کہ زیادہ سے زیادہ اسے "لطیف ہوس" کہہ سکتے ہیں۔ قرارداد منظور نہیں ہوئی۔ اس کانفرنس کا ایک بہت عمدہ رپورتاژ کرشن چندر نے "پودے" کے نام سے لکھا تھا۔ یہ اردو کا پہلا رپورتاژ تھا اور اس کی اشاعت "ادب لطیف" کے سالنامے 1946ء میں ہوئی تھی۔

"نیا ادب" سے وابستگی اور اپنی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کے باعث سردار انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہراول دستے میں شامل ہوئے۔ انھیں 1942ء میں کمیونسٹ پارٹی کے اخبار "قومی جنگ" میں کام کرنے کے لیے ممبئی بلا لیا گیا۔ اس کے اڈیٹر سجاد ظہیر تھے۔ "قومی جنگ" کا نام کچھ عرصے بعد "نیا زمانہ" ہو گیا۔ پارٹی سے وابستگی نے انھیں انقلابی تحریکوں سے قریب کر دیا اور امنِ عالم کے لیے انھوں نے تخلیقی اور علمی دونوں سطحوں پر بڑا کام کیا۔

علی گڑھ میں ہی سردار جعفری نے "دیوانے" کے نام سے ایک ڈراما لکھا تھا۔ رشید احمد صدیقی نے حوصلہ افزائی کی تھی۔ ممبئی آنے کے بعد وہ پارٹی کے کاموں سے فراغت پا کر رات کو اپنے نئے ڈرامے "یہ کس کا خون ہے" کی ریہرسل کراتے۔ یہ ڈراما اسٹیج پر آٹھ روز کامیابی سے کھیلا گیا اور 1943ء میں یہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ اس کے دو سال بعد انھوں نے محبوب اسٹوڈیو سے مغلیہ پوشاکیں فراہم کیں۔ بعض شاعروں اور فلم اداکاروں کو آدابِ شعر خوانی سکھائے اور انھیں ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ وغیرہ مشہور شاعروں کی شکل میں پیش کیا۔ ساغر نظامی نے غالبؔ کا کردار ادا کیا تھا۔ سردار خود چوب دار بنے تھے، کیوں کہ اسی کا کام شاعروں کو متعارف کرانا تھا۔

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ سردار علی گڑھ کے طالبِ علمی کے زمانے میں ٹینس کے کھلاڑی بھی رہے ہیں۔ مجازؔ سے ان کی ملاقات ٹینس کورٹ میں ہی ہوئی تھی۔ وہ اینگلو عربک کالج دہلی کے سنگلز چمپئن (Singles Champion) بھی ہوئے۔

سردار جعفری ایک بہت اچھے Coversationalist بھی تھے۔ خوش گفتار طرزِ کلام کے ماہر۔ ان کی باتوں میں "گلوں کی خوشبو" تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے پر یہی جی چاہتا تھا کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

اپنی تحریری اور تقریری صلاحیتوں کی بنا پر انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن پر بالادستی قائم کرلی تھی۔ ان کا شمار ترقی پسند ادبی تحریک کے نظریہ سازوں اور قافلہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد جب کمیونسٹ پارٹی کے استحکام کے لیے سجاد ظہیر کو پاکستان بھیجا گیا اور جب وہاں انھیں راولپنڈی سازش کیس میں فیض کے ساتھ گرفتار کیا گیا، تو ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کی قیادت سردار جعفری نے ہی سنبھالی۔ ان کے زمانے میں تحریک انتہاپسندی کا شکار ہوئی اور ایک مخصوص پارٹی کی تشہیر کا آلۂ کار بنی، جس کی وجہ سے تحریک پر منفی اثرات مرتب ہوئے اور جدیدیت کے رجحان کے لیے فضا سازگار ہوئی۔ پھر بھی اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک اور سردار جعفری لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس تحریک کے زوال کے بعد بھی وہ تھک کر نہیں بیٹھے۔ انھوں نے "دیوانِ غالب" کا انتہائی خوبصورت ڈی لکس اڈیشن اردو اور ہندی دونوں رسم خط میں شائع کیا۔ اس کی غیر معمولی مقبولیت سے تقویت پاکر انھوں نے کبیر (کبیر بانی) میرابائی (پریم دیوانی)، اور میر کے انتخابات اسی طرح دونوں رسم خط میں شائع کیے۔ ان سب پر انھوں نے بڑے دلکش انداز میں عالمانہ مقدمے لکھے جو کلاسیکی روایت، تصوف اور مابعد الطبیعات پر ان کی گہری نظر اور شعر فہمی کی غیر معمولی صلاحیت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ یہ چاروں دیباچے بعد میں "پیغمبرانِ سخن" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ یہ انتخابات ہندی اور اردو قاری کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں معاون ہوئے۔

ایک زمانے میں سردار جعفری نے اردو کے لیے ناگری رسم خط کی حمایت کی تھی بعد میں جب ان پر بہت اعتراضات ہوئے تو انھوں نے اپنا یہ موقف بدل دیا۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا جب انھوں نے اردو زبان کے تحفظ اور اس کا جائز مقام دلانے کے سلسلے میں اپنی رضاکارانہ سرگرمیاں تیز کیں، اور گجرال کمیٹی رپورٹ پر نئے حالات میں نظر ثانی کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی اس کی سربراہی کی اور اسے جعفری کمیٹی سے منسوب کیا گیا۔

میں نے اب تک سردار جعفری کی شخصیت کی مختلف جہتوں اور ان کی گوناگوں صلاحیتوں کی جانب اشارے کیے ہیں۔ ان میں سے کئی اشارے مزید وضاحت کے متقاضی ہیں۔ لیکن ان پر تفصیل سے لکھا جائے تو اس کے لیے پوری کتاب چاہیے۔ ان جہتوں کی روشنی میں علی سردار جعفری کی شخصیت کی کوئی تصویر بنائی جائے تو وہ ان رنگوں پر مشتمل ہوگی:

ا۔	شاعر، تخلیق کار، فن کار	۲۔	افسانہ نگار
۳۔	ڈراما نگار	۴۔	مضمون نگار، نقاد، انشاپرداز
۵۔	صحافی، مدیر	۶۔	سیاسی کار کن
۷۔	مقرر	۸۔	صاحب گفتار (Convesationalist)
۹۔	دانشور	۱۰۔	نظریہ ساز
۱۱۔	قائد	۱۲۔	براڈ کاسٹر
۱۳۔	ٹیلی کاسٹر	۱۴۔	فلمی نغمہ نگار
۱۵۔	ہدایت کار	۱۶۔	فلم ساز
۱۷۔	ہندی اردو قربت کے داعی	۱۸۔	اردو تحریک کے مبلغ

اس فہرست میں اور اضافہ ممکن ہے۔ مثلاً ٹینس سے ان کے شوق کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ "روشنی اور آواز" (Light & Sound) کے لیے انھوں نے جو اسکرپٹ لکھے وہ ان ہی کا حصہ ہیں۔ خصوصاً وہ جو لال قلعہ، دہلی اور شالیمار باغ، سری نگر کشمیر کے لیے لکھے گئے۔

اتنی ساری خوبیوں کا ایک فردِ واحد میں مجتمع ہونا ایک معجزہ ہی تو ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ گزشتہ پچاس سال میں اردو ادب میں ایسی کثیر الجہات شخصیت کوئی اور پیدا ہوئی ہو۔ جعفری کی شہرت، ہر دلعزیزی اور ناموری میں ان تمام عناصر کی کار فرمائی ہے۔

●●

مخمور سعیدی

مجموعۂ صد صفات اِک ذات

○

رہ رہ کے جو یاد آ رہا ہے
وہ شخص کہاں چلا گیا ہے
آنکھیں، کہ اسی کی منتظر ہیں
دل ہے، کہ اسی کو ڈھونڈتا ہے
ہیں شام و سحر طلب میں اس کی
ہر لمحہ اسے پکارتا ہے
ہیں فرش و فلک ملول جس پر
یہ سانحہ کیسا سانحہ ہے
غمناک، جو لاکھ حادثوں سے
موت اس کی اک ایسا حادثہ ہے
شاعر بھی، عزیزِ شاعراں بھی
کیوں ہم سے جدا وہ ہو گیا ہے
نقاد، ادیب اور محقق
کیا کہیے تعارف اس کا کیا ہے
مجموعۂ صد صفات، اک ذات
ایسا کوئی اور کب ہوا ہے

○

انسان کو اس نے یہ بتایا
انسان کا احترام کیا ہے
اعجاز نما تھا اس کا لہجہ
شعلہ، کبھی پھول بن گیا ہے
ہر جنبشِ خامہ سخن میں
اک محشرِ نغمہ و نوا ہے
ہر شعر ہے شعر شور انگیز
ہنگامہ فکر و فن بپا ہے
کلیوں کی چٹک میں اس کی آواز
پھولوں کی زباں سے بولتا ہے
کتنا شیریں ہے اس کا لہجہ
کانوں میں جو شہد گھولتا ہے

○

یادوں میں ہماری ہے وہ زندہ
خوابوں میں ہمارے جاگتا ہے
موجود اسی انجمن میں ہے وہ
سردار کہیں نہیں گیا ہے

○

یاد آتی ہیں اس کی کتنی باتیں
سناٹا سا دل پہ چھا گیا ہے
یہ بزم مشاعرہ ہے اور وہ
صدرِ بزم مشاعرہ ہے
یہ ایک مذاکرہ ہے اور ہال
تقریر سے اس کی گونجتا ہے
یہ ہاتھ میں اس کے جام مے ہے
جرعہ جرعہ وہ پی رہا ہے
یہ لالہ رُخوں کی انجمن میں
وہ قصۂ دل سنا رہا ہے
اسرار و رموز فکر و فن کے
ذہن و دل میں اتارتا ہے
اک کیفِ دوام کی فضا میں
وہ آج بھی سانس لے رہا ہے

○

نفرت تھی اسے اس اہرمن سے
انسان کا لہو جو چوستا ہے
دشمن تھا وہ اس نظامِ زر کا
جو آدمی خور اژدہا ہے
لیکن یہ خبر اسے نہیں تھی
وہ سائے میں جس کے جی رہا ہے
پیغمبر خیر وہ نہیں ہے
خود ایک بدی کا دیوتا ہے

○

مخمورِ صمیم قلب و جاں سے
اب اس کے لیے یہی دعا ہے
تاحشر سکون سے رہے وہ
تا عمر جو مضطرب رہا ہے
وہ اس سے سوا کا مستحق تھا
دنیا نے جو کچھ اسے دیا ہے

رضیہ فصیح احمد

سردار جعفری کی یاد میں

سردار جعفری صاحب سے پہلی ملاقات یاد آتی ہے۔ غالباً 83ء اور مقام غالبؔ لائبریری کراچی۔ تقریب کیا تھی یاد نہیں۔ تقریب کے آخر میں مرزا ظفر الحسن، ہاجرہ مسرور، احمد علی خاں، سید انور اور دیگر بہت سے حضرات و خواتین سردار جعفری کے ساتھ تصویریں اتروا رہے تھے۔ گو میرا تعارف ہو چکا تھا لیکن میں ادب میں بھی حسب مراتب کا بہت خیال رکھتی ہوں لہٰذا جونیر ادیب کی حیثیت سے ایک طرف کھڑی رہی۔ تصویر کے بعد سردار جعفری کی نظر مجھ پر پڑی۔ شاید انھیں میرا اس طرح نظر انداز کیا جانا اچھا نہیں لگا۔ انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور ''تصویر گر'' سے کہا ''بھئی رضیہ کے ساتھ ہماری تصویر لو۔'' سینئر ادیب ایسا کم کرتے ہیں۔ خصوصاً جب چاروں طرف بیسیوں پرانے احباب اور سینکڑوں پروانے موجود ہوں۔ باتوں کے دوران مجھ پر ان کی شخصیت کا بہت اچھا اثر مرتب ہوا۔ وہ سدا سوسائٹی کے ان افراد کے ساتھ رہے جن کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ انھوں نے اپنا موقف کبھی نہیں بدلا۔ روس میں کمیونزم کی ناکامی کے اسباب بھی گنوائے اور سرخ پرچم کو الوداعی سلام بھی کیا۔

سردار جعفری سے دوسری ملاقات شکاگو میں ہوئی۔ اکتوبر 94ء میں انھوں نے شکاگو سے فون کیا کہ یوسف ناظم صاحب نے آپ کے لیے کوئی چیز بھیجی ہے۔ میں ان کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچی۔ سلطانہ جعفری نے دروازہ کھولا اور بہت محبت سے ملیں۔ یہ وہی سلطانہ ہیں جن کے لیے سردار جعفری نے عشقیہ اشعار کہے۔ ''دل نے کہا اور میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اگر میں گریس فل خواتین کی ایک فہرست بناؤں تو سلطانہ یقیناً کہیں سر فہرست ہی ہوں گی۔

سردار جعفری صاحب بھی بہت اچھی طرح ملے۔ یوسف ناظم کی کتاب کا پیکٹ دیا۔

یوسف ناظم صاحب نے "امریکہ میری عینک سے" کتاب میرے لیے بھیجی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ گھر نہایت کشادہ اور خوب صورت ہے۔ بڑے سے پائیں باغ میں درختوں پر پرندے چہچہا رہے ہیں۔ اس وقت گھر میں صرف سردار جعفری اور سلطانہ تھے۔ میزبان "کام" پر گئے ہوئے تھے۔

خیال تھا کہ مہمان اتنے عمدہ گھر میں بیٹھ کر باتیں کرنے کو ترجیح دیں گے پھر بھی میں نے کہا۔ "آپ دونوں تنہا یہاں ہیں۔ ہمارے گھر چلیے۔" دونوں فوراً راضی ہو گئے۔ ان کی شخصیت کا یہ رخ بھی بہت اچھا لگا۔ یہ پدم شری یافتہ، سینکڑوں ایوارڈ لیے؛ جسٹس آف پیس اور نہ جانے کیا کیا۔ بین الاقوامی شاعر اس قدر منکسر المزاج، نرم خو اور سادہ دل کہ بیان سے باہر۔

ہمارے گھر آئے۔ کھانا کھایا۔ اپنی کتابیں دیں۔ ایک ٹیپ دیا۔ "شاعر" کا پرچہ یہ کہہ کر دیا کہ "ایڈیٹر نے آپ کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش کے ساتھ بھیجا ہے۔" میں نے دیکھا کہ وہ سردار جعفری نمبر تھا۔ انھیں اپنا نمبر خود دینا اچھا نہیں لگا۔ آج یہ رکھ رکھاؤ کہاں۔

بہر حال خوب باتیں ہوئیں۔ ان کے لہجے میں مٹھاس کے ساتھ ایک زور بھی تھا مگر "زبردستی" بالکل نہیں۔ ہر سوال کا جواب تفصیل سے دیتے اور مدلل۔ مگر علمیت جتانے کا انداز بالکل نہ تھا۔ اگر اختلاف بھی کرتے تو اس خوبی سے کہ دل شکنی نہ ہو۔ بہت لوگوں نے ان سے انٹرویو لیے۔ وہ سوالوں میں صاف گوئی پر اصرار کرتے تھے اور جواب میں دو ٹوک بات کرتے تھے مگر بین السطور کسی پر طنز یا کسی کو نیچا دکھانے کی کوشش ان کے ہاں سرے سے نہیں۔ وہ وسیع القلب تھے۔ کھلے دل سے اپنے ساتھیوں کی تعریف کرتے تھے۔ شوکت کیفی نے اپنے مضمون "سردار جعفری، میرے ہمدم میرے دوست" میں لکھا ہے کہ ان میں حسد کا مادہ بالکل نہیں تھا۔ کیفی صاحب کو اچانک اسٹروک ہوا تو کس طرح سردار جعفری اور سلطانہ نے ان کی مدد کی یہ روئداد بھی انھوں نے لکھی ہے بلکہ یہاں تک "اگر کیفی اس وقت زندہ ہیں تو اس میں ان کا اور سلطانہ آپا کا ہاتھ ہے۔"

ہاں تو سلطانہ بھی بے حد بے تکلفی سے باتیں کرتی رہیں۔ بلا جھجک، بغیر پوچھے دونوں اپنی عمروں کا ذکر کر رہے تھے تو میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "آپ قرۃ العین حیدر سے بڑی ہیں؟"

سلطانہ نے فوراً جواب دیا۔ "بہت بڑی"

میں نے پھر جھجکتے ہوئے کہا۔ ''مگر دیکھنے میں تو شاید آپ دونوں ہم عمر۔''

''ارے وہ ان سے بہت بڑی لگتی ہیں۔'' سردار جعفری درمیان میں بول اٹھے۔ کچھ دیر قرۃ العین کی باتیں ہوئیں۔ پھر سلطانہ نے اپنی شادی کا قصہ سنایا۔ ان کے والدین جعفری صاحب سے ''کمیونسٹ'' سے ان کی شادی کرنے پر رضامند نہیں تھے چنانچہ ان کی شادی میں صرف چند دوست شریک تھے۔ جس دن مہاتما گاندھی قتل ہوئے ان کی شادی تھی۔ شوکت کیفی نے لکھا کہ: یہ خبر ملتے ہی ایسی بھگدڑ مچی کہ کسی کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ دولہا دلہن کہاں گئے۔ غالباً عصمت چغتائی کے ساتھ، کیوں کہ سلطانہ نے کہا کہ شادی ولیمہ کی دعوت میں عصمت چغتائی نے احباب کو آئس کریم کھلائی۔

ان دنوں شکاگو میں علی گڑھ المنائی کا مشاعرہ ہونے والا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا جیسے شکاگو والوں کو یہ علم ہی نہیں کہ سردار جعفری اس شہر میں موجود ہیں۔ ہم نے سردار جعفری صاحب سے پوچھا۔ ''آپ علی گڑھ المنائی کے مشاعرے میں شرکت کریں گے؟''

انھوں نے کہا۔ ''ضرور۔ علی گڑھ سے تو میرا خاص تعلق رہا ہے اور سلطانہ کی تو پیدائش ہی علی گڑھ کی ہے۔''

باتوں باتوں میں جب انھوں نے ایک تاریخ بتائی جس دن انھیں کہیں اور مشاعرہ پڑھنا تھا تو ہم چونکے کہ اس تاریخ کو شکاگو میں علی گڑھ المنائی کا مشاعرہ تھا۔ افسوس اس بات کا تھا کہ یہ بات سردار جعفری صاحب کو معلوم بھی نہیں تھی۔ سردار جعفری اس مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے بعد میں آئے اور دوسرے مشاعرے میں شریک ہوئے۔ بہرحال یہ افسوس کا مقام ہے کہ جس مشاعرے میں اتنا بڑا شاعر خود پڑھنا چاہے وہ نہ پڑھ سکے۔ مہمان شاعروں میں سے اکثر کو میں نے کہتے سنا کہ ہم مجبور ہیں۔ شاعرانہ رعایت سے ایک صاحب نے تو ''پابہ زنجیر'' بھی کہا۔ یہ شکایت بھی ہوئی کہ میزبان جس سے چاہے ملواتے ہیں جس نہیں چاہتے نہیں ملواتے۔ شاعروں کا یہ احوال سن کر دکھ ہوتا ہے۔

غالباً دوسرے دن صفیہ شہابی نے سردار جعفری اور سلطانہ کو اپنے گھر مدعو کیا۔ وہ بلا تکلف آئے۔ سردار جعفری اسی طرح ہنستے مسکراتے، سلطانہ اس دن بھی بہت گریس فل لگیں۔ لباس کے معاملے میں وہ بہت خوش ذوق ہیں۔ اتفاق سے میری شال اور جعفری صاحب کے دوشالے کا رنگ ایک تھا۔ اس میں مغالطہ ہوتا رہا اور ہم ہنستے رہے۔

کاش ہم شالیں بدل لیتے۔

اس دن ویڈیو بھی بنا۔ جو ٹیپ انھیں نے مجھے دیا تھا وہ ایک دن پہلے میں سن چکی تھی۔ اس میں ابتداء میں انھوں نے اپنی شاعری کے بارے میں اپنی کتابوں کے دیباچوں سے اقتباسات سنائے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شاعر کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کے لیے میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ آج حقیقت کیا ہے؟ روحِ عصر کیسی ہے؟ اس پر تفصیل سے بات کرنے کے بعد کہا کہ "میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف قسم اور مختلف سطح کی شاعری کرتا رہا ہوں۔ میں نے اس اصولوں کو بہت مفید پایا ہے کہ تشبیہ اور استعارے اور امیجری موضوع کے ماحول سے حاصل کرنے چاہئیں۔ اسی لیے آپ کو میرے یہاں ایسے مصرے ملیں گے۔

شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیریں

اقتباسات کے بعد ان کی مختلف نظمیں بھی ٹیپ میں ہیں۔ ان کا کلام پڑھا بھی تھا مگر ان کی زبان سے سامنے بیٹھ کر سننے میں کچھ اور ہی لطف آیا۔ "پتھر کی دیوار" ان کی پسندیدہ نظم ہے۔ مجھے یہ بند بہت پسند آئے۔

پتیوں کی پلکوں پر اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر دھوپ پر سکھاتی ہے
آفتاب ہنستا ہے
مسکراتے ہیں تارے
چاند کے کٹورے سے چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں پھر بھی اک اندھیرا ہے

اور

تیرگی کے بادل سے
جگنوؤں کی بارش ہے
رقص میں شرارے ہیں
ہر طرف اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں

ہر طرف شرارے ہیں
کوئی کہہ نہیں سکتا
کون سا شرارہ کب
بے قرار ہو جائے
شعلہ بار جائے
انقلاب آجائے

جب انھوں نے "آبلہ پا" نظم پڑھی تو میرے ناول "آبلہ پا" کا ذکر بھی رہا جس پر کبھی 65-64ء کا آدم جی ایوارڈ ملا تھا۔ جعفری صاحب نے بتایا کہ انھوں نے یہ نظم 85ء میں لکھی ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

سائے میں درختوں کے
بیٹھے ہوئے انسانو
اے وقت کے مہمانو
کس دیس سے آئے ہو
اے سوختہ سامانو
کل صبح کے دامن میں تم ہو گے نہ ہم ہوں گے
بس ریت کے سینے پر کچھ نقش قدم ہوں گے
کس دیس سے آئے ہو کس دیس کو جانا ہے
اے وقت کے مہمانو
اے سوختہ سامانو
اے شمع تمنا پر جلتے ہوئے پروانو

چونکہ مجھے یہ جاننے کا شوق ہے کہ میرے بچپن یا لڑکپن کے سنے ہوئے ناموں میں سے کون کب کہاں تھا۔ جعفری صاحب تفصیل سے بتاتے رہے کہ کون کون ان کے ساتھی رہے ہیں اور کون ان سے جونیر تھے اور شاعری کا آغاز کیا۔ فیضؔ صاحب کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا۔ "چلئے میں وہ نظم سناتا ہوں جو میں نے فیضؔ کے لیے لکھی ہے جب وہ جیل میں تھے۔" پھر انھوں نے اپنے خاص انداز میں وہ نظم سنائی۔

کل تھا جب میں جیل میں تنہاء
پتھر کے تابوت کے اندر
خاموشی کے سرد کفن میں
لپٹے ہوئے تھے نغمے میرے
کالی سلاخوں کے جنگل میں
دوستوں کی اور محبوبوں کی
کھوئی ہوئی تھیں سب آوازیں
تیرے نغمے ساتھ تھے میرے
(اور آخر میں)
آج ہے جب تو جیل میں تنہاء
میں اپنی آواز کا شعلہ
اور اپنی للکار کی بجلی
گیتوں کے ریشم میں رکھ کر
تیری خاطر بھیج رہا ہوں
اور یہ نظم فیض کے اشعار پر ختم ہوئی۔
بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زبان اب تک تیری ہے
واقعی وہ اپنی آواز کا شعلہ اور للکار کی بجلی کو ریشم میں رکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظم ''نیند'' سنائی جو اپنے بیٹے کی پہلی سالگرہ پر جیل سے بھیجی تھی۔
رات خوب صورت ہے نیند کیوں نہیں آتی
رات پینگ لیتی ہے
چاندنی کے جھولے میں
آسمان پر تارے
ننھے ننھے ہاتھوں سے
بن رہے ہیں جادو سا

جھینگروں کی آواز میں
کہہ رہی ہیں افسانہ
دور جیل کے باہر
بج رہی ہے شہنائی
ریل اپنے پہیوں سے
لوریاں سناتی ہے
رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

ان کی وہ جوشیلی نظم جو وطن کی سرحد پر کہی گئی ہے۔

میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا
(وہ چاہتے ہیں کہ یہ سرحد دلہن کی مانگ کی صورت ہو)
کہ جو بالوں کو دو حصوں میں تو تقسیم کرتی ہے
مگر سندور کی تلوار سے صندل کی انگلی سے
اور تمنا کرتے ہیں
وہ دن آئے کہ آنسو ہو کے نفرت دل سے بہہ جائے
وہ دن آئے یہ سرحد بوسہ لب بن کے رہ جائے

سردار جعفری ادب میں ورثے کے قائل ہیں۔ انھوں نے اقبالؔ کے سلسلے میں بتایا کہ ترقی پسندوں نے ان سے کیا لیا ہے اور ان کی اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ''تو جناب ہم نے اقبالؔ سے تصور انسانیت لیا ہے اور انسانی اخلاق، انسان کی تخلیقی قوت اور انسانی ہاتھوں کی عظمت کا تصور لیا ہے۔ دست دولت آفرین، پھر ہم نے اقبالؔ کے ہاں سے نظریہ کائنات لیا ہے۔

کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

یعنی تخلیق کا عمل ایک جاری و ساری عمل ہے۔ ہر دم ایک نئی دنیا تخلیق پا رہی ہے۔ جس میں لمحہ گزشتہ کا عکس بھی ہے۔ ہم نے اقبالؔ سے آہنگ بھی لیا اور آپ دیکھئے کہ اقبالؔ کے آہنگ سے کوئی باشعور شاعر بچا ہی نہیں۔ بیسویں صدی دراصل اقبالؔ کی صدی ہے۔''

انھوں نے کہا۔ "اقبال طبقاتی ناہموار سماج کا بہت بڑا شاعر ہے۔"

جب بہت باتیں ہو چکیں اور کئی نظمیں، غزلیں سنا چکے اور پھر بھی فرمائشیں ختم نہیں ہوئیں تو انھوں نے کہا۔ "میرا گلا ساتھ نہیں دے رہا دوبارہ آؤں گا پھر بیٹھیں ہوں گی۔ پھر موقع ملے گا۔"

ہاں جب انھوں نے کچھ پڑھ کر سنانے کے لیے اپنی کتاب مانگی تو سلطانہ بولیں "اب تم نے اپنی پستک کھول لی تو صبح ہو جائے گی۔" بڑے مزے سے انھوں نے یہ بات کہی اور بڑے سلیقے سے سردار جعفری نے سن لی۔ میں نے ان کو بیوی سے ایک خاص تعلق خاطر، نہایت خلوص و عزت سے پیش آتے دیکھا جو (اللہ مجھے معاف کرے) میں نے کم ہی لکھنے والوں میں دیکھا۔

سردار جعفری صاحب کا ٹیپ اور ویڈیو کیسٹ میرے پاس ہے۔ ان کو سن کر اور دیکھ کر بھلا کا ہے کو یقین آئے گا کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں۔ مگر حقیقت تو حقیقت ہے۔ میں سلطانہ اور ان کے سب لواحقین تک اپنا پرسہ پہنچانا چاہتی ہوں۔ یہ تو وہ بھی جانتے ہیں کہ سردار جعفری کی آواز، ان کا پیغام ان کا لہجہ ان کی شاعری زندہ ہے اور رہے گی۔ موت کو تو وہ ویسے بھی اہمیت نہیں دیتے تھے اپنی نظم 'موت' میں انھوں نے لکھا ہے۔ "موت سے ہم کو ملنے کی فرصت نہیں۔" میں بڑے لکھنے والوں سے کم کم ملی ہوں اور بہت کم کسی کے بارے میں لکھا ہے۔ سردار جعفری صاحب کے لیے بے اختیار جی چاہا کہ لکھوں۔ ان کے بارے میں رائے میں نے قائم کی تھی اس کی تصدیق ان کے کتنے ہی ساتھیوں نے کی۔ مجھے خوشی ہے کہ ایک ایسے اچھے، انسان سے تھوڑے ہی عرصے کے لیے میری ملاقات رہی۔ خوشی اس بات کی بھی ہے کہ شاید مجھ میں مردم شناسی کی تھوڑی سی قابلیت ہے۔

وہ دوبارہ شکاگو آئے۔ کئی مشاعرے بھگتا کر لوٹے۔ بے حد تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ پہلے دن کے مقابلے میں ان کی صحت اور پژمردگی دیکھ کر دکھ ہوا۔ سلطانہ اپنے کسی رشتے دار کے پاس کسی اور اسٹیٹ میں تھیں۔ انھوں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ جگہ جگہ ان کے ساتھ نہیں جا سکتیں۔ باوجود تھکے ہونے کے انھوں نے اسی توانائی کا مظاہرہ کیا اور تقریباً ساری رات بیٹھے رہے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے کیفی اعظمی بھی اس مشاعرے میں تھے۔ ان دونوں کی وہ نظمیں جو کبھی صرف پڑھی تھیں ان کی زبانی سنیں تو سب لطف آیا۔ وہ دور جب

دونوں اوران کے بہت سے ساتھی ایک شہر میں یکجا ہوں گے کیا شاندار دور ہوگا ہم اس تصور سے خوش ہوتے رہے، لیکن اصل میں یہ بہت لوگ کن مالی مشکلات سے گزرے، کن چٹانوں سے ٹکرائے، جیلوں میں رہے یہ سب سوچنے کی باتیں ہیں۔ آدرش کی خاطر جان پر دکھ سہنا بڑی بات ہے۔ غالب کا ہزاروں مرتبہ کا سنا ہوا مصرعہ آج بھی معنی رکھتا ہے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

خود سردار جعفری نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ "ہمارے معترضین کے لیے وجہِ شکایت ہماری شاعری نہیں بلکہ ہمارا فلسفۂ زیست رہا ہے۔ یاروں نے اس فکر کو مطعون کرنے کے لیے ایسے بہتان تراشے ہیں جن کی نہ کوئی علمی بنیاد تھی اور نہ ادبی دیانت۔"

بہر حال حقیقت یہ ہے کہ گوشت و پوست کے سردار جعفری اب ہم میں نہیں رہے۔ ان کے بیتوں کے ساتھ میں اجازت چاہتی ہوں۔

صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

اور

جاتے جاتے دے گئے ہم زندگی کو رنگ و نور
رفتہ رفتہ بن گئے اس عہد کا افسانہ ہم

●●

زاہدہ حنا

سردار جعفری کی آواز خاموش ہو گئی ہے

میں بر صغیر کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہوں جو آزادی کو آزادئ موہوم قرار دینے کے باوجود جدو جہد اور جمہوریت پر ایمان رکھتی ہے اور جو "چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی" کی قائل ہے۔ سردار جعفری 87 برس کے تھے اور ان کی رخصت کوئی غیر متوقع یا حیران کن بات نہیں وہ ان دانشوروں اور ادیبوں میں سے تھے جنہوں نے غیر منقسم ہندوستان میں آزادی کے خواب دیکھے اور اپنی جوانی اسی کی تعبیر ڈھونڈنے میں بسر کر دی۔ سجاد ظہیر نے جس ترقی پسند تحریک کے آغاز اور عروج کی دستاویز "روشنائی" کی صورت میں مرتب کی، اس تحریک کو آخری سانس تک آگے بڑھانے والوں میں سے ایک علی سردار جعفری تھے۔ نواب مرزا شوق نے کس سادگی سے کہا ہے کہ "موت سے کس کو رستگاری ہے۔" لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سفاک حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین اور سبط حسن سے علی سردار جعفری تک کوئی نام ایسا نہیں ہے جس کے ذکر سے یوں سرسری گزرا جائے۔ یہ لوگ اپنی ذات میں اتنی بہت سی رعنائیاں اور توانائیاں سمیٹے ہوئے تھے کہ یہ چلے گئے تو ان کے ساتھ ہی بر صغیر کی علمی، ادبی اور تہذیبی محفلوں کی رونقیں رخصت ہو گئی ہیں۔

ان سے پہلی ملاقات ممبئی میں اور پھر برسوں بعد تفصیلی ملاقات سبطے بھائی کے گھر پر اس تقریب میں ہوئی تھی جب وہ اور کیفی بھائی سالہا سال بعد پاکستان آئے تھے اور سبطے بھائی نے ان لوگوں کے اعزاز میں ایک محفل رکھی تھی۔ آخری ملاقات مارچ 1999ء میں ہوئی جب وہ راحت سعید، حسن عابد اور واحد بشیر کی سرکردگی میں منائے جانے والی جوش صدی تقریبات میں کراچی آئے۔ جوش صدی تقریبات کا افتتاح انھوں نے کیا تھا۔ اس تقریبات میں شرکت کرنے والوں کو ایوارڈ دیئے گئے تو یہ اعزاز میری بیٹی سحینا کے حصے میں آیا کہ اس

کے بنائے ہوئے جوشؔ صاحب کے پورٹریٹ کو سراہتے ہوئے علی سردار جعفری نے اسے ایوارڈ عنایت کیا۔ جن لوگوں نے جعفری صاحب کو جوش سیمینار میں بولتے ہوئے سنا ہے وہ ان کی فی البدیہہ تقریر کو طویل عرصے تک فراموش نہ کر سکیں گے۔ ترقی پسند ادیبوں میں سے یہ ظ. انصاری تھے کہ جب بولتے تھے تو لوگ مسحور ہو کر گھنٹوں سنتے تھے۔ جوشؔ صدی تقریبات میں جعفری صاحب نے بھی سننے والوں پر جادو سا کر دیا تھا۔

علی سردار جعفری نے افسانے اور ڈرامے لکھے، شاعری کی، تنقید کے میدان میں اترے، دانشوری کے سمندر میں شناوری کی، فلمیں بنائیں، ادبی رسالہ نکالا، میر، کبیر، میرابائی اور غالب پر لکھا اور ان کا منتخب کلام اردو اور ہندی میں مشترک طور سے مرتب کیا، سیکڑوں جلسوں میں شرکت کی، جلوس میں شامل ہوئے جیل گئے۔ دنیا بھر کے بڑے بڑے ادبی اعزازات ان کے حصے میں آئے۔ برصغیر میں وہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک کے سالاروں میں سے رہے۔ وہ چاہتے تو لاکھوں کماتے اور کروڑوں میں کھیلتے، لیکن زندگی جس طور گزاری اس کا احوال خود انھوں نے کچھ یوں لکھا ہے۔

"جب میں اپنی کتاب لکھنے میں مصروف تھا میرا کرائے کا مکان مجھ سے اس لیے چھین لیا گیا کہ اس میں کبھی سجاد ظہیر رہا کرتے تھے اور وہ اب پاکستان چلے گئے ہیں جس کی وجہ سے حق کرایہ داری متروکہ جائیداد قرار دے دیا گیا۔ کئی مہینے کی دوڑ دھوپ کے بعد بہ مشکل تمام مجھے ایک کمرے کا مکان مل گیا جہاں میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ منتقل ہو گیا اور اب تک اسی کمرے میں رہ رہا ہوں۔ جس کمرے میں بچے ہوں اس میں لکھنے پڑھنے کا کام ممکن نہیں ہے کیوں کہ بچے پڑھنے سے زیادہ کتاب پھاڑنے، قلم توڑنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ چار چھ مہینے کی مزید کوشش کے بعد مجھے اس گھر میں ایک اور چھوٹا سا کمرہ مل گیا اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں اس بے ہوا، بے نور کمرے میں بیٹھ کر لکھ پڑھ سکتا ہوں۔ لیکن اطمینان پھر بھی نصیب نہیں ہوا۔ میرے ایک اور ادیب دوست جو ہندی کے شاعر ہیں آ گئے، وہ بھی میری طرح بے گھر تھے اور انھوں نے اس کمرے میں آکر پناہ لی۔ اب یہ چھوٹا سا کمرہ میرا کتب خانہ بھی ہے، میرے شاعر دوست کا ٹھکانہ بھی اور میرے گھر کا مہمان خانہ بھی۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب میں اپنے بچوں سے بھاگ کر اس کمرے میں آتا ہوں تو یہاں مجھے بڑی عمر کے بہت سے بچے بیٹھے ہوئے مل جاتے ہیں۔ میرے بچے کتاب پھاڑتے ہیں۔

یہ بڑی عمر کے بچے کتاب پڑھنے کے شوقین ہیں اور ان کا شوق اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ بعض اوقات وہ میری کوئی ایسا کتاب اٹھا لے جاتے ہیں جسے میں حوالے کے لیے استعمال کر رہا ہوں اور ڈیڑھ دو مہینے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ کتاب کہاں گئی؟ اور شاعر کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ شعر کہتا ہی نہیں سناتا بھی ہے۔ یہ اس کا حق ہے جو چھینا نہیں جاسکتا، اس لیے اکثر جب مجھے کچھ سوچنے یا لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو مجھے اپنے شاعر دوست کی کوئی طویل نظم سننی پڑتی ہے یا میں انھیں داد دوں یا بتاؤں کہ میں نے داد کیوں نہ دی۔

"پھر اگر مکان کے گرد موت منڈلا رہی ہو تو لکھنے پڑھنے کا کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ میں جس مکان کی پہلی منزل کے دو کمروں میں رہتا ہوں وہ ایک اسپتال کی پشت پر ہے اور اسی اسپتال کی ملکیت ہے۔ عین میرے کمرے کے نیچے کا کمرہ مردہ خانہ ہے۔ جہاں سے اسپتال میں مرنے والوں کی لاشیں ان کے عزیز و اقارب کو دی جاتی ہیں۔ اسپتال بڑا ہے کبھی کبھی دو تین مرنے والے ایک ہی دن کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ ان کے عزیز و اقارب جمع ہوتے ہیں۔ لاش کفنائی جاتی ہے پھر ماتم کے ساتھ جنازہ اٹھتا ہے اور یہ شور ماتم کبھی دن میں بلند ہوتا ہے کبھی رات میں۔"

سردار جعفری کے مختصر ترین فلیٹ کی زیارت کا موقع مجھے 1976ء میں ملا جب میں ممبئی گئی ہوئی تھی اور انھوں نے مجھے چائے پر بلایا تھا۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی اور سلمیٰ بھابھی کے ساتھ جب میں ان کے فلیٹ میں داخل ہوئی تو اردو کے اس جید ادیب کے گھر کا رقبہ اور اس میں رہنے والوں کی تعداد دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ان دنوں وہ سہ ماہی "گفتگو" نکال رہے تھے اور دیر تک اسی کی باتیں کرتے رہے تھے اور اس کے کتابت شدہ صفحات دکھاتے رہے تھے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ "گفتگو" کا دفتر ہے، علی سردار جعفری اور سلطانہ جعفری کا گھر ہے، جس میں ان کی بہنیں بھی رہتی ہیں، جس میں دوستوں کی محفل جمتی ہے، انجمن ترقی پسند مصنفین سے متعلق معاملات طے ہوتے ہیں۔ اپنی تنگ دامانی کے باوجود سردار بھائی اور سلطانہ آپا کا گھر وہ وسعتیں رکھتا تھا جو کشادہ حویلیوں کے حصے میں بھی نہیں آتیں۔

سردار بھائی برصغیر کی اس خوش نصیب نسل سے تعلق رکھتے تھے جس نے جاگیرداری سماج میں آنکھ کھولنے کے باوجود ناانصافی پر مبنی اس سماج کو منہدم کرنے اور ایک

منصفانہ سماج کی تعمیر کے لیے جی جان سے کام کیا۔ ان کی طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" ایک جدید رزمیے کے طور پر اردو ادب میں یادگار رہے گی۔ صرف اس نظم پر ہی کیا منحصر ہے "لکھنؤ کی پانچ راتیں" ان کے شعری مجموعے، ان کا اقبال و غالب اور میر و کبیر کا مطالعہ، ان کی بنائی ہوئی ڈاکومنٹری فلمیں، ان کے ترتیب دیئے ہوئے رنگ و نور کے پروگرام سب ہی یادگار رہیں گے۔

وہ سجاد ظہیر، راج بہادر گوڑ، پی سی جوشی، فیض، رشید جہاں، سبط حسن، کیفی اعظمی کے گہرے دوست تھے تو پابلو نرودا، ناظم حکمت اور دوسرے غیر ملکی ادیبوں سے بھی ان کا یارانہ تھا۔ پابلو نرودا جن دنوں ہندوستان آئے، اس زمانے میں سردار جعفری کا اور ان کا جو گہرا تعلق رہا، اس کے بارے میں ان کی زبان سے پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ میں نے انھیں آخری بار اس وقت ٹیلی ویژن اسکرین پر دیکھا جب وہ بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری باجپائی کی لاہور آمد کے موقع پر گلوگیر آزاد میں اپنی نظم کے یہ مصرعے پڑھ رہے تھے کہ

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بر دوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

سردار جعفری کی وہ گلوگیر آواز خاموش ہو گئی ہے لیکن برصغیر میں امن کی بات کو آگے بڑھانے والے جب تک موجود ہیں، اس وقت تک سردار جعفری کا امن، دوستی اور انسانیت پرستی کا پیغام آگے سفر کرتا رہے گا۔

••

فضیل جعفری

علی سردار جعفری
چند ٹوٹے پھوٹے تاثرات اور کچھ شکستہ یادیں

ابھی اردو والوں کے دلوں میں ترقی پسند غزل کے سب سے بڑے شاعر مجروح سلطان پوری کی جدائی کا غم تازہ ہی تھا اور مجروح صاحب کی یاد میں منعقد ہونے والی تعزیتی نشستوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ترقی پسند تحریک و ادب کی مملکت کے آخری تاجدار، علی سردار جعفری نے بھی موت کی ناقابلِ تسخیر قوت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ بقول مرزا شوق:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

علی سردار جعفری اردو کی سب سے بڑی تحریک یعنی ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ہی نہیں تھے بلکہ اس کے اہم ترین نظریہ ساز بھی تھے۔ میں نے ان کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' کا شمار ابھی حال ہی میں زبیر رضوی کے رسالے ذہن جدید کے ''ادب پیما'' میں بیسویں صدی کی دس اہم ترین تنقیدی کتابوں میں کیا ہے۔

1960ء کے بعد جب حالات بدلے اور نئی نسل کے شاعروں اور ادیبوں نے ادب کو استالینی جبر اور پارٹی لائن کے دائرے سے نکال کر حقیقی تخلیقیت اور عصری حقائق کا آئینہ دار بنانے کی کاوش کی تو ترقی پسندوں کی اکثریت بوکھلا گئی۔ جدیدیت پر حملہ کرنے والوں میں سجاد ظہیر، پروفیسر احتشام حسین اور علی سردار جعفری پیش پیش تھے۔ جعفری صاحب نے چوں کہ عمر بھی طویل پائی اور وہ زبردست خطیبانہ صلاحیتوں کے بھی حامل تھے اس لیے وہ آخر تک محاذ پر ڈٹے رہے۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب جدیدیوں نے انھیں اور انھوں

پتہ: A-3/301 سیکٹر VIII، شانتی نگر، میرا روڈ، تھانے (مہاراشٹر)

نے جدیدیوں کو تسلیم کر لیا۔ ہاں محترمی معین احسن جذبی انھیں ضرور شاعر تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ جہاں تک خطیبانہ انداز کا سوال ہے یہ چیز تو انیسؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کے یہاں بھی بدرجہ اتم ملتی ہے۔ جعفری صاحب انھی سے متاثر تھے۔ یہ بھی واضح رہے کہ تمام تر خطابت کے باوجود انھوں نے "اودھ کی شام حسیں"، "نیند"، "پتھر کی دیوار"، "میرا سفر" جیسی نظمیں بھی لکھی ہیں جو اردو شاعری میں بے مثال ہیں اور یقینی طور سے اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر تاحال فیض احمد فیضؔ کے علاوہ کسی ترقی پسند شاعر کو وہ مقبولیت نصیب نہیں ہوئی جو ان کے حصے میں آئی۔ یہ صحیح ہے کہ سطحی قسم کے نیز جوڑ توڑ کرنے میں ماہر بعض افراد کی ریشہ دوانیوں کے سبب انھیں آخر تک ساہتیہ اکادمی ایوارڈ نہیں مل سکا، لیکن 1988ء کے گیان پیٹھ ایوارڈ نے ساری کسر پوری کر دی۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے ان کی جو پذیرائی کی، وہ اب تک کسی بھی زبان کے گیان پیٹھ انعام یافتہ شاعر اور ادیب کو نصیب نہیں ہو سکی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ 30/ اپریل 1999ء کو ہارورڈ فاؤنڈیشن (امریکہ) نے برصغیر میں قیام امن کی کوششوں کے لیے انھیں ایک خصوصی تقریب میں وہ اعزاز دیا جو ان سے پہلے ای۔ ایم فارسٹر، نیلسن منڈیلا، یاسر عرفات اور فیض احمد فیضؔ کو دیا گیا تھا۔

علی سردار جعفری کی زندگی میں ان پر ادبی نوعیت کے الزام بھی لگائے گئے اور سیاسی بھی۔ سیاسی الزامات میں ایک یہ بھی تھا کہ انھوں نے ایمرجنسی کی حمایت کی اور 'حرفِ حق' کے عنوان سے نظم بھی لکھی۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ اس وقت سی۔ پی۔ آئی کی یہی پالیسی تھی جو ہمارے نزدیک صحیح تھی۔ ایمرجنسی کے نفاذ کی حقیقی وجہ اندرا گاندھی کے خلاف الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس سنہا کا فیصلہ نہیں بلکہ یہ تھی کہ فاشسٹ طاقتیں اس فیصلے کو بہانہ بنا کر ملک سے جمہوریت کو ختم کرنے کے درپے تھیں۔ جہاں تک فنکار کا سوال ہے خوشونت سنگھ، ایم۔ ایف۔ حسین، راجندر سنگھ بیدی اور سیکندر علی وجد وغیرہ بھی ایمرجنسی کے حامیوں میں شامل تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ گالیاں زیادہ تر جعفری صاحب کو ہی دی گئیں۔

ادبی سطح پر علی سردار جعفری میں یقیناً کمزوری تھی کہ وہ انہی لوگوں کو آگے بڑھاتے تھے جنھیں وہ نظریاتی اعتبار سے اپنا ہمنوا سمجھتے تھے۔ لیکن کیا آج وہ بات نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آج کے ادبی دھنا سیٹھ جعفری صاحب کے مقابلے میں کہیں زیادہ تنگ نظر ہونے کے علاوہ ایذا پسند اور فتنہ پرور بھی واقع ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کے مقابلے میں علی سردار جعفری ایک وسیع القلب اور اعلیٰ ظرف انسان تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے اور بارہا دیکھا ہے کہ جو لوگ انھیں دن رات برا بھلا کہتے تھے وہی اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتے تو جعفری صاحب ان کی مدد کرنے والوں میں پیش پیش رہتے۔ مثال کے طور پر کئی سال پہلے جب ایک کاغذی 'سرکش' شاعر کو بیماری کے عالم میں بذریعہ ہوائی جہاز دہلی سے بمبئی لایا اور پھر ایرپورٹ سے سیدھا بابمبے اسپتال لے جایا گیا تو جعفری صاحب پہلے ہی اسپتال پہنچ چکے تھے۔ اسی طرح دو ضخیم جلدوں میں اردو کی بہترین کہانیوں کو مرتب کرنے والے اور خواجہ احمد عباس کے ایک سابق سکریٹری جناب وحید انور ہندوستان سے پاکستان تک جعفری صاحب کو گالیاں دیتے پھرتے تھے لیکن جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو جعفری صاحب نے ہی ان کی سب سے زیادہ مدد کی۔ اس کشادہ ذہنی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ کمیونسٹ ہونے کے باوجود ثقافتی اعتبار سے مذہبی آدمی تھے۔ غالباً 1994ء کی بات ہے۔ میں نے روزنامہ انقلاب کا جب ایک خصوصی عاشورہ ضمیمہ شائع کیا تو اس میں فیض احمد فیض کی "مرثیہ امام" نامی نظم بھی شامل کر لی۔ اسی دن جعفری صاحب کا فون آیا کہ فیض کربلا کی تاریخ سے واقف نہیں تھے، ان کی نظم میں متعدد تاریخی اور واقعاتی غلطیاں تھیں اور یہ کہ وہ ریکارڈ کو درست کرنے کی غرض سے ایک مضمون لکھ رہے ہیں۔ دوسرے ہی دن وہ اپنا تخلیقی مضمون لے کر بہ نفس نفیس دفتر انقلاب تشریف لائے۔ یہ مضمون ابھی تک انقلاب کے علاوہ شاید کہیں اور شائع نہیں ہوا ہے۔

میں 1975ء میں اورنگ آباد سے بمبئی منتقل ہوا۔ میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں کئی بار جعفری صاحب کو دیکھا اور سنا تھا لیکن ان سے پہلی ملاقات 1971ء میں ہوئی۔ بمبئی میں ٹی۔وی۔ سینٹر نیا نیا قائم ہوا تھا اور علی سردار جعفری ہر ہفتے دوردرشن پر "محفل یاراں" کے عنوان سے ایک پروگرام پیش کرتے تھے جو جعفری صاحب کی شخصیت اور ان کے انداز گفتگو کے سبب غیر اردو داں طبقے میں بھی کافی مقبول تھا۔ اس پروگرام میں ایک بار انھوں نے (غالباً اخترالایمان کی سفارش پر) مجھے بھی مدعو کیا۔ ترقی پسندی اور جدیت پر کھل کر بحث ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی بات چیت میں قائل ہونے یا قائل کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اس

پروگرام کا بھی یہی حشر ہوا، ہاں بات چیت کے دوران کوئی تلخی بھی پیدا نہیں ہوئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ممبئی میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب جمع تھے۔ تصدیق سہاروی مرحوم اور محمود چھاپرا مرحوم کی کوششوں سے ہر ماہ کسی نہ کسی کے گھر پر ایک نشست ہوا کرتی تھی۔ ان نشستوں میں راجندر سنگھ بیدی، اختر الایمان، مجروح سلطانپوری، جاں نثار اختر، باقر مہدی، ظ۔ انصاری اور ندا فاضلی وغیرہ پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کرشن چندر اور عصمت چغتائی بھی آجاتے تھے لیکن میری یادداشت کے مطابق جعفری صاحب کبھی شریک نہیں ہوئے۔ (ان نشستوں کی تمام تفصیلات تصدیق سہاروی کی کتاب ''بحث و تکرار'' اور یعقوب راہی کی کتاب ''بات سے بات چلے'' میں محفوظ ہیں) وہ تحریر و تقریر کے بادشاہ تھے لیکن مباحثوں سے کتراتے تھے۔ گزشتہ چار پانچ برسوں میں میری ان کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ آخری ملاقات 18/مارچ کو ہوئی۔ میرے ایک پرانے دوست جناب سمیع خطیب نے جوہو میں اپنے پرانے بنگلے کو منہدم کر کے نیا بنگلا بنوایا تھا۔ خطیب صاحب صنعت کار ہونے کے علاوہ تعلیمی معاملات میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ انجمن اسلام اور انجمن خیر الاسلام کے تحت چلنے والے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے ان کا قریبی تعلق ہے۔ انھوں نے اپنے نئے بنگلے کے سلسلے میں ایک تقریب منعقد کی۔ نچلی منزل کے ایک کمرے میں دلیپ کمار، ڈاکٹر رفیق زکریا، ڈاکٹر اسحق جمخانہ والا، عبدالرحمٰن انتولے، فخر الدین خورا کی والا، بیگم ہمائی پیر بھائی اور کئی دوسری اہم شخصیتیں موجود تھیں۔ میں لان میں کھڑا ہوا اپنے کچھ پرانے ساتھی اساتذہ کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے اطلاع دی کہ سردار جعفری بھی آئے ہوئے ہیں اور اسی کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ جاکر سلام کرلوں اور خیریت پوچھ لوں۔ اس وقت تک مجھے تو کیا کسی کو بھی ان کی بیماری کا اندازہ نہیں تھا۔ میں نے جاکر سلام کیا۔ انھوں نے صرف ہاتھ اٹھادیا۔ میں نے کہا کہ آپ کی سالگرہ کے دن گھر پر فون کیا تو معلوم ہوا کہ آپ حیدر آباد گئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ''حیدر آباد جانے کا خیال تھا لیکن گیا نہیں۔ میں بمبئی میں ہی تھا۔'' دراصل اس وقت تک ان کی یادداشت جواب دے چکی تھی کیوں کہ کچھ دنوں بعد بیگم سلطانہ جعفری نے بتایا کہ سردار جعفری اس دن واقعی حیدر آباد میں ہی تھے۔ سلطانہ بھابھی نے اپنے گھر پر اسی ملاقات کے دوران بتایا کہ جعفری صاحب بامبے اسپتال میں تھے۔ ان کے دماغ کے اگلے

دونوں حصوں میں ٹیومر کی تشخیص ہوئی تھی۔ وہ اب نہ کچھ بول سکتے تھے اور نہ ہی کسی کو پہچان پاتے تھے۔ بیگم جعفری نے یہ بھی بتایا کہ دماغ میں ٹیومر ہونے کے باوجود کسی کو ان کی بیماری کا اندازہ نہیں ہوا۔ انھوں نے کبھی سر درد کی بھی شکایت نہیں کی۔ ہاں ادھر چند ماہ سے وہ بہت کم گفتگو کرنے لگے تھے۔ اگر کبھی بولتے بھی تو ٹھہر ٹھہر کر اور بڑی دھیمی آواز میں۔ ان کی بیماری کا پتہ بہت بعد میں چلا۔ یہ جون 2000ء کی بات ہے۔

علی سردار جعفری مرحوم نے اپنی زندگی کا آخری مشاعرہ 22/اپریل کو نہرو سینٹر میں پڑھا۔ وہ اس قابل نہیں تھے کہ اسٹیج پر بیٹھ سکتے۔ انھیں اسٹیج کے نیچے ایک آرام دہ کرسی پر بٹھایا گیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم بھی تھیں۔ مشہور افسانہ نگار اور جوائنٹ انکم ٹیکس کمشنر سید محمد اشرف مشاعرے کی نظامت کر رہے تھے۔ میں نہ تو مشاعروں میں جاتا ہوں اور نہ ہی مجھے مدعو کیا جاتا ہے، لیکن میرے جو رفیق کار وہاں موجود تھے انھوں نے بتایا کہ اشرف کے بار بار درخواست کرنے کے باوجود جعفری صاحب چپ چاپ کرسی پر بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے پر قطعاً کوئی تاثر نہیں تھا۔ پھر ان کی کرسی کا رخ سامعین کی جانب کر دیا گیا۔ وہ اس وقت بھی خاموش رہے۔ دس پندرہ منٹ یوں ہی گزر گئے۔ سامعین بھی دم بخود تھے۔ اشرف اور سلطانہ بھابھی کے بار بار اصرار کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ "کوشش کرتا ہوں کہ کچھ یاد آجائے۔" پھر انھوں نے اپنی مشہور نظم 'میرا سفر' سنانی شروع کی اور آخر تک سنائی۔ سامعین نے ان کے اعزاز میں تالیاں بجانی شروع کیں تو یہ سلسلہ کوئی دس منٹ تک جاری رہا۔

اس کے بعد ہی وہ اسپتال داخل ہوئے۔ دو چار دنوں کے لیے گھر لوٹے لیکن پھر اسپتال میں انھیں دیکھنے کے لیے آخری بار سنیچر 29/جولائی کو بامبے اسپتال گیا۔ پتہ چلا کہ انھیں اسپتال کی نئی بلڈنگ کے بستر نمبر 1059 سے پرانی بلڈنگ کے Special ExecutiveICU کے بستر نمبر 378 پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ میں انھیں دیکھ کر بے حد افسردہ ہو گیا۔ ان کے وہ لمبے گھنے بال جو برسوں سے ان کی شخصیت کا حصہ تھے اور جن پر وقفے وقفے سے ہاتھ پھیرنا ان کی ایک خاص اور پرکشش شاعرانہ ادا بن چکی تھی تابکار شعاعوں کی وجہ سے بالکل صاف ہو چکے تھے۔ وہ بستر پر ہڈیوں کی ایک چھوٹی سی گٹھری بنے پڑے تھے۔ ناک اور منہ پر لگے ہوئے آکسیجن ماسک کی مدد سے صرف ان کی سانس چل رہی

تھی۔ اس وقت ایک لیڈی ڈاکٹر انھیں انجکشن دے رہی تھی۔ جب وہ کیبن سے باہر نکلی اور میں نے ان کی صحت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے دھیمے اور غمگین لہجے میں کہا کہ ''اب کوئی امید نہیں ہے۔''

یکم اگست کی صبح انھوں نے اپنا سفر مکمل کر لیا اور مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ پہلے یہ طے ہوا کہ انھیں اثنا عشری قبرستان 'رحمت آباد' میں دفن کیا جائے لیکن پھر بیگم سلطانہ جعفری کی خواہش کے احترام میں جوہو کے اسی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا جہاں ان کے کئی قریبی دوست، خواجہ احمد عباس، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، جان نثار اختر اور راہی معصوم رضا پہلے سے ہی زیرِ خاک آرام کر رہے ہیں۔ ان کی مشہور نظم 'میرا سفر' کے یہ مصرعے:

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زبان سے گاؤں گا

میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا

اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ انھیں زندگی اور اس کے بے پناہ نیز رنگا رنگ پہلوؤں سے ہی عشق نہیں بلکہ اپنے پسندیدہ شاعر مرزا غالبؔ کی طرح اپنی شہرتِ دوام کا بھی یقین تھا۔

●●

عبدالاحد ساز

سردار جعفری کی نظم نئے ہم عصر شعرا کی نظر میں

آج جب کہ ہماری اردو شاعری، جسے اب مابعد جدید بھی کہا جارہا ہے اور جسے صرف عصری شاعری کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، اپنے دائرہ سفر کی ایک بڑی قوس طے کر کے متوازن ہو چلی ہے۔ مسافت کے اس مرحلے پر یہ امر فطری بھی ہے اور ناگزیز بھی کہ ہم اپنے تمام ورثۂ فن کی جانب از سر نو توجہ مبذول کریں۔ روایت۔۔۔ اگر اسے محض کہنگی اور قدامت پرستی پر نہ محمول کرلیا جائے، تو ایک زندہ اور جاری وساری حقیقت ہے، جو عہد بہ عہد عمودی و افقی جہتوں میں بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہے اجتہاد و اختلاف خود اسی توسیع کی توانا شکلیں ہیں۔ البتہ انحراف برائے انحراف یا انکارِ محض ایک منفی عمل ہے جو زندگی کائنات اور آرٹ کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ حالانکہ یہ رکاوٹیں بھی کچھ دور اپنی سے مغالطہ انگیزی کے بعد آپ ہی کالعدم ہو جاتی ہیں۔ اس مطمع نظر کی رو سے وہ تمام شعری شہ پارے جو خواہ اساتذہ کی شاعری کی عطا ہوں یا ترقی پسند یا جدید شاعری کی دین ہوں، اگر مجموعی طور پر ہمارے احساس و آگہی، فنی معروضات، اسالیب و پیرایہ ہائے اظہار کے سرمائے میں اضافے کا حکم رکھتے ہیں، تو بہ سروچشم احترام کے لائق ہیں۔ انھیں کسی ایک نظریے یا دوسرے رجحان کی بنیاد پر رد کر دینا دیانت داری نہیں ہے۔

نظریات و رجحانات کی خانہ بندیوں سے قطع نظر ہمارے نئے ہم عصر شاعروں کے حلقے میں یہ سوالات اکثر سر ابھارتے رہتے ہیں کہ فی زمانہ اپنی شاعری پر ترقی پسند شاعری اور اس کے قریب قریب یا فوراً بعد کی جدید شاعری کا کتنا اور کہاں تک اثر ہے۔ تھوڑی سی بحث و گفتگو اور کچھ فروعی اختلاف رائے کے ساتھ ہم لوگ تقریباً اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر ترقی پسند شاعری کا وہ وجہ جو وقتی احتجاج، اور نظریے کے منصوبہ بند اور راست اظہار سے عبارت ہے، علیحدہ رکھا جائے، اور اسی طرح جدید شاعری کا وہ احاطہ جواز کار رفتہ تجریدیت، لایعنیت

اور ابہام سے پر ہے، الگ ٹھہرایا جائے، تو گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں کی شاعری کے افق پر ہمیں ترقی پسند تخلیقی شاہکار بھی اتنے ہی روشن نظر آتے ہیں، جتنے بعض جدید فنی شہ پارے۔ آخر ہم اپنے اس گراں قدر ورثے کو Disown کیوں کریں۔ اس سے دستبردار کیوں ہوں۔ اجتہاد و اختلاف کی راہیں تو بہر حال ہر دور میں کشادہ رہتی ہیں۔ جہاں تک نظمیہ شاعری کا تعلق ہے، ہم دوستوں کی توجہ ترقی پسند شاعری کے خصوص میں فیض اور سردار جعفری کی نظموں پر زیادہ مرکوز رہتی ہے۔

اگر ہم اپنے ابتدائی شعری مطالعات کو یاد کریں تو طالب علمی کے زمانے میں جو شاعری درسی کتابوں کے باہر پھیلی ہوئی تھی اور جو ہماری جذباتی و ذہنی نشو و نما اور ہمارے فکر و شعور کی ساخت و پرداخت کا حصہ بنی، ان میں ترقی پسند معاصرین کی نظموں کا ایک بڑا رقبہ تھا۔ واقعہ یہ ہے تو اس عہد کی شاعری اور ہماری بدلی ہوئی تخلیقی ترجیحات کے مابین جو اک رابطہ ہے، اس کے کئی تار سردار جعفری کی شاہکار نظموں نے آج تک مرتعش رکھے ہیں۔ اس ضمن میں یہ جذباتی پہلو بھی اہم ہے کہ جب ہم نے ابتدا میں سردار جعفری کی طویل نظم "ایشیا جاگ اٹھا" پڑھی تو اس نے ایک بڑا انہماک آفریں مطالعہ فراہم کیا تھا۔ خود ہمارے محسوسات کی شبابتیں ہم پر اُجاگر کی تھیں۔ ہمارے دائرہ نظر کو وسیع کیا تھا اور ہمارے ذوقِ جمال کی پرورش کی تھی۔ اس نظم کے کئی حصے دل و دماغ پر طاری رہتے تھے اور اب بھی ہیں۔ خصوصاً وہ حصے جس میں ایشیا کے محنت کش اور متوسط طبقے کے عوام کی کشاکشوں، آرزوؤں، شکستوں، خوابوں اور اُمیدوں کا بیان ایشیا کے قدرتی جمال کے پسِ منظر میں ہے اور ایسے خوب صورت مصرعے آتے ہیں۔ (کچھ درمیانی مصرعوں کی تخفیف کے ساتھ)

زمین۔ صدیوں پرانا چہرہ
کسان۔ صدیوں پرانے ہاتھوں میں اپنے لکڑی کے ہل سنبھالے
غریب مزدور، جلتی آنکھیں
اُچاٹ نیندوں کی تلخ راتیں
جہاز، ملاح، گیت، طوفاں
کمہار، لوہار، چاک، برتن
اُداس صحرا پیمبروں کی طرح سے گمبھیر

کھجور کے پیڑ بال کھولے
دفوں کی آواز، ڈھولکوں کی گمک
سمندر کے قہقہے، ناریل کے پیڑوں کی سرد آہیں
بلندیوں پر خفیف سا ارتعاش ہلکی سی راگنی کا
ہوا کے پیروں میں جیسے گھنگھرو بندھے ہوئے ہوں

پھر ہمارے شعوری و تخلیقی سفر، کے ساتھ ساتھ جعفری صاحب کی شاعری کا افق بھی ہم پر اجاگر ہوتا گیا اور کینوس بھی پھیلتا چلا گیا۔ ہم ان کے پہلے مجموعۂ کلام "پرواز" سے لے کر "نئی دنیا کو سلام" "پتھر کی دیوار" "خون کی لکیر" "امن کا ستارہ" "ایشیا جاگ اٹھا" "ایک خواب" اور "پیراہن شرر" "لہو پکارتا ہے" اور تا حال نئی نظموں تک برابر جعفری صاحب کا تعاقب کرتے چلے آرہے ہیں۔ یوں تو سردار جعفری کا بنیادی اسلوب نظم، زبان کی فصاحت اور روانی، الفاظ کی سیال دروبست، مصرعوں کی منضبط ترتیب، نظم آرائی کے خوب صورت قرینوں اور فنی و معنوی ہم آہنگی کی بنا پر دور ہی سے بہ آسانی پہچانا جاتا ہے، لیکن اس مرکزی اسلوب کے، اگر غور کریں تو دو واضح طور پر الگ حصے بھی ہیں، جن کا انقسام، لطف یہ کہ اسلوب کی مرکزیت کی نفی بھی نہیں کرتا۔ ہم نئے لکھنے والوں کو جعفری صاحب کے ساتھ جس زاویے سے اُنسیت اور رابط و رغبت کا احساس زیادہ ہوتا ہے، وہ ان کے اسلوب کا دوسرا خانہ ہے۔ پہلا خانہ تو وہ ہے جس میں ان کا اسلوب فارسی لفظیات و تراکیب سے مزین ہے، اور جس میں روایتی شاعری کے مسلمات بڑی عمدگی کے ساتھ انقلابی و عصری معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں اس لب و لہجے میں وہ اپنی انفرادی شباہتوں کے ساتھ انیسؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کے قبیل کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ اس اسلوب کا ہم احترام ضرور کرتے ہیں مگر دور سے ایک طالب علم کی طرح۔ خود اپنے شاعر ہونے کی حیثیت میں یہ ہمارے تخلیقی لمحوں میں، جذبوں، سوچوں اور فنی کشاکشوں میں ہمارا ساتھ نہیں دیتا، دوسرا خانہ وہ ہے، جس کے در و دیوار اور گوشے ہمیں بڑے مانوس اور اپنے سے لگتے ہیں۔ یہاں الفاظ میں ایک دھیما سا بہاؤ، نرم سُبک تیزی اور سہانا پن ہے۔ فارسی تراکیب اور مسلماتِ سخن کے بجائے بالکل تازہ اور اچھوتی امیجری سے اظہار کا کام لیا گیا ہے۔ نظموں کی دروبست اور ہیئت میں ایک غنائی اثر آفرینی ہے اور مصرعوں کی نشست میں ایک عجیب سی

اضطراری نغمگی۔ مفاہیم کی رو سے بھی یہ نظمیں ہمیں اپنی عصری فضا میں رچی بسی اور گھلی ملی معلوم ہوتی ہیں۔

یہ دونوں پیرایہ ہائے اظہار جعفری صاحب کے کلام میں آغاز ہی سے ملتے ہیں۔ ابتدا تو یقیناً روایتی آب و رنگ میں ہی ہوئی تھی، مگر بہت جلد ہی انھوں نے مؤخر الذکر اسلوب بھی اپنا لیا تھا۔ چناں چہ ''پتھر کی دیوار'' کی زیادہ تر نظمیں ''ایشیا جاگ اُٹھا'' اور ''نئی دنیا کو سلام'' ہمیں اسی اسلوب میں ملتی ہیں۔ ''پتھر کی دیوار'' سے نظم ''اردو کی خاکِ حسیں'' کا یہ خوب صورت اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

یہ سیدھے سادے غریب انسان نیکیوں کے مجسمے ہیں
یہ محنتوں کے خدا، یہ تخلیق کے پیمبر
جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں
لہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے
صراحیاں رقص کر رہی ہیں
سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے چولھوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں

طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' بھی اسی اسلوب نگارش میں ڈرامائی انداز، تمثیلی کردار نگاری اور ہیئت اور بحور کی تبدیلیوں کے ساتھ ایک بھرپور جدید نظم کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس کے تمہیدی حصے کے چند اشعار دیکھیے، جس میں ایک الم ناک اور سنگین عہد کو پابند نظم کے فارم میں مگر جدید معنوی کنائے کے ساتھ کس بلیغ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

سیہ چراغ، سیہ روشنی، سیاہ لویں
سیاہ گھر میں سیاہ جال سا بچھائے ہوئے
سیاہ کیڑوں کی مانند رینگتی مخلوق
سیاہ بھوت اندھیرے میں بلبلائے ہوئے
نشاں سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے
سیہ نشاط کی بدمستیاں چرائے ہوئے
سیاہ رنگ کے ساحر سیہ لبادوں میں
سیہ حصار سیہ تیوریاں چڑھائے ہوئے

اس کے بعد کی شاعری میں کافی عرصے تک اول الذکر یعنی فارسی آمیز رنگ زیادہ ہے، لیکن دوسرا پیرایہ بھی خاص حد تک متوازی خطوط پر کھنچتا چلا آتا ہے، خصوصاً "ایک خواب اور" کی نظموں میں ان دونوں رویوں کو متبادل تواتر کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔ پہلے اوّل رویے کی دو مثالیں دیکھیے ۔

مژدہ ہو مہہ جبینانِ افلاک کو　　بزمِ گیتی کا صاحبِ نظر آگیا
تہنیت حسن کو بے نقابی کی دو　　دیدہ ور آگیا، پردہ در آگیا
بزمِ سیارگانِ فلک سیر میں　　اِک ہنر مند سیارہ گر آگیا　　(نظم: سرِ طور)

گاہ غرورِ تاجدار، گاہ شکستِ شہریار
گاہ سرورِ اہلِ دل، گاہ شعورِ دست کار
گاہ طلسمِ رنگ و بو، گاہ فریبِ چشمِ یار
گاہ فروغِ جلوۂ ماہ وشاں ہے زندگی　　(نظم: زندگی)

اور اب اس دوسرے رویے کی مثالیں جو ہمیں زیادہ محبوب ہے ۔

خاموش ہیں یہ خاموشی سے سو بربط و چنگ بناتے ہیں
تاروں میں راگ سلاتے ہیں، طبلوں میں بول چھپاتے ہیں
جب ساز میں جنبش ہوتی ہے، تب ہاتھ ہمارے گاتے ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو　　(نظم: ہاتھوں کا ترانہ)

جنگلوں میں وہی آوارہ ہوا گاتی ہے
کسی بھٹکے ہوئے رہ رو کی صدا آتی ہے
کشتیاں خوش ہیں سمندر کی گزرگاہوں سے
تیرے ساحل بھی جواں رہتے ہیں ملاحوں سے
تیری محرابیں بھی تہذیب کی انگڑائی ہیں
تیری آغوش میں بھی دہلی و شنگھائی ہیں　　(نظم: مشرق و مغرب)

"پیراہن شرر" اور "لہو پکارتا ہے" میں بھی اسالیب کا یہی متبادل التزام ہے، اگرچہ ان مجموعوں میں جعفری صاحب اپنے فارسی آمیز اسلوب کی طرف زیادہ رجوع ہوتے ہیں۔ البتہ ادھر جو تازہ نظمیں ہیں، جو ابھی کسی کتابی شکل میں یکجا نہیں ہوئیں، جو ہم نے

رسائل میں پڑھی ہیں یا مشاعروں اور نشستوں میں براہ راست جعفری صاحب سے سنی ہیں، ان میں سے بیشتر میں ان کا وہی خوب صورت اسلوب ایک کشش کے ساتھ لوٹ آیا ہے۔ اس خصوص میں نظم "آبلہ پا" "کربلا" طویل سوانحی نظم "نومبر...... میرا گہوارہ" اور چند ایک نظموں کی نشاں دہی کی جاسکتی ہے۔ نظم "کربلا" کا ایک بند ملاحظہ ہو:

یہ مدرسے، دانش کدے علم و ہنر کے میکدے
ان میں کہاں سے آگئے یہ کرگسوں کے گھونسلے
یہ جہل کی پرچھائیاں لیتی ہوئی انگڑائیاں
دانش ورانِ بے یقیں غیروں کے دفتر کے امیں
الفاظ کے خواجہ سرا ان کے تصرف میں نہیں
خونِ حیات جاوداں برہم ہے ان سے رنگِ گل
آزردہ ہے بادِ صبا اے کربلا اے کربلا!

کسی بھی اہم شاعر کو پڑھنے کا ادعا اس کے افکار، نظریات یا موضوعات ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ ادعا پیدا تب ہی ہوتا ہے جب اس کا کلام ادب کے نمائندہ قاری کو پہلی قرأت میں اپنا سکے اور باندھ سکے۔ یہ معاملہ طرز ادایا کرافٹ کا ہے۔ یہاں اظہار اور مدعا کی ثنویت کی بحث چھیڑنا مقصود نہیں۔ ظاہر ہے الفاظ و معنی کا رشتہ بدن اور پیراہن کا نہیں بلکہ جسم و روح کا ہوتا ہے۔ فن پارہ اس وقت ہی ظہور میں آتا ہے، جب "کیا کہا گیا" اور "کیسا کہا گیا" ایک دوسرے کے ساتھ محض ایک آمیزے کی شکل میں یکجا نہ ہوں، بلکہ ایک ہی تخلیقی تجربے کے سیال مرکب میں ڈھل جائیں۔ سردار جعفری اظہار کے اس کیمیاوی عمل میں اکثر کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے لطیف ذوقِ جمال اور نفیس غنائی شعور کی بنا پر ترسیل کی اک ایسی فریکوینسی Frequency اخذ کر لیتے ہیں، جو شاعر کے قلم سے قاری کے دل و دماغ تک تنے ہوئے غیر مرئی تاروں کو مرتعش کر دیتی ہے۔ ان مرتعش لہریوں میں وہ اپنے پورے ڈرافٹ کے ساتھ قرأت یا سماعت میں جذب ہونے لگتی ہیں۔ ان نظموں میں ایک خاص فضا کاری کا بھی احساس ہوتا ہے، جو شاید اپنے عہد کے ادراک، تاریخی و تہذیبی شعور، اطراف و اکناف کے گہرے مشاہدے، وسعتِ نگاہ، مطالعہ و فکر، مظاہر فطرت سے حظ اندوز ہونے والی طبیعت اور اس طرح کے کئی دیگر علائق کے ساتھ ہشت پہلوی جمالیاتی ارتباط

سے مل جل کر بنتی ہو۔ ظاہر ہے یہ فضائیں تو غیر مرئی ہے، لیکن اگر ہم سردار جعفری کی نظموں کے مجموعی تاثر کو ایک محویت میں سوچیں تو ذہن میں چند لمحوں کے لیے کچھ Visuals سے ابھر آتے ہیں۔ جس طرح فیض کی شعری فضا کو یک لخت سوچتے ہوئے ذہن میں، شہر کی اداس شام، فصیل، در و بام، چاندنی، گدازِ شب اور مغموم و دلگیر حسن کا ماحول ابھر آتا ہے، اسی طرح سردار جعفری کی نظمیں ہمارے تحت الشعور میں آسمان کی پیلاہٹوں، چڑھتے ہوئے دن، دور تک پھیلے ہوئے سمندر کے ساحل، لہلاتے ہوئے کھیت اور آفتاب کی سنہری شعاعوں کی چمکیلی و فضا کا کیف پیدا کرتی ہیں۔ ان نظموں سے ہم جو اک قربت اور Intimacy محسوس کرتے ہیں، اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ ان میں موضوع اور مفہوم بس اوقات ایک صوتی و سمعی ضابطہ آرائی اور بصری و حسی پیکر تراشی ہی کے تحت کھلتا اور کھلتا اور اپنے جمالیاتی پس منظر ہی میں پنپتا اور پھیلتا ہے۔ فکر کی تابندگی اور جذبے کی حرارت حسی و بصری کیف کے ساتھ گھل مل کر ہی سرشار کرتی ہے۔ ایسی امیجری کی مثالیں ان کی شاعری میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔ مثال کے طور پر

تری کتاب رخ جواں پر
کہ جو غزل کی کتاب ہے اب
زمانہ لکھے گا اک کہانی
اور ان گنت جھریوں کے اندر
میری محبت کے سارے بوسے
ہزار لب بن کے ہنس پڑیں گے

(نظم: حسین تر)

جاڑوں کی ہوائیں دامن میں
جب بادِ خزاں کو لائیں گی
رہرو کے جواں قدموں کے تلے
سوکھے ہوئے پتوں سے میرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی

(نظم: میرا سفر)

چاند کے کٹورے سے چاندنی چھلکتی ہے
جہل کی فضاؤں میں پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گرکر دودھ جذب ہوجائے
روشنی کے گالوں پر تیرگی کے ناخن کی
سینکڑوں خراشیں ہیں! (نظم: پتھر کی دیوار)

معرکتہ آلارا طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" کے پانچویں حصے میں نیند کے حسی کیف کو بحر کے آرٹسٹک برتاؤ اور لفظوں کے دھیمے دھیمے بہاؤ کے ساتھ شاعر نے اس طرح اُبھارا ہے کہ اک غنودگی کا سا عمل طاری ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

نیند ہے اک حسینہ
سرمئی آنکھیں ہیں، نیلگوں اس کا سینہ
اس کی پلکوں کے سائے میں خوابوں کی مدہوش پرچھائیاں کھیلتی ہیں
وہ غریبوں کی دلدار، دکھیوں کی غم خوار ہے
اور فرق مراتب سے بیزار ہے
رات کو آتی ہے
تھپکیاں دے کے سارے جہاں کو سلا جاتی ہے
بچوں کو لوریاں دیتی ہے
پھولوں کو پیار کرتی ہے اور سارے عالم پہ جادو بھری انگلیوں سے
چھڑکتی ہے شبنم!

جیسا کہ اس مضمون کے ابتدائی حصے میں عرض کیا گیا، اگر سردار جعفری کی نظم کو، اسلوب کے دونوں حصوں اور ان کے ذیلی لہجوں کو ملا کر، بیک نظر دیکھا جائے، تو یہ ہماری نسل کی شاعری سے، کہیں دعوت کا، کہیں کشش کا، کہیں درس کا، کہیں ہم کلامی کا اور کہیں سرگوشی کا واسطہ رکھتی ہے۔ ہمارے نئے ہم عصر شعرا کے قریب ڈھائی تین دہائیوں کے تخلیقی سفر کے بعض مقامات پر جعفری صاحب کے قدموں کی چاپ، کہیں کہسار میں گونجتی ہوئی صدا کی طرح اور کہیں زیرِ سنگ خنک پانیوں کے چشمے کے ترنم کی طرح سنائی دیتی ہے۔ اُن کے نظریات سے اتفاق یا اختلاف کی بات دوسری ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ فنی

و شعری سطح پر، احساس و آگہی کی رو سے، ادبی وژن کے ضمن میں، علم و خیر کی وسعتوں اور ذوقِ جمال کی لطافتوں کے باب میں ہم جعفری صاحب کی شاعری کے ساتھ بھی Grow ہوئے ہیں۔ان کی پرانی نظموں سے نئی نظموں تک ہمیں باور ہوا ہے کہ یہ شاعری صرف اپنے عہد کے حصار میں گھٹ کر رہ جانے والی نہیں بلکہ آئندہ زمانوں کی کھلی فضا میں پرواز کرنے والی، آنے والی نسلوں کے شعر و ادب پر اپنے سائے دراز اور اپنی کرنیں مرکوز کرنے والی، اور اردو شعریات کی پیشانی پر اپنی نگاہوں کا عکس چھوڑ جانے والی شاعری ہے۔زندگی کی بشارتوں کے نقیب اور ادب کی زندہ روایتوں کے امین سردار جعفری اپنے جذبوں کی شدتیں اور اپنے افکار کی وسعتیں اپنی جمیل نظموں کے روپ میں اپنے پڑھنے والوں کی نذر کر کے اگرچہ آج ہماری محفل سے جا چکے ہیں اور ہم ان کی دید اور ان سے مصافحے کی مسرت و سعادت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکے ہیں، مگر ان کی نظموں سے ہمارا اور یہ مکالمہ بدستور جاری ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، اور جعفری صاحب کے ہمارے درمیان شخصی طور پر موجود نہ ہونے کا خلا گہرا ہوتا جائے گا، ویسے ویسے ہی مگر ان کی نظموں کے ساتھ ہمارے تازہ مکالموں کے امکانات بھی روشن ہوتے چلے جائیں گے۔خود جعفری صاحب ہی کے ان مصرعوں کے مصداق کہ

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

●●

کنول نین پرواز

علی سردار جعفری

ترقی پسند تحریک کا ایک "فقیر" یا ایک مردِ مجاہد!

علی سردار جعفری کا نام لیتے ہی اردو ادب کی ایک بہت بڑی تحریک "ترقی پسند تحریک" ایک کہکشاں کی طرح ہماری نظروں کے سامنے لہرانے لگتی ہے...... اور ترقی پسندی کے بارے میں سوچتے ہوئے خود ان کی اپنی زندگی، ذاتی اور ادبی ان دونوں کے وہ پہلو بھی ہماری نظروں میں جھلملانے لگتے ہیں، جنھوں نے پچھلی صدی کی کئی دہائیوں میں ہمارے ادب میں ایک گوناگوں گلفشانی پیدا کی ہے۔

وہ ایک سیاسی کارکن تھے، مفکر اور دانشور تھے، ڈرامہ نگار تھے، افسانہ نویس تھے، فلم ساز تھے، اور رسالوں کے مدیر تھے، اور سب سے بڑھ کر ایک بہت بڑے شاعر، اور ان سے بڑھ کر ایک بہت بڑے انسان...... ایک ایسے انسان جن کی رگوں میں زندگی اور ادب کی خوشگوار اور ترقی پسند قدروں کا خون دوڑتا تھا۔ ان کی زندگی کی کہانی لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا کیونکہ کسی کہانی، ناول یا ڈرامے کا آغاز، درمیان اور اختتام تو ہو سکتا ہے، لیکن یہ ایک ایسی شخصیت کی کہانی ہے، جو نسل در نسل جاری رہے گی۔

۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں جس ترقی پسند تحریک کا احیاء ہوا تھا، اس وقت کی چند بڑی بڑی ادبی ہستیوں، منشی پریم چند، سجاد ظہیر، ڈاکٹر ملک راج آنند، سروجنی نائیڈو اور حسرت موہانی کے ساتھ جو دوسرے چھوٹے یا بڑے ادیب موجود تھے ان میں سردار جعفری ایک ایسی شخصیت ہیں، جو نئی دنیا کو سلام کرتے ہوئے ترقی پسندی کی شاہراہ پر ایک جانباز سپاہی کی طرح روانہ ہوئے، اور دیکھتے ہی دیکھتے "نظم گوئی" میں تو وہ میرِ کارواں بن ہی گئے لیکن ادب اور زندگی کی جن اعلیٰ اور بلند قدروں کا انھوں نے پرچم اُٹھایا تھا، اس کے حوالے سے آج

پتہ : B-42۔ نیو میونسپل کالونی، گوونڈی (ویسٹ) دیونار، ممبئی۔ 400043

ان کا شمار اس تحریک کے سالاروں میں ہوتا ہے۔

اور پھر پچھلی صدی کی چوتھی دہائی تک یہ تحریک اپنے عروج تک پہنچی، اور اسے ہمارے ادب میں نشاۃ الثانیہ Renaissence کا جو درجہ حاصل ہے، اس میں سردار جعفری جیسے لکھنے والوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

اور اسی چوتھی دہائی کے آخر تک ہندوستان میں جگہ جگہ جو ترقی پسند مصنفین کی انجمنیں قائم ہو رہی تھیں، ان میں ممبئی کی انجمن کا ایک خاص مقام ہے۔ ہمارے اردو ادب کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر اس وقت ممبئی میں سکونت اختیار کر رہے تھے۔ ریڈیو، تھیٹر اور فلم انڈسٹری سے اپنا رابطہ قائم کر چکے تھے، اور ان ادیبوں کی ممبئی میں موجودگی نے اس انجمن کو ایک ''روشنی کے مینار'' کی سی حیثیت سے دی تھی۔

اسی زمانے میں میری سردار جعفری سے چند مختصر سی ملاقاتیں رہیں۔ اسی دور سے وہ میرے محسن بھی تھے کہ ۱۹۴۷ء کے آخر میں میرے سرینگر سے ممبئی پہنچنے پر انھوں نے انجمن کی ایک بہت اہم مجلس میں میرا بڑے بڑے ادیبوں سے تعارف بھی کرایا۔ ان ملاقاتوں میں مجھے ان کی شخصیت کے اس پہلو کا مظاہرہ بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ جسے ہم لکھنؤ کی ایک مخصوص تہذیب کا نام دیتے ہیں۔

ترقی پسند انجمن ممبئی کی اس مجلس میں ہی ان کی اپنے ایک ہم خیال، ہم نظریہ اور ہم نوالہ، ہم پیالہ، دوست اور بڑے ناقد ظ۔ انصاری سے جو بحث ہوئی...... یا پھر چند برس ہوئے لندن کی ایک تقریب میں، جہاں وہ مہمان خصوصی تھے، یہاں کے ایک اہم شاعر نے (جن کا نام لینا شاید مناسب نہ ہو) اپنا مقالہ پڑھنے سے پہلے، جعفری صاحب سے اپنے اختلافات کی ایک کہانی شروع کر دی، یا اُن کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے دہلی کے دور درشن پر مجھے ان کا ایک انٹرویو دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ انٹرویو انگریزی کے ادیب جو ایک Grand Proava Catear تصور کیے جاتے ہیں اور جن کا نام لینا شاید مناسب ہوگا، یعنی سردار خشونت سنگھ...... نے لیا تھا اور وہ بار بار، سردار جعفری کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں کہہ رہے تھے، جس کی وجہ سے جعفری صاحب بار بار ان سے کہتے۔ ''میں نے ایسا نہیں کہا ہے۔ یہ آپ کے الفاظ ہیں۔''

ان سب مواقع پر سردار جعفری نے جس تحمل اور خوش اسلوبی کا ثبوت دیا، وہ ان کی اسی لکھنؤ کی تہذیب کی ہی دین تھی، کہ انھوں نے اپنی شائستگی کے دامن کو تار تار نہیں ہونے دیا۔

اور یہ بھی سنی سنائی نہیں، بلکہ لکھی لکھائی بات ہے کہ وفات سے چند روز پہلے، وہ بستر میں ٹیک لگاتے، آس پاس کے ماحول سے بے خبر، غالباً ایک Semi-Coma کی حالت میں ہی تھے...... ایک کتاب پر نظریں جمائے رہتے تھے، اور ایسی ہی حالت میں انسانیت کی خوشگواری کا ''ایک اور خواب'' دیکھتے ہوئے ہمیں الوداع کہہ گئے۔

یہ بھی تین چار برس پہلے کی بات ہے۔ لندن کی فیض کلچرل اکیڈمی اور اردو سنٹر کی طرف سے ان کے اعزاز میں دیے گئے ایک جلسے میں، میں نے انھیں تقریباً پینتالیس برس میں پہلی بار دیکھا۔ تقریب کے اختتام پر، جب میں اسٹیج پر ان کے قریب گیا اور اپنا تعارف کرانا چاہا تو بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولے۔ ''میں آپ کو جانتا ہوں۔ میں آپ کو جانتا ہوں۔''

انسانیت اور ساری دنیا کے بے بس اور مجبور عوام کے لیے ایک خوشگوار زندگی کے خواب دیکھنے والا یہ مہامنش اور ترقی پسند قدروں کا رسیا، جیسے ہم سب کو جانتا تھا۔

وہ ''فقیرانہ'' نہیں آئے تھے، بلکہ ایک مردِ مجاہد کی طرح آئے تھے، لیکن ان کے باطن میں ''فقیروں'' کی سب خوبیاں تھیں، کیونکہ وہ زندگی بھر انسانیت کے لیے ایک خوشگوار زندگی اور امن دوستی کی ''صدائیں'' اور ''دعائیں'' دیتے ہوئے ہم سب سے رخصت ہوئے۔

ذاتی طور پر ان سے میری ملاقاتیں بہت مختصر سی تھیں لیکن ان کی خوشگوار باتیں، میری زندگی کے خاموش، اکیلے اور اداس لمحوں میں مجھے آگے بڑھنے کا دلاسہ دیتی رہیں گی۔

●●

محمد ایوب واقف

مکاتیب علی سردار جعفری

چند سال قبل میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا کہ میں علی سردار جعفری کے خطوط کا مجموعہ ترتیب دوں۔ اس خیال کے پیشِ نظر میں نے اردو کے مشہور و مقبول ہفتہ وار جریدہ ''ہماری زبان'' میں ایک مراسلہ بھیجا۔ مراسلہ شائع ہوا تو علی سردار جعفری کے تحریر کردہ بہت سے خطوط مجھے موصول ہوئے۔ جعفری صاحب نے تقریباً پچیس یا تیس خطوط مجھے بھی وقتاً فوقتاً لکھے تھے۔ اس طرح کل خطوط کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہو گئی۔ اس دوران جعفری صاحب سے بھی ان کے خطوط کے تعلق سے وقتاً فوقتاً ان کے گھر پر میری بات چیت ہوئی۔ انھوں نے مجھے کہا کہ ماضی میں انھوں نے اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، جوش ملیح آبادی وغیرہ کو بہت سارے خطوط لکھے ہیں۔ ان خطوط کی نقلیں انھوں نے سنبھال کر پیٹی میں رکھ چھوڑی ہیں لہٰذا وہ خطوط بھی شامل کر لیے جائیں تو بہتر ہیں۔ میں نے بار بار جعفری صاحب سے ان خطوط کا مطالبہ کیا لیکن افسوس کہ ان کی عدیم لفرصتی نے میرے اس کام کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔

اب جب کہ جعفری صاحب کا انتقال ہو چکا ہے تو میں نے سوچا کیوں نہ ان دستیاب خطوط کی بنیاد پر سردار جعفری صاحب کی خطوط نگاری پر ایک مبسوط مقالہ قلمبند کر دوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک مستحسن کام ہو گا کیونکہ کسی بڑی ادبی شخصیت کا احاطہ محض کسی ادبی رسالے کا خصوصی نمبر یا کوئی کتاب شائع کر دینے سے ممکن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے خطوط پر مشتمل کوئی تفصیلی تحریر شامل نہ کی جائے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اعلیٰ درجے کی شاعری بھی کی اور نثری کتابیں بھی یادگار چھوڑیں لیکن ان کے خطوط نے ان کی شخصیت میں جس طرح چار چاند لگائے اس کا نہ تو کوئی جواب ہے اور نہ کوئی مثال۔ ان کے خطوط کا چربہ اتارنے کی کوششیں بھی کم نہیں کی گئیں لیکن خطوطِ غالب کی آراستگی (Purfling) کا

اہتمام تو کسی سے نہ ہو سکا البتہ خطوطِ غالب کی پیروی (Conformance) کے نام پر تمسخر انگیز یا مضحک (Quizzical) صورت حال ضرور دیکھنے میں آئی۔

واقعہ یہ ہے کہ مرزا کے البیلے اور ساحرانہ خطوط نے ہی اردو ادب میں خطوط نگاری کو مخصوص نثری صنف کی حیثیت سے استحکام بخشا۔ غالب سے پہلے خطوط نویسی کو یہ مرتبہ حاصل نہ ہو سکا۔ عہد غالب سے آج تک غالب کے خطوط اپنے اسلوب، جدت اور اردو نثر کے نمونے کی حیثیت سے تمام اردو نصابات میں شامل ہوتے ہیں۔ آج جب کوئی قد آور اور معتبر ادیب یا شاعر ہمارے درمیان سے اٹھتا ہے تو اس کے تحریر کردہ خطوط کی چھان بین شروع ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ گذشتہ پچاس سال کے دوران خطوط کے اتنے مجموعے شائع ہو چکے ہیں کہ ان کا شمار آسان نہیں۔ مرزا غالب کے بعد جس بڑے ادیب اور دانشور کے خطوط نے ہلچل پیدا کی وہ نام ابوالکلام آزاد ہے۔ جی ہاں، "غبار خاطر" میں مولانا ابوالکلام آزاد کے جو خطوط شامل ہیں ان میں علم کی گہرائی بھی ہے اور تفکر کا بحر بیکراں بھی۔ تحریر کی شادابی و شگفتگی بھی ہے اور تجربات اور مشاہدات کا دلآویز منظر نامہ بھی۔ "غبار خاطر" کے علاوہ بھی مولانا کے خطوط کے دوسرے مجموعے خطوط کے سرمائے میں محفوظ ہیں، جنہیں مولانا غلام رسول مہر اور ابو سلمان شاہجہاں پوری وغیرہ نے ترتیب دیے ہیں۔ یہ تو اردو ادب کی دو بڑی عبقری (Genius) شخصیتوں کی بات تھی ورنہ خطوط تو دوسرے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے بھی محفوظ ہیں۔ خطوطِ شبلی اور خطوطِ اقبال کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اگر کسی شخص کی ذاتی زندگی کے نشیب و فراز کو پوری سچائی کے ساتھ سمجھنا ہے اور سمجھ کر نتیجے تک پہنچنا ہے تو پھر اس کے تحریر کردہ خطوط کو پورے غور و انہماک سے پڑھنا از حد ضروری ہے۔ خطوط ایک ایسا ذریعہ ہیں جن کے توسط سے خطوط لکھنے والے کی روزمرہ کی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے چھوٹے بڑے واقعات سے آگاہی حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان کی زندگی محض خوشیوں کا ہی مرقع نہیں اس میں تلخیاں، کرب، جھنجھلاہٹ، ذہنی انتشار اور کرخت اور درشت لمحات بھی اپنا بھرپور رول ادا کرتے ہیں۔ اسی لیے ایک ہی شخص کے کسی خط میں اگر آپ کے ہنسنے اور مسکرانے کے لیے وارفتگی اور والہانہ پن کا منظر نامہ میسر آ سکتا ہے تو دوسرے خط سے اشکِ جگر سوز کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ غرضیکہ کسی

شخص کے خطوط اس کی زندگی کا صاف و شفاف اور بے داغ آئینہ ہوتے ہیں اور اس آئینے میں خطوط لکھنے والے کی لمحے لمحے کی زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے بڑے واقعات و حادثات سے رونما ہونے والی کیفیات کی نظارگی کی جاسکتی ہے۔

علی سردار جعفری بھی پہلے انسان تھے اس کے بعد ادیب اور شاعر، بہ حیثیت ایک انسان کے ان کی زندگی بھی خوشیوں اور غموں کی آماجگاہ تھی۔ احساسات اور جذبات سے ان کی زندگی بھی عبارت تھی۔ معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے رشتوں اور ناتوں کی مضبوط ڈوری سے وہ بھی بندھے ہوئے تھے۔ ماں باپ، بھائی بہن، بیوی، بچے، احباب و اعزہ اور ادب کے تعلق سے ہمہ گیر روابط کا پاس و لحاظ انھیں بھی تھا۔ ظاہر ہے ان سماجی، تہذیبی معاشرتی اور خاندانی رشتوں کے نام پر انھوں نے سیکڑوں اور ہزاروں خطوط لکھے ہوں گے۔ ایک انسان کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں سب سے بڑا اور فی الفور (Forthwith) مقام اس کی رفیقۂ حیات یعنی بیوی کا ہوا کرتا ہے۔ سلطانہ آپا کے ساتھ علی سردار جعفری کی شادی 1946ء میں ہوئی۔ سردار جعفری اور سلطانہ جعفری کے درمیان شوہر اور بیوی کا خوشگوار رشتہ تقریباً ترپن برسوں پر محیط ہے۔ اس درمیان سردار جعفری نے سلطانہ جعفری کے نام یقینی طور پر بہت سے خطوط لکھے ہوں گے۔ بیوی کے نام جعفری صاحب کے کچھ خطوط اس وقت کی یادگار ہیں جب وہ جیل میں تھے۔ یہ خطوط اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت ہی اہم ہیں۔ ان خطوط میں بیوی کے لیے ایک ذمہ دار اور وفا شعار شوہر کا انمول پیار تو جھلکتا ہی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وقت کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی رموز و نکات کے ساتھ ساتھ ادبی و شعری سرگرمیوں کا احوال بھی بیان ہوا ہے۔ یہاں سردار جعفری کے صرف دو خطوں کے اقتباسات پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جعفری صاحب نے اپنی اہلیہ سلطانہ جعفری کے نام یہ پیارے خطوط 1949ء میں جیل سے لکھے ہیں۔

"......اب تک ہم نے پیار و محبت کی جتنی باتیں کی ہیں میرے اور تمہارے سوا ان کا سننے والا اور کوئی نہیں تھا، کیوں کہ یہ لمحے صرف اپنے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی اور شریک نہیں ہوتا۔ لیکن آج میرے اور تمہارے درمیان صرف جیل کی دیواریں اور سیکڑوں میل کا فاصلہ ہی نہیں ہے بلکہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو میرے اور تمہارے خطوں کو پڑھیں گے۔ یہ خیال بڑا تکلیف دہ ہے اور اس خیال کے آتے ہی قلم رک جاتا ہے، اور دل اپنی باتیں چھپا لیتے

پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ محبت کی پاکیزگی اور پیار کی نزاکت اور لطافت اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ میاں اور بیوی کے خطوط انتہائی معصوم ہوتے ہیں۔ ان کی معصومیت ذرا سے میں زخمی ہو جاتی ہے۔ لیکن آج جب ساری انسانیت کے روح اور دل زخمی ہیں ہماری محبت بھی زخمی ہو گئی ہے، اور ہمیں یہ زخم کسی نہ کسی طرح برداشت کرنا پڑیں گے۔ خواہ اس میں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ مجھے کس جرم میں پکڑ کر جیل میں بند کر دیا گیا ہے، لیکن اب یہ سوچتا ہوں کہ یہ جرم ہی کیا کم ہے کہ میں محبت کو پاکیزہ اور پیار کو لطیف چیز سمجھتا ہوں اور انسانیت کے روح اور دل کے زخمی ہونے پر ماتم کر رہا ہوں۔ اس سماج میں جس میں ہم رہ رہے ہیں انسانیت کے بارے میں کچھ سوچنا بھی گناہ ہے، اور اس گناہ کی سزا یہی ہے کہ ہماری زندگی قید خانے کی نذر کر دی جائے۔ ہم سے پہلے دنیا کے ہزاروں ادیبوں اور شاعروں کو قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑی ہیں اس لیے ہم اس سے کیسے بچ سکتے ہیں۔"

علی سردار جعفری صحیح معنوں میں بڑے دانشور، بڑے مفکر اور فلسفیانہ بساط اور مقدرت رکھنے والے ادیب و شاعر تھے۔ ان کا ذہن مریضانہ جذباتیت کا شکار کسی بھی حالت میں نہیں ہوا۔ شادی کے چار پانچ سال بعد ہی جب انھیں گرفتار کر کے ناسک جیل بھیج دیا گیا تو جیل کی مضبوط چہار دیواری کے اندر بیٹھ کر انھوں نے اپنی شریک حیات کی جدائی کو ذہن پر مسلط نہیں ہونے دیا۔ جدائی کو محسوس تو کیا لیکن جدائی کے بے پناہ غم کے بار کو زندگی کی فلسفیانہ گدگدی (Titillation) سے کس طرح ہلکا کیا یہ دیکھنے اور سمجھنے کی چیز ہے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ یہ خط بھی سردار جعفری نے ناسک سنٹرل جیل سے لکھا تھا۔

"...... آج ہم یونانی آرٹ، یونانی دیوتاؤں اور دیویوں کے مجسموں یا یونانی شاعری سے اس لیے لطف اندوز ہوتے ہیں کہ ان میں انسانی شعور کے بچپن کے حسن کا اظہار ہے۔ یہ حسن آج پیدا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس حسن کے پیدا کرنے کے لیے وہی موضوع (Content) ضروری ہے، جو یونان کے آرٹ میں ہے۔ اس (Content) کی بنیاد یہ ہے کہ انسان فطرت کے عمل کو نہیں سمجھتا۔ اس لیے ہر چیز کو انسانی خصوصیات عطا کر کے دیوتا اور دیوی بنا دیتا ہے۔ بچے بھی یہی کرتے ہیں۔ وہ اپنی گڑیوں کو کھانا کھلاتے ہیں، نہلاتے ہیں، کپڑے پہناتے ہیں اور سلاتے ہیں، اور گڑیوں کی ابتدا یونان کے اسی دور میں جادو سے ہوتی ہے۔ آج اگر کوئی بڑا آدمی (مثلاً تم یا میں) گڑیوں سے بچوں کی طرح کھیلنے لگے تو لوگ اسے

بیوقوف کہیں گے۔ یونان میں جس زمانے میں اس کا کلاسکی آرٹ پیدا ہوا تو بچوں کے بجائے بوڑھی عورتیں گڑیوں سے کھیلتی تھیں۔ یہ گڑیاں بھی دیویوں اور دیوتاؤں کی شکلیں تھیں جن کے ذریعے جوان ہونے والی لڑکیوں کو زندگی کے اسرار و رموز سمجھائے جاتے تھے، اور پھر وہ ان گڑیوں کے گرد ناچتی تھیں، اور بڑے خوبصورت گیت گاتی تھیں۔ یہ ایک طرح کا جادو کا عمل تھا جسے انسان کے ذہنی بچپن نے ایجاد کیا تھا۔ آج ہم اس ذہنی بچپن کی طرف واپس نہیں جاسکتے، کیوں کہ آج جادو کی جگہ سائنس نے لے لی ہے۔"

یہ بات میں مضمون کے شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ چند سال قبل میں نے علی سردار جعفری کے خطوط کے جمع اور ترتیب کا کام شروع کیا تھا، اور اس تعلق سے ہفت روزہ جریدہ "ہماری زبان" میں ایک مراسلہ بھی شائع کروایا تھا تاکہ جن اصحاب کے پاس جعفری صاحب کے خطوط محفوظ ہوں وہ راقم الحروف کے پاس جلد از جلد ارسال کر دیں۔ اس دوران جعفری صاحب نے مجھے ایک خاص بات یہ بتائی کہ اگرچہ انھوں نے اہل قلم، اہل علم وادب اور احباب کو بے شمار خطوط لکھے ہیں لیکن اکثر احباب ان خطوط کو منظر عام پر لانے سے کترائیں گے۔ میں نے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ اپنے اکثر خطوط میں انھوں نے کسی نہ کسی ادبی وشعری نقطۂ نظر یا کسی نہ کسی امر کی غلط اور قابلِ اعتراض تاویل یا توجیح و تشریح پر لوگوں کو ٹوکا ہے اور ازراہ خلوص و محبت صحیح رخ اور مثبت رویہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اور ہوا بھی یہی کہ جتنا اشتراک اس سلسلے میں اس خاکسار کو ملنا چاہیے تھا نہیں ملا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں بسنے والے بے شمار ادیبوں اور شاعروں میں سب سے زیادہ تعاون و اشتراک مجھے اردو کے صفِ اول کے محقق اور نقاد جناب گوپی چند نارنگ صاحب سے ملا۔ نارنگ صاحب نے علی سردار جعفری کے پینتیس خطوط بھیجے اور وعدہ کیا کہ وہ مزید خطوط روانہ کریں گے۔ سردار جعفری صاحب نے گوپی چند نارنگ کے نام جو خط لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے جعفری صاحب کے خطوط کے اہم نکات کا علم ہوتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ اس امر کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ علمی وادبی امور میں گوپی چند نارنگ کی آراء کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ چاہے وہ "جشن اقبال" تیاری کا معاملہ ہو یا انیس پر سیمینار کی بات۔ ان کی کسی نظم کے ترجمے کا مسئلہ ہو یا کسی مجموعہ کلام کی اشاعت کا سوال۔ ان تمام امور پر سردار جعفری صاحب گوپی چند نارنگ سے مشورے ضرور کرتے تھے۔ جعفری صاحب کی یہ بڑی

خوبی تھی کہ وہ دوسروں کے یہاں اگر کوئی خوبی یا لائقِ ستائش بات دیکھتے تھے تو اس کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ علاوہ ازایں وہ اپنے اکثر معاملات میں اپنے احباب کی آراء اور مشوروں پر دھیان بھی دیتے تھے۔ 2/ دسمبر 1966ء کو انھوں نے گوپی چند نارنگ کے نام ایک خوبصورت اور دلچسپ خط لکھا تھا۔ اس خط میں جعفری صاحب نے اپنی ایک نظم کے انگریزی ترجمے کی طرف نارنگ صاحب کی توجہ مبذول کرائی ہے اور کچھ دوسری نظموں کے ترجموں کے سلسلے میں ان سے فرمائش بھی کی ہیں۔ خط ملاحظہ فرمائیں۔

برادرم نارنگ صاحب! تسلیم

مبارک باد کا شکریہ۔ لیکن آپ نے جن الفاظ میں مبارک باد دی ہے اس کے لیے شکریے کے لفظ کہاں سے لاؤں۔

میں 13/ یا 14/ دسمبر کو دہلی آؤں گا اور نمبر 2 پٹودی ہاؤس نئی دہلی میں قیام کروں گا۔ آپ 15 اور 20 دسمبر کے درمیان کوئی بھی شام سمپوزیم کے لیے وقت طے کر سکتے ہیں۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔

میری نظم ''کون دشمن ہے'' کا ایک انگریزی ترجمہ بمبئی کے ایک انگریزی اخبار ''بھارت جیوتی'' میں شائع ہو چکا ہے غالباً 19/ ستمبر کا پرچہ تھا۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے گا۔ میں ترجمے سے مطمئن نہیں ہوں۔ ایک اور ترجمہ قرۃ العین نے کیا ہے جو میرے پاس ہے، میں اس سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔ میں دونوں ترجموں کی نقلیں آپ کے پاس بھیج دوں گا ایک نظر ڈال لیجیے گا۔ اگر آپ اور آپ کے انگریز اسکالر دوست ''صبح فردا'' اور ''ہمارے نام'' کا بھی ترجمہ کر دیں۔ تو میں شکر گذار ہوں گا۔ یہ نظمیں آپ کے پاس کہاں ہوں گی۔ ویسے چھپ چکی ہیں۔ میں خود حاضر کر دوں گا۔

میرا یہ مجموعہ جس میں یہ نظمیں شامل ہیں۔ ''پیراہن شرر'' کے نام سے شائع ہو رہا ہے، اور امید ہے کہ آخر دسمبر تک آجائے گا۔

امید ہے مزاج بخیر ہو گا

آپ کا

سردار جعفری

علی سردار جعفری کے مطالعہ کی وسعت اور گیرائی اور گہرائی کا اعتراف سبھی کرتے

تھے۔ انھوں نے صرف اردو شعر و ادب کا ہی عمیق مطالعہ نہیں کیا تھا بلکہ عالمی ادب پر بھی ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ادب کے علاوہ مذہبیات، سیاسیات، عمرانیات، سماجیات اور اقتصادیات سے متعلق امور میں بھی وہ درک رکھتے تھے۔ ان کے مطالعہ اور حافظہ کا زور (Puissance) واقعتاً اپنے آپ میں بے نظیر تھا۔ اس کے باوجود اپنے بعض احباب کے ذخیرۂ معلومات سے استفادہ کرنے سے وہ چوکتے نہیں تھے۔ ان کے ایسے احباب میں بلاشبہ گوپی چند نارنگ شامل تھے۔ میرے پاس گوپی چند نارنگ کے نام جعفری صاحب کے جتنے بھی خطوط ہیں ان کی بنیاد پر میں یہ بات بلا جھجھک کہہ سکتا ہوں کہ اکثر اوقات علی سردار جعفری بعض اہم مسئلے پر ان سے رازدارانہ اور خفیہ (Stealthy) معالمت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں جعفری صاحب کا ایک خط جسے انھوں نے نارنگ صاحب کو 1975ء میں لکھا تھا بڑی معنویت رکھتا ہے۔ خط ملاحظہ فرمائیں:

برادرم نارنگ صاحب۔ تسلیم

کیا آپ ایک عنایت کریں گے میرے لیے تین چار صفحات میں ترقی پسند ادب[1] پر ایک چھوٹا سا مضمون لکھ کر بھیج دیجئے۔ اس سے مراد میری کتاب[2] نہیں ہے بلکہ وہ ادب ہے جو گذشتہ چالیس سال میں لکھنؤ کانفرنس کے بعد تخلیق ہوا ہے۔ اس میں چند نمائندہ ادیبوں اور شعراؤں کے نام بھی تحریر کر دیجیے۔ میں اس موضوع پر ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ اس میں آپ کی نگاہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ یہ آپ کی مصروفیت میں مداخلتِ بیجا ہے۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ وسط دسمبر میں دہلی کی طرف گزر ہوگا اس وقت ملاقات ہونی چاہیے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ اپنی بیگم صاحبہ کی خدمت میں میرا آداب کہیے۔

آپ کا
سردار جعفری

---

[1] اس ادب کی خوبیوں کے ساتھ اگر آپ اس کی چند کوتاہیاں بھی بیان کر دیں تو مضائقہ نہیں ہے آپ کا خط صرف میرے لیے ہوگا۔ جعفری

[2] سردار جعفری کی نثری کتاب "ترقی پسند ادب"

جعفری صاحب کے بارے میں ایک بات یہ بھی بہت وثوق سے کہی جاتی ہے کہ وہ قوت ارادی کے بہت مضبوط انسان تھے۔ یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے لیکن انسان تو بہر حال انسان ہے۔ مضبوط سے مضبوط ارادے اور عزم کا انسان بھی کبھی کبھار خوف اور وسوسے کا شکار ہو جاتا ہے۔ علی سردار جعفری بھی خوف اور وسوسے کے ان متشدد لمحات سے گزرے تھے۔ ان کی زندگی کے اس پہلو کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ایک خط کا اقتباس دیکھتے چلیے۔ یہ خط بھی انھوں نے گوپی چند نارنگ کو ہی لکھا ہے۔

برادرم تسلیم

آپ کا لفافہ مل گیا تھا۔ یہ خبر صحیح ہے کہ میں کچھ بیمار تھا۔ اب بالکل اچھا ہوں۔ کام کر رہا ہوں۔ جواب نہ دینے کا باعث بیماری سے زیادہ ذہنی کاہلی تھی۔ جو راگ کا زہر کھا کھا کر پیدا ہو جاتی ہے۔ دل کی ایک دوا برسوں سے کھا رہا تھا۔ بہت دنوں سے اس فکر میں تھا کہ اس کو ترک کر دوں لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ یکایک دوا بازار سے غائب ہو گئی اور ترک درماں کی ہمت اس طرح پیدا ہو گئی۔ اب محسوس ہو رہا ہے کہ اس دوا کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

آپ کا

سردار جعفری

جس زمانے میں اپنی مستقل تصنیف "علی سردار جعفری شخصیت اور شاعری" مکمل کرنے میں مصروف تھا اکثر امور، خاص طور سے اختلافی اور بحث طلب معاملات کی وضاحت اور صراحت کے سلسلے میں جعفری صاحب سے یا تو ٹیلیفون پر گفتگو کرتا تھا یا پھر انھیں خطوط لکھتا تھا۔ جعفری صاحب میرے ہر سوال کا جواب فوراً مرحمت فرمایا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے دور اول میں یا یوں کہیے کہ بالکل شروع میں ایک نظم بعنوان "بغاوت" لکھی تھی۔ جعفری کی یہ نظم ان کے اولین شعری مجموعہ "پرواز" میں شامل ہے۔ اس نظم میں انھوں نے رسم چنگیزی، تہذیب تتاری، جبر و استبداد، سرمایہ داری اور وہم کی پابندیوں وغیرہ سے بغاوت کی تو سمجھ میں آیا، لیکن جب ان سماجی اور تہذیبی بیماریوں اور برائیوں کے ساتھ انھوں نے خدا سے بغاوت کا اعلان کیا تو ان کی بغاوت صرف دھوکہ اور فریب (Deceit) بن کر رہ گئی۔ میں نے جب جعفری صاحب سے ان کی اس نظم کی ابتری اور بے ترتیبی

(Promiscuity) پر اظہار افسوس کیا تو انھوں نے اپنی اس بے لگام اور سرکش تخلیق کو ہرزہ سرائی تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو تائیدی (Justificatory) خط مجھے لکھا اسے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا مناسب ہوگا۔ خط یوں ہے۔

"انسان کو چینے والی مشیت کے خلاف بغاوت سے صرف یہ مراد ہے کہ دنیا میں انسانوں کی طبقاتی تقسیم اور انسان پر انسان کا ظلم مشیتِ خداوندی نہیں ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ امیر اور غریب خدا نے پیدا کیے ہیں وہ مذہب کو مسخ کرتے ہیں اس لیے میں نے زرگری کے مسخ مذہب سے بغاوت کی بات کی ہے۔ زرگری کے معنی فریب ہیں، دولت پیدا کرنا نہیں۔ اس لیے میں نے جب "مسخ مذہب" الفاظ استعمال کیے تو اس سے مراد مذہب نہیں بلکہ مذہب کی غلط تاویل ہے۔ نظم کا پہلا شعر غالبؔ کے اس مصرعے کی نئی تشریح ہے "آں کس کے شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نہ کرد" یہ بات بھی اہم ہے کہ میں نے خدا کا لفظ استعمال کیا ہے اللہ نہیں کہا ہے۔

وحدانیت ہر پیغمبر کا مسلک اور پیام رہا ہے، اور قرآنِ کریم کے مطابق دنیا کی کوئی قوم اور کوئی عہد بغیر پیغمبر کے نہیں ہے۔ اس لیے اقبالؔ نے گوتم بدھ کا شمار پیغمبروں میں کیا ہے، اور ان کا نام زرتشت، حضرت عیسیٰ اور رسولِ کریمؐ کے نام کے ساتھ لیا ہے۔ (جاوید نامہ) اور گوتم بدھ کی بغاوت دیویوں اور دیوتاؤں کے تمدن سے تھی۔ حتیٰ کہ گوتم کے یہاں خدا کا تصور نہیں ہے۔ پھر بھی اقبالؔ نے ان کا شمار پیغمبروں میں کیا ہے۔ اسی لیے دیویوں اور دیوتاؤں کے تمدن سے بغاوت والے شعر کے بعد وہم کی پابندیوں اور قیدِ ملت سے بغاوت کی بات آئی ہے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کے تمدن نے انسان کو قوموں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ وحدانیت کے تصور نے پہلی بار انسان کا تصور عطا کیا ہے۔"

ترقی پسند مصنفین اور شعراء کے بارے میں عام طور سے یہ خیال ظاہر کیا جارہا ہے کہ انھوں نے عریانی اور فحاشی کا بازار گرم کر کے اختلالِ حواس پیدا کیا ہے۔ علی سردار جعفری مرحوم سے جب میں نے اس سلسلے میں وضاحت طلب کی تو انھوں نے اپنے ایک خط میں مجھے صاف صاف بتایا۔ اس خط کا ایک اقتباس بھی یہاں دینا افادیت سے خالی نہیں ہوگا۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"کسی ترقی پسند شاعر کے یہاں عریانی اور فحاشی نہیں ہے فیضؔ، مخدومؔ، مجازؔ، جذبیؔ،

کیفی، ساحر، مجروح اور احمد ندیم قاسمی کا کلام ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ فاشی ترقی پسند شاعروں کے ہم عصر بعض دوسرے شعراء کے یہاں ملتی ہے۔ جیسے میر اجی۔ ان کا ترقی پسند تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

میں نے علی سردار جعفری کے تقریباً ڈیڑھ سو خطوط کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ اس چھوٹے سے مقالے میں ان کے ہر خط سے اقتباسات پیش نہیں کیے جا سکتے تھے۔ ضرورت کے مطابق محض چند خطوط کے اقتباسات یا پھر کہیں کسی پورے خط کے استعمال پر اکتفا کر لیا گیا ہے۔ جعفری صاحب کے خطوط کے عمیق اور بالاستیعاب مطالعہ کے بعد جو نتائج میرے ذہن نے اخذ کیے وہ نتائج امید و بیم کی کیفیات سے مبرا نہیں۔ یہ خطوط تصنع کی آلائش سے سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے۔ سادگی اور صفائی، برجستگی و بے تکلفی اور شگفتگی و شیریں گفتاری ان خطوط کی وہ خوبیاں ہیں جو بدرجہ غائب محسوس کی جا سکتی ہیں۔ جعفری صاحب کے خطوط کے سرمائے میں جس نوعیت کے جو خطوط ہیں اسی نہج اور حساب سے ان خطوط میں زبان اور الفاظ و تراکیب کے درجات پائے جاتے ہیں۔ ابھی تک ناقدین شعر و ادب نے مرحوم علی سردار جعفری کی شاعرانہ فتوحات اور تحقیقی و تنقیدی تصنیفات و تالیفات سے متعلق ہی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن اب جب کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے تو ایسی صورت میں ان کے خطوط کی تلاش ہوگی۔ ظاہر ہے انھوں نے جن لوگوں کو خطوط لکھے ہیں ان خوش قسمت لوگوں میں سے بہت سے اصحاب تو اب اس عالم فانی میں موجود نہیں ہوں گے لیکن ایسے اہل قلم اردو اہل دانش و بینش حضرات آج بھی برصغیر ہند و پاک میں بڑی تعداد میں موجود ہوں گے جنہیں جعفری صاحب نے خطوط لکھے۔ اگر یہ تمام خطوط فراخدلی کے ساتھ انجمن ترقی اردو ہند کے محافظ خانے (Archive) میں جمع کرا دیتے ہیں تو اردو خطوط کے سرمائے میں یک کافی بڑا اور وقیع اضافہ ہو جائے گا، دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ علی سردار جعفری کی خطوط نگاری پر جو لوگ کچھ لکھنا چاہیں گے ان کے لیے آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تک جعفری مرحوم کے خطوط پر کوئی مقالہ سپرد قلم نہیں کیا گیا ہے۔ راقم کی اس سلسلے میں یہ اولین کوشش ہے۔ اگر علمی و ادبی دنیا میں اس حقیر کوشش کو شرف قبولیت بخشا گیا تو یہ مستوجب اور مسعود بات ہوگی۔

علی سردار جعفری

کی زمانہ

طالب علمی

کی تخلیقات

اور

ایک مضمون "آخری دور" کا

علی سردار جعفری

پچھمی

کارخانوں کی لمبی اور بھدی چمنیوں سے دھواں مزدوروں کی آہوں کی طرح باہر آرہا تھا اور چاروں طرف جلی ہوئی راکھ کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ شہر کا وہ حصہ تھا جو مزدوروں اور صرف مزدوروں سے آباد تھا۔ مجھے ایک کارخانہ میں پندرہ روپیہ کی ایک اسامی مل گئی تھی اس لیے میں بھی یہیں رہتا تھا۔ یہاں مکانوں کا کرایہ نسبتاً کم تھا جو میری لمبی اور خالی جیب کے لیے خاص طور سے موزوں تھا۔ اس کے علاوہ جس کارخانے میں میں کام کرتا تھا وہ بھی قریب تھا۔

مجھے شروع شروع میں یہاں بڑی تکلیف ہوئی۔ اسکول اور کالج کی گذری ہوئی زندگی اپنے ہولناک ویرانوں سے میرا تعاقب کر رہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ ایک ایک اینٹ کی پتلی پتلی سیلی ہوئی دیواروں اور نیچی نیچی ٹوٹی ہوئی چھتوں کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں کے اندر رہنے والے اس دھوئیں اور بو کو کیسے برداشت کرتے ہیں، جو مضر صحت ہونے کے علاوہ بالائی طبقہ کے معطر تنفس کی گندگی کا بھی باعث ہے۔ لیکن کچھ دن بعد میں بھی اس کا عادی ہو گیا۔

مزدور اس دھوئیں اور بو کے عادی ہی نہیں تھے بلکہ دن بھر اسی میں گھٹ گھٹ کر کام بھی کرتے تھے اور شام کو اپنی پھٹی ہوئی جیبوں میں چند پیسے بجاتے ہوئے خوش خوش ان کوٹھریوں کی طرف چلے جاتے تھے جو دور سے بالکل مرغیوں کے ڈربے معلوم ہوتی تھیں اور ان میں خدا کی بھوکی اور ننگی مخلوق آباد تھی۔ لیکن وہاں پہنچ کر انھیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ پیسے ایک آدمی کا بھی پیٹ نہیں بھر سکتے۔ بھوک سے بلکتے اور ماں کے ڈر سے بسورتے ہوئے بچوں کی مرجھائی ہوئی غریب زدہ صورتیں، چھوٹی سی تاریک اور گندی کوٹھری جو ایک روشن دان سے بھی محروم تھی اور چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی نوجوان بیوی، جب یہ سب

چیزیں ایک ساتھ ان کی نگاہوں کے سامنے آتی تھیں تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتے تھے۔
لیکن جب وہ اس بغاوت کے انجام کو یاد کرتے جو کئی سال پہلے انھیں کارخانوں کے مزدوروں نے کی تھی، تو صرف ایک آہ کر کے خاموش ہو جاتے تھے۔ بھوکے بچوں کو ڈانٹ کر سلادیتے تھے۔ بیویوں کی شکایت آمیز باتوں کو سمجھا بجھا کر محبت آمیز باتوں میں تبدیل کر دیتے تھے اور کوٹھریوں کی ٹوٹی ہوئی چھتوں کو نظر انداز کرنے کے لیے دن بھر کی تھکن کا بہانہ کر کے آنکھیں بند کر لیتے تھے۔

جس کارخانہ میں میں کام کرتا تھا اسی میں ایک بوڑھی عورت بھی کام کرتی تھی۔ گو اس کی عمر اب ڈھل چکی تھی لیکن اس کا چہرا اور چھریرا جسم اب بھی اس حسن کا راز فاش کر رہا تھا جو عالم شباب میں انتہائی فتنہ انگیز ثابت ہوا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جو بڑھاپے کی وجہ سے اندر دھنس گئی تھیں، لمبے سفید بال جو دھوپ میں چاندی کے تاروں کی طرح چمکتے تھے اور باریک ہونٹ جو اس کے پوپلے منہ پر صرف دو جھریاں معلوم ہوتے تھے۔ یہ سب اس کے عہد شباب کی مٹی ہوئی تصویریں تھیں۔

وہ جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ کارخانے کے مالک نے ترس کھا کر اسے اپنے ہاں ایک معمولی سے کام پر رکھ لیا تھا لیکن وہ اس سے کچھ اور کام لینا چاہتا تھا جس کے لیے عصمت مآب بچھی تیار نہیں تھی۔ شباب کی وہ تمام رنگینیاں اس میں موجود تھیں جو ایک عورت کی حشر انگیز تباہیوں کا باعث ہو سکتی ہیں اور اس کے حسن کو گناہوں کی لطیف ترین آلودگیوں کی آغوش میں سونپ سکتی ہیں۔ لیکن کارخانے کے مالک اور اس کی وہ تمام قوتیں جو اسے سرمایہ کے بدولت حاصل ہوئی تھیں بچھی کے استقلال کی مضبوط دیواروں کو نہ ہلا سکیں۔ کارخانے کے مالک نے اسے دولت کے سنہرے خواب اور مستقبل قریب میں آنے والے عیش و عشرت کے سبز باغ دکھائے، پھر اس کے برخلاف اس ہولناک زندگی کا تصور پیش کیا جو کارخانے کے باہر بچھی کی منتظر تھی۔ اس نے کہا کہ اگر بچھی اس کی خواہشات کی تکمیل نہیں کر سکتی تو کارخانے کے آہنی پھاٹک اسے ہمیشہ کے لیے باہر دھکیل دیں گے۔ لیکن بچھی نے سرمایہ کی مادی قوتوں کی پروا کیے بغیر اس شراب کا ایک قطرہ بھی ضائع کرنے سے انکار کر دیا جو قدرت نے اس کے شباب کے پیمانے میں بھر دی تھی۔

جب خواہشات کی شکست ہونے لگتی ہے تو گناہوں کی فتح ہوتی ہے اور جب

مکاریوں کا اثر زائل ہونے لگتا ہے تو جبر کے مندر سے تشدد کا خوفناک دیوتا ابروؤں پر بل ڈال کر باہر آجاتا ہے۔ آخر ظلم کے ہاتھوں نے غریب بچھی کو اس حجلۂ عشرت تک پہنچادیا جہاں گناہوں کے فانوس میں ارتکاب جرم کی شمعیں جل رہی تھیں، جہاں سے کلیاں پھولوں کی شکل میں اور پھول بکھری ہوئی پنکھڑیوں کی صورت میں باہر آتے تھے۔ اس شبستانِ عشرت میں حسن کے بیسیوں گلدستے اور شباب کے سیکڑوں شیرازے بکھر چکے اور ہزاروں دوشیزائیں سسک سسک کر دم توڑ چکی تھیں۔ یہاں بچھی کا بھی تشنہ کام شباب زہر آلود جاموں سے سیراب کیا گیا اور سرمایہ کی چوکھٹ پر غربت اور بے بسی کی ناقابل قبول قربانی چڑھادی گئی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے ہنگامے معمولی معمولی باتوں کی آغوش میں پروان چڑھتے ہیں۔ صبح یہ خبر کارخانے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ کی طرح پھیل گئی کہ بچھی کی بیوگی بھی غربت کے ساتھ سرمائے کی بھاری چکی میں پیس ڈالی گئی۔

ظلم کا خرمن برسوں سے جمع تھا اس میں صرف ایک چنگاری کی ضرورت تھی جو بدنصیب بچھی کے زخمی پہلو سے نکل کر کارخانے تک پہنچ گئی۔ رات بھر داد عشرت دینے والا مالک صبح اپنے زرین خواب کی بھیانک تعبیر دیکھ رہا تھا۔

مزدور حسب معمول خاموشی سے کارخانے کے اندر چلے گئے اور آہنی پھاٹک سے سنتری کو باہر دھکیل کر دروازہ بند کردیا۔ اب کارخانہ اور اس کا دفتر سب کچھ ان لوگوں کے رحم اور کرم کے ہاتھ میں تھا جو کبھی خود رحم اور کرم کے محتاج تھے۔

جس وقت یہ خبر کارخانہ کے مالک کو معلوم ہوئی تو اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہ عجیب قسم کی ہڑتال تھی۔ اس کی مکاریوں اور ابلہ فریبیوں کے ترکش کا کوئی تیر ایسا نہ تھا جو اس نے استعمال نہ کیا ہو لیکن مزدوروں کے انتقام کے فولادی سینے پر ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔

آج برسوں کی پرانی شکایتیں پیش کی جارہی تھیں۔ مدفون داستانیں دوبارہ اپنے حجلۂ عافیت سے باہر آرہی تھیں۔ کارخانے کا مالک مزدوروں کی تمام شرائط پوری کرنے کے لیے تیار تھا مگر ایک شرط ایسی تھی جو اس کے وقار کے نازک آبگینہ کے لیے کسی وزنی پتھر سے کم نہ تھی۔ وہ بیوہ بچھی سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔ اس میں تو اس کی عزت و آبرو کا سوال تھا جو بے چاری بچھی کی پُر شباب زندگی سے بھی زیادہ قیمتی تھی۔

صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی لیکن معاملہ کسی طرح طے نہ ہوا بلکہ اس کا اثر دوسرے کارخانوں پر بھی پڑا، اور رات تک اُن میں بھی مزدوروں کی حکومت تھی۔ وہ مشینیں جن کے پرزوں میں مزدوروں کے پسینہ نے تیل دیا تھا آج بالکل خاموش تھیں اور وہ مالک جو اس وقت کسی کلب میں بیٹھے ہوئے شراب پیا کرتے تھے کارخانوں کے سامنے سڑک پر ان معتوب مزدوروں کی طرح کھڑے ہوئے تھے جنھیں اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔

رات کو نو بجے تک مسلح پولس اور فوج آ گئی۔ یہ سرمایہ داری کا آخری حربہ تھا۔ لیکن قلعہ بند مزدوروں پر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ کارخانوں کے بڑے بڑے پھاٹک توڑ دیے جائیں اور بندوقوں کی گولیاں باغی مزدوروں کو باہر نکال دیں۔

مزدوروں نے خطرے کا اندازہ عین وقت پر کر لیا لیکن اپنے کو ظلم اور استبداد کے آہنی پنجوں میں سونپنے کے بجائے آگ کے شعلوں کے سپرد کر دینے کا ارادہ کر لیا۔

یکایک ایک کارخانے میں آگ کے ساتھ مزدوروں کا ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا جو کسی طرح دردانگیز آہوں سے کم نہ تھا۔ پھر کیا تھا، ایک کارخانے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں آگ لگ گئی اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مزدور اندر ہی اندر جل کر مر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اب جو کارخانے یہاں کام کر رہے ہیں انھیں کی راکھ کے ڈھیر پر بنائے گئے ہیں۔

میں اس قصہ کو یہاں آنے سے پہلے ہی سن چکا تھا لیکن اس کی تفصیل مجھے ایک بوڑھے مزدور بدلو سے معلوم ہوئی جو اس کارخانے میں پچیس برس سے کام کر رہا تھا اور اب بوڑھی بچھی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بچھی اس روز دن بھر کارخانے کے مالک ہی کے گھر رہی اور وہ خود بیمار تھا ورنہ آج اس کی زندگی بھی خاک کا ایک ڈھیر ہوتی۔

"لیکن کیا ان مزدوروں میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا جو کارخانے کے اندر بند تھے؟" میں نے پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ "صرف چالیس پچاس مزدور ایسے تھے جو شعلوں کی تاب نہ لا کر باہر نکل آئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو بندوق کی گولیوں کی نذر ہو گئے اور کچھ بھاگ گئے۔"

اس کے بعد مجھے بچھی کو دیکھنے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا۔ مجھے اس کے بڑھاپے کی آڑ میں سے اس کا شباب جھلکتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ کارخانوں کی لمبی اور بھدی چمنیوں سے دھواں مزدوروں کی آہوں کی طرح باہر آرہا تھا اور چاروں طرف جلی ہوئی راکھ کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ایک صبح کا ذکر ہے۔ جاڑہ کڑاکے کا پڑ رہا تھا اور کہر نے سورج کی تیز روشنی کو دھندلا کر دیا تھا۔ میں کارخانے جانے کے لیے گھر سے باہر نکلا۔ مزدور بھی اپنی تنگ کوٹھریوں سے نکل نکل کر کارخانوں کی طرف جا رہے تھے۔ سردی ان کے ان میلے کچیلے کپڑوں کی پرواہ کیے بغیر اندر گھس رہی تھی جو پرانے ہو جانے کی وجہ سے نہ محض مسک گئے تھے بلکہ جہاں جہاں کسی دوسرے کپڑے کے پیوند لگے تھے وہاں سے پھٹ بھی گئے تھے۔ ان کی سردی سے ٹھٹھری ہوئی انگلیاں جو کارخانوں کے اندر کام کرتے کرتے سخت پڑ گئی تھیں ان بغلوں کے اندر گھسی جا رہی تھیں جن سے گرمیوں کے زمانے میں نہ معلوم کتنا پسینہ بہہ گیا تھا۔

میں ابھی اپنے مکان سے نکل کر دس پندرہ ہی قدم چلا تھا کہ کسی نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو بدلو نظر آیا۔ وہ تیزی سے میری طرف آرہا تھا۔ اس کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ہے بدلو۔"

"بابو جی!" اس نے میرے قریب آکر کہا۔ "ایک دو آنہ کی ضرورت ہے، دو تین دن میں دے دوں گا۔"

یہ سن کر میرے ہاتھ جو خالی جیبوں میں پڑے ہوئے تھے اندر ہی اندر جنبش کرنے لگے۔ دو آنے میرے پاس کہاں سے آئے۔ میری تنخواہ کے پندرہ روپے مشکل سے بیس بائیس دن کے لیے کافی ہوتے تھے، پھر ادھار کی نوبت آجاتی تھی۔ کالج میں تو میں چالیس پچاس روپیہ ماہوار اکیلا صرف کرتا تھا اور اب پندرہ روپے میں دو بچے اور ایک بیوی بھی شریک تھی۔ میں نے پوچھا۔ "اس وقت کیا ایسی ضرورت پڑ گئی؟"

اس پر اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہنے لگا۔ "بچھی کو تین دن سے بخار آرہا ہے۔ آج اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ اب تو منہ سے بول بھی نہیں پھوٹتا۔ اس لیے اسپتال لے جانا چاہتا ہوں۔"

"بھائی اس وقت تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔" یہ سن کر بدلو کے چہرے پر مایوسی

چھا گئی اور وہ کچھ کہے بغیر جانے لگا۔ لیکن میں نے یہ کہہ کر اسے روک لیا کہ "میرے ساتھ کارخانہ چلو، وہاں کسی سے پیسے دلوادوں گا۔"

بدلو میرے ساتھ ہولیا اور ہم دونوں کارخانے کی طرف چل دیے۔ ہمارے برابر سے رنگین موٹریں تیزی کے ساتھ گزر رہی تھیں جن میں سے پٹرول کی باس اور سگار کی خوشبو اڑ رہی تھی۔ یہ دنیا کا انوکھا دستور ہے، جنہیں خدا نے ہاتھ پاؤں دیے ہیں وہ مشینوں پر دوڑتے پھرتے ہیں اور جنہیں سواری کی ضرورت ہے انھیں ایک ٹوٹا ہوا یکہ بھی نصیب نہیں۔

کارخانے پہنچ کر میں نے ایک کلرک سے دو آنے لے کر بدلو کو دے دیے۔ وہ خوش خوش گھر چلا گیا لیکن تھوڑی دیر بعد واپس آیا۔ وہ بچھمی کی موت کی خبر سنانے آیا تھا۔ دو آنے پیسے اس کی مٹھی میں دبے ہوئے تھے اس نے کہا۔ "بابو جی دو تین روپیہ کسی سے دلوا دیجیے تو بچھمی کا کریہ کرم ہو جائے۔"

"کیا وہ مر گئی!" میں نے چونک کر پوچھا۔ بدلو نے کوئی جواب نہیں دیا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی حالت بہت زیادہ قابل رحم تھی میں نے اسے دو روپے کے علاوہ ایک دن کی چھٹی بھی دلوادی۔ وہ آہستہ آہستہ دفتر سے باہر نکل گیا اور میں بیٹھ کر کام کرنے لگا۔

شام کو جب میں کارخانے سے باہر نکلا تو سب سے پہلی چیز جس پر میری نظر پڑی وہ بچھمی کی ارتھی تھی جس کے ساتھ دس پندرہ مزدوروں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ کارخانوں کے جھونپڑوں کی مہیب آوازیں، موٹروں کے ہارن اور سائیکلوں کی گھنٹیاں بدنصیب بچھمی کو آخری مرتبہ رخصت کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

(مارچ ۱۹۳۷ء)

●●

علی سردار جعفری

آؤ ہم اس دنیا سے نکل چلیں

آؤ ہم اور تم محبت کے شور انگیز دریا کو تیر کر دوسرے ساحل پر جا اتریں۔ اس ریتیلے ساحل کو جس پر ہم کھڑے ہوئے ہیں سفید دیمک نے کھوکھلا کر دیا ہے۔ آؤ......
آؤ ہم اس دریا کو تیر چلیں جس کی گہرائیوں میں چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے نہنگ شکار کی تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ فضول سوال مت کرو کہ ہمارے پاس ایک ٹوٹی ہوئی کشتی بھی نہیں، ہم اس طوفانی دریا کو کیسے پار کریں گے۔ آؤ ہم تیر کر نکل چلیں گے۔ نہیں۔ میں غلط کہہ رہا ہوں ہمارے پاس عزم واستقلال کی کشتی ہے جس پر محبت اور وفا کے بادبان چڑھے ہوئے ہیں۔ یہ دریا کیا ہے ہم تو آگ کے بھی دریا کو پار کر سکتے ہیں۔

آؤ ہم ایک ایسے جزیرے میں چلیں گے جس کے ساحل مونگے کے ہیں، جہاں کھجور کے ٹھنڈے سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں، جن کے نیچے پہاڑوں سے اترنے والے قافلے آرام کرتے ہیں۔ یہ تھکے ماندے مسافر جو منزلیں طے کرتے چلے آرہے ہیں ان کے نیچے سو جاتے ہیں اور اپنی ناکام محبت کے خواب دیکھتے ہیں۔

آؤ ہم اس باغ سے باہر نکل چلیں جس کے پھولوں کی سنہری پنکھڑیوں میں ڈنک مارنے والی مکھیاں سو رہی ہیں، جن کی گہری کٹوریوں میں بجائے شہد کے زہر بھرا ہوا ہے۔ یہاں درختوں کی صندلی شاخوں سے زہریلے سانپ لپٹے ہوئے ہیں جن کے بدن نقرئی اور پھن سنہری ہیں۔ یہاں شہتوت کے سایوں میں بہت سے ایسے بچھو آرام کر رہے ہیں جو کہربا کی طرح زرد ہیں اور جن کے ڈنک انگاروں کی طرح سرخ ہیں۔ یہ جہاں رہتے ہیں وہاں کی زمین جھلسی ہوئی ہے۔ سنبل کی زلفوں میں کتنے ہی بدبخت عاشقوں کی لاشیں لٹک رہی ہیں۔ نرگس کے سفید پھول سادہ لوح عشاق پر ڈورے ڈالتے ہیں اور جب وہ ان کے قریب جاتے ہیں تو ان پھولوں کے دل سے ایک چنگاری اٹھتی ہے جو ان بدنصیبوں کو جلا کر خاک

کردیتی ہے۔ بید مجنوں کے نیچے ہزاروں حسرت نصیب عاشقوں کی قبریں ہیں جن پر بجائے پھولوں کے احمریں چوٹیوں والی ناگنیں لہراتی ہیں۔ لمبی لمبی سبز گھاس میں زرد آنکھیں والے شیر ببر سو رہے ہیں، ان کی زندگی کا مدار محض عاشقوں کے گرم خون پر ہے۔ یہ اپنے خونی پنجوں سے محبت کرنے والے سینوں کو پھاڑ ڈالتے ہیں، اور دھڑکتے ہوئے دلوں کو چبا جاتے ہیں۔ آؤ ہم ان درندوں کی آنکھوں میں خاک ڈال کے یہاں سے نکل چلیں۔ آؤ ہم سوسن کی ان کلیوں کو کچلتے ہوئے یہاں سے نکل جائیں جو پیر پڑتے ہی شعلوں کی طرح بھڑک اٹھتی ہیں اور انگاروں کی طرح دہکنے لگتی ہیں۔ آؤ۔ آؤ ہم اس آتشیں طوفان سے باہر نکل چلیں۔ ہم ان چشموں کی طرف نگاہ بھی نہ کریں گے جن کا صاف و شفاف پانی زہر آلود ہے، یہ اگر آگ کے اوپر ڈال دیا جائے تو وہ اور بھڑک اٹھے۔ ہم ان شفاف حوضوں کے پاس بھی نہ جائیں گے جن میں تیرنے والی سبز و سرخ مچھلیاں، جب اپنی دمیں ہلاتی ہیں تو ان میں سے روشنی پیدا ہوتی ہے جو پاس کھڑے ہونے والوں کے دامنوں کو جلا دیتی ہے۔ بس ہم اس لہو بھرے کانٹے کو اٹھالیں گے جسے کسی عاشق نے اپنے دل سے نکال کر پھینک دیا ہو۔ ہم ان آہنی دیواروں کو توڑ دیں گے جو ہمیں گھیرے ہوئے ہیں اور حدود سے باہر ہو جائیں گے۔

آؤ اس باغ سے ملا ہوا ایک اور باغ ہے ہم اس میں چلیں۔ اس کی دیواریں حنا کی ہیں جو برسات میں پھولوں سے لد جاتی ہیں، جن پر اودے بھونرے اپنے شیریں نغمے گاتے ہیں۔ ان آموں کے سایوں میں مست مور اپنا سینہ نکالے ہوئے پھرا کرتے ہیں۔ جب بادل گھر کر آتے ہیں تو وہ اپنے رنگین سینوں کو اور ابھار دیتے ہیں اور ان کی دمیں زمین سے چھلنے لگتی ہیں۔ یہاں گلاب کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر بلبلیں پھولوں سے راز و نیاز کی باتیں کرتی ہیں۔ کوئل کی رسیلی کوک اور پپیہے کی بدمست آواز پر گھاس میں دبک کر بیٹھ جانے والے چھوٹے چھوٹے کیڑے رقص کرنے لگتے ہیں۔ یہاں کی نقرئی پنکھڑیوں والے پھول، جن کے کنارے طلائی ہیں، کبھی نہیں کمہلاتے۔ ان پر بیٹھ کر وہ مکھیاں خواب دیکھتی ہیں جن کی دمیں شہد کی ہیں۔ یہاں کے ہرے بھرے کنجوں میں رومان کی دنیا آباد ہے۔ آؤ ہم بھی ان سایوں میں چل کر آرام کریں۔ جب یہاں کی ٹھنڈی ہوائیں تمہارے بھیگے ہوئے رخساروں کو خشک کر دیں گی تو ہم اور تم مل کر محبت کے گیت گائیں گے اور اس باغ کو ایک دنیائے نغمہ بنا دیں گے۔ ہماری زمین موسیقی کی ہو گی، ہمارا آسمان موسیقی کا ہو گا اور ہم سراپا

محبت۔ اس طرح ہم فضا پر غنودگی طاری کر دیں گے۔ وہ عالمگیر راگ جس کا زیر و بم ہماری ہستیوں پر حاوی ہے ہمارا مطیع ہو کر رہ جائے گا۔

آؤ۔ آؤ ہم اپنے وجود کو نغموں کے اس لافانی سیلاب میں ڈال دیں جو لہریں لے لے کر بڑھ رہا ہے۔ آؤ ہم اپنی ہستی کو ان موجوں کے سپرد کر دیں جو عناصر اربعہ کو جذب کر لیتی ہیں۔ پھر ہم کالے کالے بادلوں کی شکل میں اُمڈ اُمڈ کر آئیں گے اور جس جگہ برسیں گے وہاں ایسے پھول کھلیں گے جن کی خوشبوؤں کو ایک مرتبہ سونگھ لینے والا لازوال محبتوں کا مالک بن جائے گا۔

آؤ۔ ہم اس دنیا ہی سے نکل چلیں جہاں قسمت کی چیرہ دستیوں نے ہمیں پریشان کر دیا ہے۔ ہمارے پاس پیار کرنے کے لیے لب ہیں۔ ہمارے پاس محبت کرنے کے لیے دل ہیں۔ ہمارے پاس جذبات سے بھرے ہوئے سینے ہیں اور حرارت سے بھرے ہوئے پہلو۔ دیکھنے کے لیے آنکھیں ہیں پھر بھی ہم اندھے ہیں۔ قید و بند حیات کی آہنی زنجیروں نے ہماری روحوں کو جکڑ دیا ہے۔ آؤ ہم اور تم اپنی نگاہوں سے ان زنجیروں کو توڑ دیں۔ بے جا فرائض کا وہ وزن جس نے ہمیں گرانبار بنا دیا ہے ہمارے کندھوں کو توڑے ڈالتا ہے۔ آؤ ہم اور تم مل کر اسے پھینک دیں۔ تنہا تو صرف خدا ہی کام کر سکتا ہے۔ آؤ ہم بے ہودگیوں کے اس جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں جس کے اندر دنیا والوں نے مذہب کی روح کو قید کر رکھا ہے۔ آؤ ہم اس بھاری پتھر کو ہٹا دیں جو انسانیت کے سینے کو کچلے ڈال رہا ہے۔ پھر ہم آزاد ہوں گے۔ جس طرح چاہیں گے پیار کریں گے۔ جیسے چاہیں گے محبت کریں گے۔ آؤ ہم اس دنیا سے نکل چلیں اور ایک ایسی جگہ چلیں جہاں نہ یہاں کے سے ہنگامے ہیں اور نہ شور و غل۔ وہاں بس سکون ہی سکون ہے۔

آؤ ہم ستاروں کی بستی میں چلیں جہاں ثوابت ہمیں حیرت سے دیکھیں گے، سیارے ہمارے گرد طواف کریں گے، سورج ہماری پیشانیوں سے طلوع ہوگا، چاند ہمارے لاتعداد بوسوں کی روشنیوں کو دنیا پر نچھاور کرے گا۔ جلتے ہوئے دلوں کو اس سے ٹھنڈک پہنچے گی اور دکھے ہوئے دل راحت پائیں گے۔

پھر ہم اس جاودانی راستے پر گامزن ہوں گے جسے انسانی نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں، جو بل کھاتا ہوا کہکشاں کے سینے پر سے گزر گیا ہے۔ وہاں ہم اس راستے پر خوش خوش

چلیں گے۔ سرکش ستاروں کو جو ہمیں دیکھ دیکھ کر آج مسکراتے ہیں اپنے پیروں سے روند ڈالیں گے دمدار ستاروں کا روشن عصا ہمارے ہاتھ میں ہوگا جسے آسمانوں پر ٹیکتے ہوئے ہم اس چمک دار راستے پر جارہے ہوں گے۔ جس نے افلاک نیلمیں کو گھیر رکھا ہے، اور اس مقدس مقام کے قریب سے اپنی پیشانیٔ نیاز جھکا کر آگے نکل گیا ہے جہاں بارگاہ جلال قدرت کے ستونوں پر قائم ہے۔ محبت کی دنیا اس کے بھی آگے ہے۔

آؤ۔ آؤ ہم ہستی کا زرکار نقاب اپنے چہروں سے الٹ دیں تاکہ ہمارے چہرے زیادہ تابناک اور درخشندہ ہو جائیں۔ روح ہستی کے بوجھ سے دبی جارہی ہے۔ آؤ ہم اپنی روحوں کو آزاد کرلیں اور اس معطر فضا میں چل کر سانس لیں جہاں عشق ہی عشق ہے۔ پھر ہم لافانی ہو جائیں گے۔

جب شعلۂ حیات بھڑک اٹھے گا، جب ہستی کی گرہیں کھل جائیں گی، جب موت کی آخری ٹھوکر خوابیدہ روح کو جگادے گی تو یہ طلسم زندگی ٹوٹ جائے گا۔ پھر محبت کی فتح ہوگی اور ہم اور تم، دو بھونرے، ایک ہی پھول پر منڈلائیں گے۔ دو قمریاں ایک ہی سرو پر نغمہ زنی کریں گی۔

جب ساز حیات کے تار نغمہ کی بلندی سے ٹوٹ جائیں گے، جب رگ دل خون کی زیادتی سے پھٹ جائے گی تو ہستی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ پھر عشق کی فتح ہوگی اور ہم اور تم نغمۂ جاوید کی آخری تان ہوں گے۔

آؤ ہم اس آلام اور مصائب کی زندگی کا خاتمہ ہی کیوں نہ کردیں اور ایک نئی زندگی کی ابتدا کریں۔ ہماری محبت کا آفتاب پہلی بار آسمان پر چمکے گا اور تمام اجرام فلکی اس کے سجدے کے لیے جھک جائیں گے۔

تمہیں وہ پیمان یاد ہوگا جو ہم سے روز ازل لیا گیا تھا۔ پہاڑوں نے اس بار کے اٹھانے سے انکار کردیا۔ آسمان اور زمین اس کے خیال ہی سے چیخ اٹھے، مگر ہم نے وعدہ کرلیا، دیوانے انسان نے اس بوجھ کو اٹھالیا۔ آہ! ہم اس عہد کی صدائے بازگشت ہیں۔ آؤ ہم اپنے سینوں کو محبت سے بھرلیں اور اسی جگہ لوٹ چلیں جہاں سے ہم آئے ہیں۔

(جون ۱۹۳۷ء)

●●

علی سردار جعفری

شیطان کے بچے

افراد:

شہنشاہیت

شیطان	=	مکر
فرعون	=	تشدد
نمرود	=	جبر
شداد	=	شان و شوکت
قلوپطرہ	=	حسن و وقار
قانون	=	شیطان کا بیٹا
سیاست	=	شیطان کی بیٹی

منظر۔۱

عالم ارواح:

(آسمانوں پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔ فرشتے خاموش کھڑے ہیں۔ ایک طرف روحوں کا ہجوم ہے اور افق میں ایک بقعۂ نور محو رقص ہے جس سے تمام آسمان روشن ہیں۔)

آواز فطرت: اے انسانی روحو! جب قدرت انی جاعل فی الارض خلیفہ کی متقضی ہوئی تو تمہیں خلقت حیات سے سرفراز کیا۔ ملاء اعلیٰ کے عبادت گذاروں کی پیشانیوں پر حیرت واستعجاب کی شکنیں پڑ گئیں مگر بارگاہ اقدس سے پیدا ہونے والی آواز رائگاں نہیں جاسکتی۔ زبان قدرت کا نکلا ہوا ہر لفظ قابل احترام ہے۔ تمہارے مقدر لکھے جاچکے ہیں۔ تم قضاو قدر کے اٹل قانون کی چہار دیواری کے اندر آچکے ہو مگر طلب کا اختیار تمہیں اب بھی ہے اس لیے کہ تم نے اس

بارگراں کے اٹھانے کا وعدہ کرلیا ہے جس کا نام سن کر زمین و آسمان کانپ گئے تھے۔ بڑھو! اے انسانی روحو! بڑھو اور آستانۂ وحدت پر اپنی پیشانیٔ نیاز جھکا کر جو چاہو مانگ لو۔

(روحیں گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگتی ہیں۔ یکایک ایک روح آگے بڑھتی ہے اس پر سرخ رنگ کے دھبے ہیں)

روح : مالک تو نے مجھے سب کچھ دیا ہے لیکن میں اب بھی اپنے مقدر میں ایک خلا محسوس کر رہی ہوں۔ کیا اس بارگاہ سے جہاں ہر ایک کو سوال کرنے کا حق حاصل ہے مجھے حسن اور وقار بھی عطا ہو سکتا ہے۔

آواز : تجھے سب کچھ عطا ہو سکتا ہے اے قلوپطرہ! لیکن پہلے غور کرلے کہ حسن اور وقار کیا ہیں۔ حسن ایک کھوٹہ سکہ ہے اور وقار جھوٹا ملمع۔

قلوپطرہ : میں نے غور کر کے کہا ہے۔

آواز : تو نے اپنے مقدر کا خلا تاریکیوں سے پر کرلیا۔ جا تجھے مصر کی سلطنت بخشی گئی اور وادیٔ نیل کی ساری رنگینیاں تیرے پیکر کو عطا کر دی گئیں۔

(قلوپطرہ پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ نامعلوم بلندیوں سے ایک سفید سانپ نمودار ہوتا ہے جو اس کی روح میں تحلیل ہو جاتا ہے)

قلوپطرہ : حسن اور وقار! مصر کی سلطنت اور وادیٔ نیل کی ساری رنگینیاں!! اب میں ساری کائنات کو زیروزبر کر سکتی ہوں۔

(فرعون کی روح آگے بڑھتی ہے)

فرعون : خداوندا! مصر کی سلطنت تو تو نے مجھے عطا کی تھی۔ قلوپطرہ نے میرے وقارِ شہنشاہیت کو زبردست ٹھیس لگائی ہے۔

آواز : اے فرعون تو فانی ہے۔ ازل سے ابد تک مصر پر حکمرانی نہیں کر سکتا۔ تجھ سے پہلے بہت سے جابر و قاہر بادشاہ سرزمین مصر کو اپنے مظالم کی جولاں گاہ بنائیں گے اور تیرے بعد بھی بہت سے تشدد پسند خاندان ننگے اور بھوکے انسانوں کی فلک شگاف آہوں سے تباہ ہو جائیں گے۔

فرعون : تباہ ہو جائیں گے؟ کیا فرشتوں کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہو گی؟ کیا زمین ہنگامہ

آرائیوں اور خون افشانیوں ہی کے لیے ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے اپنی صفات خاص میں سے کوئی صفت عطا کردے۔

(فرشتے انسان کی سرکشی پر حیران ہیں اور ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں)

آواز : یہ ناممکن ہے۔ صفات ایزدی ازلی ور ابدی ہیں۔ یہ فانی انسان کو نہیں مل سکتیں۔

فرعون : آخر تو نے ہی تو انسان کو فانی بنایا ہے۔ اپنی ابدی صفات میں سے کچھ فانی حیثیت سے مجھے دے دے۔ نیل کے ساحل پر بہت سے حکمراں آئیں گے۔ نیل کی گہرائیوں پر صرف تیری حکومت ہے۔ کیا وہاں کی بادشاہت مجھے تھوڑے دنوں کے لیے نہیں مل سکتی۔

آواز : ہاں اگر تو چاہے تو نیل کی گہرائیاں تجھے عطا ہو سکتی ہیں۔

فرعون : (زیرِ لب) پھر تو ساری مخلوقات مجھے سجدہ کرے گی۔ (بلند آواز سے) ہاں مجھے نیل کی گہرائیاں عطا کردے۔

(سامنے سے ایک بقعۂ نور اٹھتا ہے جس کی آغوش میں ایک بچہ کھیل رہا ہے۔ وہ ہنس کر فرعون کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی گردن خود بخود جھک جاتی ہے)

آواز : جا اے فرعون! نیل کی ہیبت ناک گہرائیاں تیرا انتظار کر رہی ہیں۔

(شداد کی روح آگے بڑھتی ہے)

شداد : اے ارواح مقدسہ کو خلق کرنے والے! تو نے مجھے شہنشاہی عطا کر کے اتنی ہمت دلادی کہ تجھ سے کچھ عرض کرسکوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ زمین میری شاندار زندگی کے قابل نہیں۔ وہاں پستی ہے، وہاں ضلالت ہے، اس لیے مجھے جنت الفردوس کی بہاروں سے کچھ حصہ دے دے کہ میں اسے اپنے ساتھ اس ارضِ خاکی پر لے جاؤں۔

(فرشتے اپنے پر سمیٹ لیتے ہیں)

آواز : جنت الفردوس کی بہاریں زمین کے لیے نہیں ہیں۔

شداد : پھر؟

آواز : میں نے تیری قوتوں میں اضافہ کر دیا تاکہ تجھے اندازہ ہو جائے کہ جنتِ ارضی کی

آرزو کیا معنی رکھتی ہے۔

شداد : میں اس پر راضی ہوں۔

آواز : اے حریص! ارم کے دروازے اپنے بازو پھیلائے ہوئے تجھے بلا رہے ہیں۔

(نمرود کی روح آگے بڑھتی ہے)

نمرود : کیا میں شہنشاہ نہیں ہوں۔ کیا ملوکیت کی زرتار قبا میرے جسم پر ڈھیلی ہے؟ اے پیدا کرنے والے! کیا فرعون اور شداد ہی تجھ سے کچھ طلب کر سکتے ہیں۔ میری شاہانہ تمکنت اسے گوارا نہیں کر سکتی۔

(دور سے مچھروں کی فوج دکھائی دیتی ہے۔ فرشتے کانپ جاتے ہیں۔ شداد اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے)

آواز : تجھے کیا چاہیے؟

نمرود : سب کچھ تو پہلی تین روحیں لے گئیں۔ مجھے عظمت اور جلال دے دے۔

آواز : گستاخ روح! عظمت اور جلال الوہیت کی صفات میں سے ہیں۔

نمرود : مگر تجھے کچھ نہ کچھ تو دینا ہی پڑے گا۔

آواز : تجھے جو کچھ ملنا تھا مل گیا۔

نمرود : ہاں مجھے سب مل گیا لیکن میں ابھی ایک چیز اور چاہتا ہوں۔ مالک یہ مجھے دے دے ورنہ فرعون اور شداد میرے سامنے فخر کریں گے۔ قلوپطرہ مجھے طعنے دے گی کہ اس بارگاہ سے جہاں کسی کی بات خالی نہیں جاتی تجھے دھتکار دیا گیا۔

آواز : لیکن تو تو عظمت اور جلال مانگ رہا ہے۔ یہ دونوں چیزیں تجھے کیسے مل سکتی ہیں۔

نمرود : ان دو میں سے کوئی ایک دے دے۔ تو نے جب کچھ نہیں تھا تو یہ دنیا پیدا کی۔ مجھے اتنی ہی عظمت عطا کر دے کہ میرے سامنے ایک شکل دوسری شکل میں تبدیل ہو جایا کرے۔ جیسے تاریکی نور میں۔ کراہت حسن میں۔

آواز : اگر تیری یہی خواہش ہے تو تجھے آتشیں گلستاں میں پھولوں کی بہار نظر آ سکتی ہے۔

(ایک نورانی پیکر انگاروں سے کھیلتا ہوا سامنے سے گذر جاتا ہے پھر ایک تیز قہقہہ سنائی دیتا ہے۔ شیطان اپنے بڑے بڑے پروں سے آگ برساتا ہوا فضا میں نمودار ہوتا ہے)

شیطان : اے فانی انسان! تو حریص بھی ہے اور جلد باز بھی۔ فطرت نے تجھے فریب دیا ہے۔ مقدروں کے خلق ہو جانے کے بعد تو نے جو کچھ مانگا وہ مشیت ایزدی میں پہلے ہی گذر چکا تھا۔ تو ناحق اس طلب بے جا کا مجرم بنا۔ تو نے اپنے سر مفت الزام لے لیا۔ پھر بھی تو نے جو کچھ مانگا وہ تجھے نہ ملا، حالانکہ تو سمجھتا ہے کہ تیری دعائیں قبول ہو گئیں!

قلوپطرہ : کیا میں نے جو حسن و وقار مانگا تھا وہ مجھے نہیں ملا؟

شیطان : تجھے مصر کی حکومت اور وادیٔ نیل کی رنگینیاں دی گئی ہیں جن میں جھوٹا وقار اور نامکمل حسن ہے۔

فرعون : کیا مجھے نیل کی گہرائیوں کی حکومت نہیں ملی؟

شیطان : وہاں تیرے لیے صرف موت ہے جہاں تک تجھے گھسیٹ کر لے جانے والا تیرا تشدد ہو گا اس کے معنی ہیں کہ تجھے تشدد عطا کیا گیا ہے۔

شداد : میں نے اپنی شان و شوکت کے لیے ایک جنت ارضی کی تمنا کی تھی کیا یہ مجھے نہیں عطا کی گئی؟

شیطان : ہاں عطا کی گئی، ایک ایسی جنت جس کے دروازے کے پیچھے عزرائیل چھپا ہوا ہے۔

نمرود : اس کے معنی ہیں کہ صرف آواز سنی گئی۔

شیطان : ہاں تو نے عظمت مانگی تھی اور تجھے جبر ملا۔

نمرود : یہ کیسے؟

شیطان : بیوقوف! کہیں انگارے بھی پھول بن سکتے ہیں مگر تیرے سامنے وہ اس وقت پھول بن جائیں گے جب تو اپنی آنکھوں سے اپنی ناکامی دیکھے گا۔ تو اپنی جابر حکومت کے زعم میں ایک آدمی کو دہکتی ہوئی آگ میں پھینکے گا اور وہ آگ اس پر کوئی اثر نہ کرے گی۔

فرشتے : (آپس میں) دیکھو تو انسان کو کیسا فریب دے رہا ہے۔

شیطان : تم سب جاہل ہو۔

(فرشتے توبہ و استغفار میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ انسانی روحیں کچھ سوچنے لگتی ہیں)

منظر۔ ۲

ملاء الاعلیٰ

(پر سکون خاموشیاں طاری ہیں فرشتے عبادت میں مشغول ہیں
قلوپطرہ، فرعون، شداد اور نمرود ایوانِ کہکشاں میں کھڑے ہیں)

قلوپطرہ : میرا وقار جھوٹا سہی، میرا حسن نامکمل سہی، لیکن وقار پھر وقار ہے اور حسن پھر حسن۔ لیکن تمہاری عظمت جبر ہے تمہاری حکومت تشدد اور تمہاری شان و شوکت فریب کی ٹٹی جس کے پیچھے سے موت جھانک رہی ہے۔

فرعون : شیطان کی بات کا کیا اعتبار۔

شداد : وہ صرف قیاس آرائی کر رہا تھا۔

نمرود : اور کیا۔ صرف قیاس آرائی تھی۔ مرد بہر حال عورت سے بلند ہے۔

قلوپطرہ : فطرت نے عورت کو حسن اور آفرینش کا راز دار بنایا ہے اس لیے اسے مرد پر فوقیت حاصل ہے۔

نمرود : لیکن مرد کی تخلیق عورت سے پہلے ہوئی ہے، وہ نقش اول ہے۔

قلوپطرہ : نقش ثانی ہمیشہ نقش اول سے بہتر ہوتا ہے۔

شداد : عورت کی تخلیق مرد کے لیے ہوئی ہے۔

قلوپطرہ : نہیں، بلکہ مرد کی تخلیق عورت کے لیے ہوئی ہے۔

نمرود : یہ غلط ہے۔ فطرت نے پہلے مرد کو پیدا کیا پھر اس کی تنہائی دور کرنے کے لیے عورت کو پہلوے آدم کی بچی ہوئی طینت سے خلق کیا۔

قلوپطرہ : مرد کو پہلے اس لیے خلق کیا گیا تھا کہ عورت کو پیدا ہونے کے بعد انتظار کی تاب فرسا گھڑیاں نہ گزارنی پڑیں۔

فرعون : کسی کو کسی پر کوئی فوقیت نہیں۔ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے لیے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ سے دنیا کی آبادی بڑھے۔

شداد : پھر ہم دونوں اس مقصد کو کیوں نہ پورا کریں۔

فرعون : اور میں؟

نمرود : اور میں؟

فرعون : میرا حق قلوپطرہ پر زیادہ ہے، ہم دونوں ایک ہی خطّے کے لیے خلق ہوئے ہیں۔
قلوپطرہ : میرے اوپر کسی کا حق نہیں۔ میرا حسن کسی کی خلوت آرائی کے لیے نہیں ہے۔
فرعون : پھر تیرے حسن کا مقصد کیا ہے؟
قلوپطرہ : اس کا مقصد؟ جو میں قرار دوں۔ یہ عطا نہیں طلب ہے اس لیے مجھے اختیار ہے کہ اس کا جو مقصد چاہوں قرار دوں۔

(شیطان مسکراتا ہوا نمودار ہوتا ہے)

شیطان : کیا بحث ہے؟
فرعون : قلوپطرہ کو وادیٔ نیل کی رنگینیاں ملی ہیں اور مجھے دریائے نیل کی گہرائیاں۔
قلوپطرہ : یہ میرے وقار اور حسن کی توہین کر رہا ہے۔ یہ پر بہار رنگینیوں کو دریا کی سرد گہرائیوں کے برابر سمجھ رہا ہے۔
شداد : قلوپطرہ کو نیل کی رنگینیاں ملی ہیں اور مجھے ارم کی بہاریں اس لیے......
قلوپطرہ : رنگینی خود پُر بہار ہوتی ہے۔
شداد : رنگینی بہار کا ایک جزو ہے۔ ہم دونوں کی تخلیق کا یہی مقصد ہے۔
نمرود : قلوپطرہ کو ساحل نیل کی رنگینیاں ملی ہیں اور مجھے ایک آتشِ گلستاں کی بہاروں کا نظارہ، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ......
قلوپطرہ : پھر تو مجھے دور سے دیکھا کر۔ (ہنستی ہے)
فرعون : لیکن وادیٔ نیل جس کی رنگینیاں قلوپطرہ کو ملی ہیں آباد کیسے ہو گی۔
قلوپطرہ : (چیں بہ جبیں ہو کر فرعون کی طرف دیکھتی ہے) وادیٔ نیل مجھ سے آباد ہو گی۔
شیطان : یہ تمہارا کام نہیں۔ اس کے لیے آدم اور حوا بہشت سے نکالے جا چکے ہیں۔
فرعون، شداد اور نمرود: (یک زباں ہو کر) جب یہ حکومت اور سلطنت میں ہماری شریک ہے تو اسے جذبات میں بھی ہماری شریک بننا پڑے گا۔
شیطان : یہ دنیا کی باتیں ہیں اور وہاں زمان و مکان کی قید ہے اس لیے قلوپطرہ کا خیال چھوڑ دو۔ اس کا حسن ایک سر بہ مہر جام ہے جس تک کسی حریص کے لب نہیں پہنچ سکتے۔ (قلوپطرہ سے) آ۔ میں تجھے وہ خطۂ حسن و موسیقی دکھاؤں جہاں تو

حکمرانی کرے گی۔

(شیطان قلوپطرہ کو لے کر چلا جاتا ہے۔

فرعون، نمرود اور شداد ایک دوسرے کی صورت دیکھ کر رہ جاتے ہیں)

منظر۔ ۳

وادیٔ نیل

(دریا رنگین پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتا ہوا جارہا ہے۔ قلوپطرہ اور شیطان دونوں ایک بڑے پتھر پر پیر لٹکائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ قلوپطرہ کا سر شیطان کے سینے پر رکھا ہے اور سنہرے بال عریاں شانوں پر بکھر رہے ہیں جن میں ہوا نے ایک قسم کی تھرتھراہٹ بھردی ہے۔)

قلوپطرہ : کتنا رومانوی ساحل ہے۔ ہوا کتنی کیف افزا ہے۔

شیطان : جنت کی ہزاروں بہاریں اس کی دل فریبیوں پر قربان ہیں۔

قلوپطرہ : تم نے جنت دیکھی ہے؟

شیطان : ہاں۔

قلوپطرہ : کیا وادیٔ نیل اس سے زیادہ خوبصورت ہے۔

شیطان : جنت کی حقیقت حسن تصور سے زیادہ کچھ نہیں۔

قلوپطرہ : (مسکراتی ہے) گویا میں وادیٔ نیل میں اپنے پیکر کی رنگینیاں دیکھ رہی ہوں۔ یہ سرزمین ہمیشہ میری حکومت میں رہے گی۔

شیطان : تو فانی ہے۔

قلوپطرہ : میرے بعد میری اولاد مصر پر حکومت کرے گی۔

شیطان : (زیرلب) تیرے اولاد کہاں! (زور سے) وہ بھی فانی ہو گی۔

قلوپطرہ : پھر کیا ابدی حکومت ممکن ہی نہیں۔

شیطان : ممکن ہے۔ تجھے ایسی اولاد کی ضرورت ہے جو رہتی دنیا تک باقی رہے۔

قلوپطرہ : تو کہتا ہے کہ فانی مخلوق کی اولاد بھی فانی ہو گی۔

شیطان : لیکن میں تو جاودانی ہوں (قلوپطرہ کی رفتار تنفس تیز ہو جاتی ہے) تجھے اپنی حکومت، اپنا وقار، اپنا حسن قائم رکھنے کے لیے ایسی اولاد کی ضرورت ہے جس

میں نمرود کا جبر، فرعون کا تشدد، شداد کی شان و شوکت اور میری ابدیت ہو۔

قلوپطرہ : ان میں سے صرف ایک چیز حاصل ہو سکتی ہے۔ نمرود کا جبر، فرعون کا تشدد اور شداد کی شان و شوکت میری طرح فانی ہے اس لیے مجھے اپنی اولاد کے لیے ان کی ضرورت نہیں۔ ہاں تیری ابدیت پر میرے برق پاش حسن کی نگاہیں ضرور حریصانہ پڑ رہی ہیں۔

شیطان : میری ابدیت ان کے جبر و تشدد، شان و شوکت سب کو جذب کر سکتی ہے اس لیے کہ وہ ہر زمانے میں موجود ہوگی۔

(قلوپطرہ: کوئی جواب نہیں دیتی صرف ملتجی نگاہوں سے شیطان کی طرف دیکھتی ہے)

منظر۔۴

(سرزمین مصر جو اب آباد ہو چکی ہے۔ دریا کے ایک کنارے پر چھوٹے چھوٹے جھونپڑے پڑے ہیں۔ مرد و عورت کام میں اور بچیاں کھیل کود میں مصروف ہیں۔ دوسرے ساحل پر قلوپطرہ اور شیطان کھڑے ہیں۔ پاس ہی دو بچے کھڑے ہیں۔ قانون شیطان کی طرح قوی ہیکل ہے۔ اس کے دوش پر ایک چھوٹی سی کمان اور پشت پر تیروں سے بھرا ہوا ترکش ہے۔ سیاست کے اعضا میں قلوپطرہ کے اعضا کا تناسب ہے اور آنکھوں میں شیطان کی آنکھوں کی چمک ہے۔)

قلوپطرہ : کتنی ذلیل آبادی ہے۔ یہ خطہ میری عشرت رانیوں کے لیے موزوں نہیں۔ میرا حسن جس کی تخلیق کوثر و سلسبیل کی موجوں کی دوشیزگی سے ہوئی ہے اس گندگی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں کے سانس سے میری نزہت شباب کی توہین ہو رہی ہے۔

شیطان : اس سرزمین سے ایک شاندار تہذیب کا آفتاب طلوع ہونے والا ہے جس کی روشنی ساری دنیا میں پھیل جائے گی۔

قلوپطرہ : یہ آفتاب کب طلوع ہوگا؟

شیطان : جب قلوپطرہ کی مخمور نگاہیں نیل کی موجوں میں شراب سرخ کا سرور بھر دیں گی۔ جب قلوپطرہ کے قدم نیل کے ساحل کے ہر ذرے میں جان ڈال دیں گے اس وقت مصر پر حسن اور وقار کی حکومت ہوگی۔ پھر تیرے شبستان

عشرت کی رنگینیوں میں ہزاروں پر شباب آرزوؤں کا اضافہ ہوگا اور دسوں
نوجوان دلوں کا خون تیرے رخساروں کی حدت اور خون کی گرمی بڑھادے گا۔

(فرعون، شداد اور نمرود نمودار ہوتے ہیں)

فرعون : (فخر سے) یہ ہے میری مملکت! نمرود دیکھ بابل اور نینوا تو ویران تھے۔ مصر کی آبادی بڑھ رہی ہے جو میرا شاندار استقبال کرے گی۔

شداد : قلوپطرہ یہاں ہے۔

نمرود : اس کے حسن کی نزہت اور شباب کی دوشیزگی پر شیطان کا قبضہ ہے۔

قلوپطرہ : (قہقہہ لگا کر) میرے حسن کی قیمت صرف ابدیت ادا کر سکتی ہے۔

فرعون : (بچوں کو دیکھ کر) اور یہ کون ہیں؟

(لڑکی دریا کو عبور کر کے دوسرے ساحل پر چلی جاتی ہے۔
لڑکا نگاہوں سے اس کا تعاقب کر رہا ہے)

شیطان : میری ابدیت اور قلوپطرہ کی پاکیزگیٔ حسن کی تشکیل! لیکن گھبراؤ نہیں، میرے بچے ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گے اور تمہیں تمہاری شاہانہ عظمت کے برقرار رکھنے میں مدد دیں گے۔

(شداد، نمرود اور فرعون خاموشی سے چلے جاتے ہیں)

قلوپطرہ : یہ میرے حسن کی فتح ہے۔

شیطان : ہاں۔

(دوسرے ساحل پر ایک نوجوان جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ سر پہ بوجھ اٹھائے ہوئے ہے
اور پیشانی سے پسینہ کی بوندیں ٹپک رہی ہیں)

قانون کیا دیکھ رہا ہے۔

(لڑکا اپنے دوش سے کمان اور ترکش سے تیر نکال کر ایک تیر ہاتھ میں لے لیتا ہے)

سیاست تو وہاں کیا کر رہی ہے؟

سیاست : (نوجوان سے مخاطب ہو کر) یہ تو کیا لیے جا رہا ہے؟

نوجوان : (رک کر) شکار کا گوشت۔

سیاست : اس میں سے میرا حق نکالتا جا۔

نوجوان : اس میں تیرا حق کہاں سے آیا۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔

سیاست : میں اور میرا بھائی قانون دونوں تیرے پاسبان ہیں۔ میں اپنا حق محافظت مانگ رہی ہوں۔

نوجوان : (حیرت سے) تمھیں ہم نے اپنی حفاظت کے لیے بلایا کب ہے!

قانون : (زور سے) تم بلاؤ یا نہ بلاؤ ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں (کمان کڑکتی ہے اور ایک تیر سنسناتا ہوا نوجوان کی طرف جاتا ہے)

نوجوان : (تیر کھا کر) آہ!

(زمین پر بیٹھ جاتا ہے)

قلوپطرہ : یہ کیا؟

شیطان : قانون کا پہلا حملہ!

(لڑکی زور سے قہقہہ مارتی ہے)

قلوپطرہ : اور یہ کیا؟

شیطان : سیاست کی پہلی کامیابی۔

(قلوپطرہ ہنسنے لگتی ہے سیاست گوشت کے کچھ ٹکڑے لے کر قانون کی طرف آ رہی ہے)

قانون : (شیطان کی طرف مڑ کر) میرا پہلا تیر خطا نہیں ہوا۔

شیطان : (ہنس کر) میری اولاد آدم کی اولاد سے ہمیشہ انتقام لیتی رہے گی۔

(قلوپطرہ شیطان کی طرف تیز نظروں سے دیکھتی ہے۔ وہ فضاؤں میں پرواز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ قانون اور سیاست مل کر قہقہے لگاتے ہیں)

(دسمبر ۱۹۳۷ء)

●●

علی سردار جعفری

نوجوانوں کے ادبی رجحانات

آج جب کہ دنیا اپنے سب سے زیادہ شاندار دور سے گذر رہی ہے اور ارتقا کی سیکڑوں منزلیں طے کرنے کے بعد اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی ہے، بیسویں صدی کی ''برکتوں'' سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر آبادی کو پیش کیا جاسکتا ہے (بقائے نسل کا مقصد کیا اس سے زیادہ اور بھی کچھ ہو سکتا ہے کہ زمیں اپنے فرزندوں کو مادرانہ شفقت سے بھی محروم کردے) تہذیب و تمدن کو پیش کیا جاسکتا ہے جو اس دور کا سب سے زیادہ زرین کارنامہ ہے۔ لیکن شباب کی دیوانی امنگوں کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب اور تہذیب و تمدن کے اس گرجتے ہوئے طوفان سے انسانیت کی پرانی کشتی کے تختے آہستہ آہستہ اکھڑتے جارہے ہیں۔

زندگی جس قدر دشوار ہوتی جارہی ہے اسی قدر انسانی ذہنیت میں بھی تبدیلی ہوتی جارہی ہے۔ دنیا کی دن دونی رات چوگنی مشکلات کو دیکھتے دیکھتے انسان کا احساس بڑھ گیا ہے اور جتنا وہ حساس ہوتا جارہا ہے اتنا ہی غور و فکر کا مادہ بھی اس میں زیادہ ہو گیا ہے۔ اب وہ کسی چیز کو بغیر سوچے سمجھے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ زندگی کا تیز دھارا آہستہ آہستہ اپنا رخ بدل رہا ہے۔

ابھی تک زندگی قضاو قدر کے ہاتھوں میں ایک کھلونہ سمجھی جاتی تھی۔ ہر شخص اپنی حالت پر شاکر تھا۔ غلام غلامی کو اپنا فرض جانتے تھے اور آقا حکومت کو اپنا پیدائشی حق بتاتے تھے مگر آج یہ طلسم ٹوٹ چکا ہے اور انسان اس حقیقت سے واقف ہو گیا ہے کہ کسی آدمی کو کسی چیز پر انفرادی حیثیت سے کوئی حق حاصل نہیں۔

اب زندگی کا مفہوم بالکل بدل گیا ہے۔ زندگی اب مداری کا تماشہ نہیں بلکہ انسانی افعال کے ایک ایسے مجموعہ کا نام ہے جسے خود انسان مختلف شکلوں میں پیش کر سکتا ہے۔ اب

قسمت کی چیرہ دستیاں ہم پر اس طرح اثر اندازی نہیں کر سکتیں کہ تدبیریں سسک سسک کر دم توڑ دیں۔ اب مافوق الفطرت قوتیں ہماری انسانی کمزوریوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتیں۔ اب انسان اتنا سمجھدار ہو گیا ہے کہ کل تک جن چیزوں سے ڈرتا تھا آج ان پر ہنستا ہے۔

آج وہ پرانا سوال پھر دوہرایا جا رہا ہے کہ بادشاہ زمین پر ظل اللہ ہے یا اس سپاہی کی سی حیثیت رکھتا ہے جو دروازہ پر کھڑا ہوا قلعہ والوں کی حفاظت کر رہا ہو یا برخلاف ان دونوں باتوں کے اس کا وجود ہی فضول ہے۔ آیا سفید اقوام کالی قوموں پر حکومت کرنے کا حق رکھتی ہیں یا نہیں۔ کھیت میں دن بھر کام کرنے والے کسان زمین کے مالک ہیں یا وہ زمیندار جو نذرانے کی رقمیں وصول کرتے ہیں۔ غرض زمانے کی رفتار بدل رہی ہے۔ دنیا کا پردہ ایک نئی کروٹ لے رہا ہے۔ اب نیا آسمان ہے اور نئی زمین۔ نیا چاند ہے اور نیا سورج۔ نئی دنیا ہے اور نئی فضائیں۔ مستقبل کے پردے میں نئے کام ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ قدامت پسندیوں کے لیے دنیا کا دامن کوتاہ ہو گیا ہے۔ بے جا فرائض کا یہ بار جس سے انسانیت کے کندھے ٹوٹے جا رہے ہیں بہت جلد ہلکا ہونے والا ہے۔

چوں کہ ادب انسانی زندگی کا ایک ایسا جزو ہے جو اس کے ساتھ ساتھ اپنا رنگ بدلتا ہے اس لیے ہمارے ذہنی انقلاب کے ساتھ ایک ادبی انقلاب ہونا ضروری ہے لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے پہلے کون رونما ہوتا ہے، کیوں کہ جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ ذہنی انقلاب سے ادبی انقلاب ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ادبی انقلاب سے ذہنی انقلاب ہو جاتا ہے۔ شاید انقلاب کی منزلوں میں دونوں دوش بدوش نظر آتے ہوں۔

ہر ادب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس ملک اور قوم کی تہذیب و معاشرت کی پوری طرح ترجمانی کر سکے جس سے اس کا تعلق ہے۔ اردو ادب کی یہ سب سے بڑی کمزوری ہے کہ اس میں مقامی رنگ بالکل نہیں ہے، جس کی وجہ سے وہ بجائے زندگی سے قریب ہونے کے دور ہو گیا ہے۔

مقامی رنگ نہ ہونے کی وجہ سے اردو ادب میں ایک اور کمزوری پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں خارجی عنصر تقریباً مفقود ہے اور جو کچھ تھوڑا بہت ہے اس کا تعلق اعلیٰ طبقہ اور خوش حال درمیانی طبقہ سے ہے۔ اب نوجوان ادیبوں نے اس طرف توجہ کی ہے۔

ان کی نگاہیں ان اصناف ادب پر ہیں جو ابھی اپنی طفلی کی نازک ساعتیں بسر کر رہی ہیں۔ افسانے، ناول اور ڈرامے زندگی کی بہترین ترجمانی کر سکتے ہیں۔ ان میں اہم سے اہم مسائل پر بحث کی جاسکتی ہے۔ معمولی سے معمولی باتوں پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے، لیکن ان کے لیے مواد کہاں سے فراہم کیا جائے، اجڑے ہوئے جھونپڑوں سے یا جگمگاتے ہوئے محلوں سے؟

بے شک ایک زمانہ وہ تھا جب صرف اعلیٰ طبقہ ہی دنیا کے رہنے والوں میں شمار کیا جاتا تھا مگر اب زندگی کا معیار ادبی طبقہ کی حالت پر قائم کیا جارہا ہے، اس لیے ادب میں بجائے حریر و دیبا کے، چیتھڑوں کا، بجائے محلوں کے، جھونپڑوں کا اور بجائے بربط اور رباب کے، لکڑی کی بانسریوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ تشبیہیں اور استعارے بھی نئے استعمال ہو رہے ہیں جس کا اندازہ ذیل کی مثالوں سے ہو سکتا ہے:

"پیڑوں کے اس طرف ڈوبتا ہوا سورج سڑے ہوئے زخم کی طرح چمک رہا تھا۔
آنکھوں میں کیچڑ اس طرح بھری رہتی تھی کہ دور سے دو چھوٹے چھوٹے ناسور معلوم ہوتے تھے"

"سورج جلتی ہوئی چتا کے شعلے کی طرح بلند ہو رہا تھا۔"

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

لب ہیں کہ پتھروں کے ٹکڑے جمے ہوئے ہیں
رخ ہیں کہ رہگذر کے بجھتے ہوئے دیئے ہیں

پپڑیاں ہونٹوں پہ زخموں کے کناروں کی طرح
گرم ماتھوں پر عرق مدھم ستاروں کی طرح

یہ انداز بیان لذت آفریں نہیں بلکہ دکھ بھرا ہے۔

نوجوان بجائے اس ادب کے جو اعلیٰ طبقہ کی زندگی پیش کرتا ہے ایک ایسے ادب کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں جس کی تعمیر ادبی طبقہ کی مصیبتوں پر، درمیانی طبقہ کی معاشرتی

کمزوریوں پر اور اعلیٰ طبقہ کی سیہ کاریوں پر ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں، شبستانوں کی رنگینیاں چھپانے کی ضرورت نہیں، ان کے جلوے عام کر دیجیے۔ گھروں کی چہار دیواریوں کے اندر راز و نیاز کرنے والے حسن و عشق کو منظر عام پر لے آیئے۔ ٹوٹی ہوئی جھونپڑیوں اور برگد اور پیپل کے پیڑوں کے نیچے بلند ہونے والی آہوں کو فضائے عالم میں پھیلنے دیجیے، پھر دیکھیے زمین اپنے مرکز سے ہٹتی ہے یا نہیں۔ آسمان کی گردشوں میں کوئی فرق آتا ہے یا نہیں۔

دن بھر کی تھکا دینے والی محنت کے بعد گھر لوٹتے ہوئے مزدوروں کو ہنستے ہوئے سب نے دیکھا ہے لیکن اس پر بہت کم لوگوں نے غور کیا ہے کہ ان کے قہقہوں میں، جن میں ہزاروں غمگین آہیں دبی ہوئی ہیں، ایک ادبی شاہکار کا مواد موجود ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے والی دیہاتی عورتوں کے گیت محض سامعہ نوازی ہی نہیں کر سکتے بلکہ وہ ہمارے ادبی ذوق کی بھی پیاس بجھا سکتے ہیں۔ لیکن ان کے سمجھنے کی کوشش کون کرتا ہے۔

دعوتوں سے دستر خوان کے بچے ہوئے ٹکڑے لے جانے والوں کو، سڑکوں پر برہنہ پھرنے والے بچوں کے افسردہ چہروں کو، بے خانماں فقیروں کے تبسم زیر لب کو، گھروں کے اندر معمولی معمولی چیزیں چرانے والے نوکروں کو، صرف دیکھیے ہی مت بلکہ اوروں کو بھی دکھایئے اور اس طرح کہ ان باتوں کی اصلی وجہ معلوم ہو سکے۔

اس لحاظ سے اردو کے نئے مصنفین پرانے مصنفین سے کئی منزل آگے ہیں۔ ان کی پیشانیوں پر زمانے کی بڑھتی ہوئی مشکلات نے غور و فکر کی گہری گہری شکنیں ڈال دی ہیں اور یہ ارادی اور غیر ارادی طور پر ایک نیا رنگ اختیار کر رہے ہیں۔ جو ادب یہ لوگ پیش کر رہے ہیں وہ نتیجہ ہے اس ہیجانی کیفیت کا جو ان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ مولویوں کی طرح شراب خانوں کے سامنے لاحول پڑھ کر نہیں گذر جانا چاہتے بلکہ وہ ان پردوں کو بھی اٹھا کر دیکھنا چاہتے ہیں جن کے پیچھے شرابی شراب خانوں کے اندر دھکیلے جا رہے ہیں۔

قحبہ خانوں کو اجاڑنے سے پہلے یہ بھی معلوم کر لینا چاہیے کہ ان کے وجود کا باعث کون سی چیز ہے ورنہ کہیں گھر ہی قحبہ خانے نہ بن جائیں۔ مجرموں کو قید خانوں کے اندر ٹھونسنے سے پہلے اس کا بھی یقین اور اطمینان ضروری ہے کہ وہ اقدام جرم پر مجبور تو نہ تھے۔ اگر ایک فاقہ کش بھوک سے گھبرا کر چوری کر لے تو وہ ہمدردی کا مستحق ہے نہ کہ سزا کا۔ لیکن پھولوں پر سونے والے اسے نہیں سمجھ سکتے۔

جب تعمیری لائحہ عمل کامیاب ثابت نہیں ہوتا تو تخریبی لائحہ عمل کی ضرورت پڑتی ہے۔ ابھی تک اخلاقیات کے بلند نظریے پیش کیے جاتے ہیں۔ مذہب کے آتشیں تازیانوں سے ڈرایا جاتا تھا۔ وہ سوسائٹی کی سرد رگوں میں حرارت پیدا نہ کر سکے، اس لیے ایک قاتلانہ حملہ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ جب شربت کا پیالہ فرحت بخش ثابت نہ ہو تو زہر کا ایک گھونٹ اس سے بہتر ہے۔ ع

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی

اسی نظریہ کے تحت "انگارے" کی تصنیف ہوئی تھی۔ اس لیے مذہب اور اخلاق پرست ناقدین کو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ باوجود اس کے کہ وہ عامیانہ بھی ہے اور سوقیانہ بھی، نہ وہ افسانہ نگاری کے معیار پر پوری اترتی ہے اور نہ اس میں کوئی خاص ادبیت ہے، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر چند "فحش" ادب کا مقصد نہ ہو لیکن ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب اس کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

ان نقادانِ ادب کی عجیب حالت ہے۔ وہی فحش، جس کا الزام "انگارے" پر ہے، جب شاعر اس پر خوبصورت الفاظ کا پردہ ڈالتا ہے تو وہ فنا فی اللہ کی وجدانی منزلوں میں پہنچ کر جھومنے لگتے ہیں۔ جب تصور اسے امتزاجِ رنگ کی نقاب میں چھپا دیتا ہے تو ان کی نگاہیں ٹھٹک کر رہ جاتی ہیں اور جب پروہت، مولوی اور پنڈت اسے مذہب کا لباس پہنا دیتے ہیں تو ان کے نزدیک اس میں پاکیزگی اور لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت سوسائٹی کی حالت بالکل اس پھوڑے کی سی ہے جو اندر ہی اندر پک رہا ہو۔ جب کوئی اسے نشتر سے چھونا چاہتا ہے تو سوسائٹی چیخنے لگتی ہے، ورنہ اسے اپنا جزو بدن بنائے پھرتی ہے۔

ایک مرتبہ رسالہ "ساقی" میں ایک افسانہ "دیور" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، حالانکہ افسانہ نئے رجحانات کا حامل تھا لیکن اتفاق سے اس میں ایک بات پیدا ہو گئی تھی، یعنی اس عصمت کی حقیقت کیا ہے جسے گھروں کی چہار دیواری کے اندر قید کر کے ناز کیا جاتا ہے۔ ادارۂ معارف کو افسانہ کی یہ ادا پسند نہ آئی اور جس دریدہ دہنی کا وہاں سے ثبوت دیا گیا وہ اس لیے تھی کہ سڑی ہوئی لاش کو سڑا ہوا کیوں کہا جاتا ہے۔ جس چیز نے ادارۂ معارف کو اس کف در دہانی پر مجبور کر دیا وہی چیز بعض اوقات نوجوان ادیبوں کو ایسی چیزیں لکھنے پر مجبور

کردیتی ہے جنہیں درمیانی طبقہ کی ذہنیت نخش سمجھتی ہے۔

اسی طرح آج سے چار پانچ سال پہلے جوش کی ایک نظم "مہترانی" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی جس پر اتنا ہنگامہ ہوا تھا کہ توبہ۔ ہر شخص کف در دہان نظر آرہا تھا مگر کسی نے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر یہ نہ سوچا کہ مہترانی کا وجود سوسائٹی میں کیا معنی رکھتا ہے۔ جوش نے وہ کہہ دیا جو ہر ایک کے دل میں تھا اس لیے گنہگار ہو گیا اور کسی نے وہ نہ کہا جو خود اس کے دل میں تھا اور پارسا بنا بیٹھا رہا۔

جوش کی اس قسم کی نظموں میں رنگینیوں کے ساتھ جو زہر ہوتا ہے وہ بڑا قاتل ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک نظم میں، جس کا عنوان "جامن والیاں" ہے، متمدن سوسائٹی اور شہروں کے رہنے والوں کی اخلاقی حالت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

وہ جھجک اٹھنا جوانوں کی نظر سے بار بار
وہ نگاہیں شہر کی گلیوں میں گھبرائی ہوئی

آپ ایسی نظموں کو جتنا چاہے برا کہہ لیجئے لیکن یقین مانیئے کہ ایک دن وہ آنے والا ہے جب محض مہترانی اور جامن والیاں ہی نہیں بلکہ غربت کی وجہ سے مزدوری کرنے والی دیہاتی دوشیزائیں، گھروں کی مامائیں اور ان کی لڑکیاں، بچپن کی شادیوں کا شکار نوجوان بیوائیں اور درمیانی طبقے کے قریب المرگ بڈھوں کی ہوسناکیوں کی ماری ہوئی بیوہ سہاگنیں، اور وہ سب جن کو سوسائٹی ایک جرائم پیشہ نسل کی مائیں بنا رہی ہے، آپ کی ادبیات میں مداخلت بے جا کریں گی۔ حسن رہگذر میں نظر ڈالنا اگر جرم نہیں تو آپ اسے ادبیات میں جگہ دیتے ہوئے کیوں گھبراتے ہیں۔

ہندوستان کے نوجوانوں میں اس وقت نظام موجودہ زندگی کے خلاف ایک زبردست رد عمل ہو رہا ہے جو کسی طرح روکا نہیں جا سکتا۔ ٹیگور نے اپنی نظم میں لکھا ہے۔

"اے تہذیب تو مجھے وہ پرانے دشت و جبل واپس دے دے اور اپنی لوہے، پتھر، اینٹ اور لکڑی کی بنی ہوئی عمارتوں کو واپس لے لے کیوں کہ ان میں بناوٹ ہے۔"

لیکن یہ نوجوانوں کی پکار نہیں۔ وہ پیچھے لوٹ کر نہیں جانا چاہتے وہ آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ ماضی اور حال دونوں کو کچل کر مستقبل کی آغوش میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔

چنانچہ بنگال کا باغی شاعر نذر الاسلام کہتا ہے:

"ہر چند انقلاب تلواروں کی جھنکار کے ساتھ آتا ہے......"

"...... لیکن یہ تکلیف تو دردِ زہ کی تکلیف ہے۔"

مستقبل کی حسین تصویر اس کے سامنے ہے اور وہ بے اختیار ہو کر چیخ اٹھتا ہے:

"مادرِ ہند دردِ زہ کی تکلیف میں مبتلا ہے۔

وہ ایک نہایت خوبصورت بیٹے کی ماں بننے والی ہے۔"

نوجوانی کے اس جذبہ کو دنیا کی کوئی قوت نہیں روک سکتی۔ یہ چڑھتے ہوئے دریا کی طرح کناروں کی اونچائی سے بالکل بے نیاز ہے۔ اسرار الحق مجاز نے اپنی نظم "اندھیری رات کا مسافر" میں یہی تخیل پیش کیا ہے:

جوانی کی اندھیری رات ہے ظلمت کا طوفاں ہے
مری راہوں سے نور ماہ و انجم تک گریزاں ہے
خدا سویا ہوا ہے اہرمن محشر بداماں ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

زمیں چیں بہ جبیں ہے آسماں تخریب پر مائل
رفیقان سفر میں کوئی بسمل ہے کوئی گھائل
تعاقب میں لٹیرے ہیں چٹانیں راہ میں حائل
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

حکومت کے مظالم کے جنگ کے پرہول نقشے ہیں
کدالوں کے مقابل توپ بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل، تازیانے، بیڑیاں، پھانسی کے تختے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

جو ادب اس وقت ہندوستان کے نوجوان پیش کر رہے ہیں وہ تقریباً سب کا سب سوسائٹی کی کمزوریوں سے تعبیر ہو رہا ہے اس میں سب سے زیادہ کامیاب کوشش "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" ہے۔ یہ اردو میں ایک نیا موضوع ہے۔ کسی کا وجود اور عدم وجود ملک کا اہم سوال ہے۔ جس پر مولانا نیاز بھی ایک زمانے میں اپنا زور قلم صرف کر چکے

ہیں۔ قاضی عبدالغفار نے ان دونوں کتابوں میں جو ادبیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کتابیں محض قاضی صاحب کے مطالعۂ زندگی ہی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان میں اشتراکیت کی چنگاریاں بھی دبی ہوئی ہیں۔

'انسانی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ اپنے مشابہ اور ہم رنگ واقعات کو ہمیشہ یاد کرتی رہتی ہے۔ آج ہندوستان کی حالت کسی طرح روس کی اس حالت سے اچھی نہیں جب روس زار کے پنجہ استبداد میں تڑپ رہا تھا۔ چونکہ اس زمانے کے ادب نے روس کے انقلاب میں زبردست مدد دی ہے، اس لیے ہندوستان کے ادیب بھی روس اور روسی انقلاب کا کلمہ پڑھ رہے ہیں۔

یہ کہنا بڑی سخت حماقت ہے کہ روسی کتابیں پڑھ پڑھ کر ہندوستان کے نوجوانوں کے دماغ خراب ہو رہے ہیں۔ اشتراکیت نہ تو کارل مارکس کی ملکیت ہے اور نہ اینجلس اور لینن کی۔ یہ انسانیت کی متفقہ میراث ہے۔ اسے جہاں زمین ملے گی وہاں پھلے پھولے گی، خواہ وہ روس ہو یا ہندوستان۔

اردو مصنّفین کا بیدار مغز گروہ رومان سے گریز کر کے معاشرتی مسائل کی طرف آگیا ہے، چنانچہ پریم چند ساری عمر یہی لکھتے رہے۔

نوجوان مصنّفین معاشرتی مسائل سے بھی گریز کر رہے ہیں اور ان اقتصادی اور سیاسی مسائل پر غور کر رہے ہیں جو ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے پر آمادہ ہیں (اس کا فیصلہ وقت خود کرے گا کہ ہندوستان کا انقلاب محض مذہبی ہو گا یا خالص لامذہبی۔) چنانچہ آخر عمر میں پریم چند نے بھی اس کا احساس کر لیا تھا جو "کفن" کی صورت میں ظاہر ہوا۔ وہ مصلحین کے گروہ سے نکل کر انقلابیوں کی صف میں آکھڑے ہوئے۔

اس وقت سب نوجوان زندگی کو ایک ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ زمانہ ختم ہو چکا جب پیٹ بھرنے کے لیے آسانیاں تھیں اور سوچنے کے لیے وقت۔ تخیلات پر ادب کی پوری عمارت کھڑی ہوئی تھی۔ اب کہ پیٹ بھرنے کے لیے روٹی کا ایک ٹکڑا نصیب نہیں، تن ڈھکنے کے لیے ایک چیتھڑا نہیں جڑتا، دن رات کے دھندوں سے اتنی فرصت کہاں کہ پرواز تخیل دکھائیں اور "داستان امیر حمزہ" اور "طلسم ہوش ربا" لکھیں۔ مجبوراً روزمرہ کے واقعات سے اپنے ادب کی تعمیر کر رہے ہیں۔

تیرا اور میرا خدا

تیرا خدا اسیر ہے تیرے تو ہمات میں
میرا خدا مرا رفیق کشمکش حیات میں

تیرے خدا کی ہیں صفات جبر و غرور بے ثبات
میرے خدا کی ہیں صفات سطوت و قوت و حیات

تیرے خدا کے نام پر تفرقہ بلند و پست
میرے خدا کے نام پر ماضی و حال کی شکست

تیرے خدا کی کائنات رسم و رواج و نسل و رنگ
میرے خدا کی کائنات شورش و انقلاب و جنگ

تیرے خدا کے ساز میں نغمۂ دیر اور حرم
میرے خدا کے ساز میں زمزمہ ہائے کیف و کم

تیرا خدا وہ خلق مذہب و ملت و وطن
میرا خدا جہاں گر تیرے خدا کا بیخ کن

تیرے لئے کبھی غمی اور کبھی خوشی خدا
میرے لئے فقط میرا مقصد زندگی خدا[1]

---

[1] من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔

اور صحیح معنوں میں ادب ہے بھی یہی کہ یہ ہماری زندگی کا ترجمان ہے۔ جن آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں ان کا حسن نہیں دیکھا جاتا، اور جس سینہ میں زخم ہوں اس کے شاہانہ ابھار کی تعریف کرنا خود اپنی آنکھوں کو دھوکا دینا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو دیکھنے والا ایک اور اس پر پردہ ڈالنے والے بہت ہیں۔ کہیں مذہب، کہیں اخلاق، کہیں تہذیب، کہیں سلطنت، اور سب سے بڑا پردہ پوش وہ ذوق وجدانی ہے جو سڑے ہوئے زخموں کو بھی کھلتا ہوا پھول سمجھتا ہے۔ لیکن ہر چیز اپنے وقت اور عہد کے ساتھ پنپ سکتی ہے۔ زمانے نے بہت سی قبریں تیار کر رکھی ہیں، تابوتوں کے کندھوں سے اترنے کی دیر ہے! (مارچ ۱۹۳۸ء)

ساقی

قیامت ہے بپا طوفان دار و گیر ہے ساقی
زمانے کی ادا چلتی ہوئی شمشیر ہے ساقی

قدم ڈولے ہوئے ہیں آج بنیاد امارت کے
ہر آہ نا رسا شرمندۂ تعبیر ہے ساقی

کوئی جنت نہیں ہے میرے دامان تخیل میں
میرے ساغر میں تیرے عکس کی تنویر ہے ساقی

یہ تہذیب کہن دھوکا ہے اک اقوام غالب کا
تمدن کچھ نہیں سونے کی ایک زنجیر ہے ساقی

بغاوت ایک ابھرتا نقش ہے قرطاس عالم پر
سکون زندگی مٹتی ہوئی تصویر ہے ساقی

رگِ مزدور سے چوسا لہو سرمایہ داری نے
یہ انسانی ہوس کی آخری تعمیر ہے ساقی

ابھی تدبیر کے ہونٹوں کی مے پی ہی نہیں اس نے
ابھی انساں اسیر گیسوئے تقدیر ہے ساقی

یہ میخانہ یہ مرکز انقلابی نوجوانوں کا
جوانی کے سنہرے خواب کی تعبیر ہے ساقی

(دسمبر ۱۹۳۸ء)

علی سردار جعفری

میرا نعرہ روٹی اور کتاب ہے

غالب اور تحریک آزادی کے ساتھ میرا رشتہ بہت گہرا ہے۔ جب میں دسمبر 1940ء میں جنگ آزادی کے خلاف شاعری کرنے کے جرم میں پہلی بار گرفتار ہوا تو میرے احباب سبط حسن اور مجاز نے ہمارے رسالے (نیا ادب) میں غالب کے دو اشعار سے اس گرفتاری کا استقبال کیا:

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنوں عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا
خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبراویں گے کیا؟

اردو نہایت خوبصورت اور دل آویز زبان ہے اس کے ہزار بارہ سو کلاسیکی اشعار میں اتنی وسعت ہے کہ ان کے اندر ایک دنیائے معانی آباد ہے اور وقت ضرورت ہر موقع، ہر محفل، ہر کیفیت، ہر مزاج کا شعر زبان پر آجاتا ہے اور انسانی جذبات کی کہکشاں میں ایک ہی لفظ طرح طرح کے معنی اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے دو عاشقانہ شعر میری گرفتاری پر اس طرح صادق آئے ہیں جیسے اسی موقع کے لیے کہے گئے ہوں۔ اردو شاعری نے اپنے جمالیاتی سفر میں ملک اور اقوام کے سیاسی سفر سے بے نیازی اور بے گانگی کا انداز کبھی اختیار نہیں کیا۔ اس کے پاس صوفیانہ روایات کا جو ورثہ ہے اس میں مذہبی بیوروکریسی اور دنیاوی بیوروکریسی دونوں سے اجتناب شامل ہے، شیخ، ناصح، واعظ، زاہد، محتسب، ملا اور اس قبیل کے دوسرے کردار اردو شاعری کے ہدف ملامت ہیں۔ ان کی تنگ نظری، انتہا پسندی، ظاہر داری، مکاری اور خود پسندی پر خوب طنز کیا گیا ہے۔ ان کے تصور مذہب اور تصور جنت و دوزخ، عذاب و ثواب سب کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ ان کے مقابل

پرندوں اور عاشقوں کی دنیاں ہے جن کے دل انسانی ہمدردی سے سرشار ہیں۔ خدا تک پہنچنے کے لیے انسان سے محبت کرنا ضروری ہے۔ سب سے بڑا گناہ دل توڑنا ہے۔ اس میں مومن اور کافر کی تفریق نہیں ہے۔ اللہ حسین اور حسن سے محبت کرتا ہے اور حسن کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ یہ ساری کائنات حسن کی جلوہ گری ہے اور اس جلوہ گری کے بے شمار رنگ ہیں بقول غالب:

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

قرون وسطیٰ میں یہ انداز نظر انقلابی تھا، زندگی کے نئے تقاضوں نے اس انداز نظر میں نئی وسعتیں پیدا کیں۔ نئی تشبیہیں، نئے استعارے، نئے شعری پیکر، نئی فکر کے لیے ضروری تھے۔ انیسویں صدی تک اردو زبان ترقی کی اس منزل تک پہنچ گئی تھی کہ اعلیٰ علوم کے لیے ذریعۂ تعلیم بن سکے۔ اس کے بعد اقبالؔ اور پریم چند کا زمانہ آجاتا ہے اور اردو زبان وادب بیسویں صدی میں داخل ہو جاتے ہیں۔

میرے نزدیک جدید دور کی ابتدا غالب کی پیدائش سے چالیس سال پہلے 1757ء میں ہوئی جب پٹنہ کے شاعر راجہ رام نرائن موزوں نے جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد ایک شعر میں نہایت دل دوز مرثیہ کہا ہے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری

یہ ہندوستان کی غلامی کی ابتدا تھی جس کی تکمیل 1857ء میں پہلی جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد ہوئی اور ملکہ وکٹوریہ قیصر ہند کا لقب اختیار کر کے ہندوستان کی مہارانی بن گئی۔ 1757ء سے 1947ء تک ایک سو نوے برس اردو شعر وادب کے سب سے زیادہ زریں سال ہیں۔ اس زمانے میں اردو نے اپنا جمالیاتی کردار بھی ادا کیا ہے اور سیاسی کردار بھی۔ اردو کے بے شمار ادیب اور شاعر جنگ آزادی کے سپاہی رہے ہیں۔ ان میں بعض ایسے ادیب اور عالم بھی شامل ہیں جنھیں اخبار شائع کرنے کے جرم میں قتل کیا گیا یا جلا وطنی کی سزا دی گئی۔ ان میں سب سے نمایاں مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین آرزردہ کے نام ہیں جو اپنے وقت کے بڑے عالم اور غالبؔ کے گہرے دوست تھے۔

ہندوستان کی ہر زبان نے آزادی کی لڑائی میں پورا حصہ لیا ہے لیکن چند ایسے

واقعات ہیں جن پر ہمیں ناز ہے بیسویں صدی میں 1947ء تک ہم نے غلامی کے خلاف آندولن میں دو قومی ترانے استعمال کیے ایک "وندے ماترم" اور دوسرا "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اب سرکاری طور پر جن گن من ہمارا قومی ترانہ ہے لیکن "وندے ماترم" اور "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" عوام کے دل میں زندہ ہیں۔ ہمارا سب سے زیادہ زوردار نعرہ "انقلاب زندہ باد" ہندوستان گیر نعرہ رہا ہے۔ یہ اردو زبان کی دین ہے۔ اردو زبان کے شعروں میں ضرب المثل بن جانے کی جو صلاحیت ہے یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ ہمارے بہت سے انقلابی شہیدوں کی زبان پر آخر وقت اردو کے اشعار تھے۔ مثال کے طور پر کاکوری کیس کے شہید رام پرشاد بسمل نے اپنے ہم نام بسمل عظیم آبادی کی غزل کو پھانسی کے تختہ سے پڑھ کر لافانی بنا دیا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
راہ رو راہ محبت تھک نہ جانا راہ میں
لذت صحرا نوردی دوریٔ منزل میں ہے

یہ اشعار آج بھی ہماری ہمت کو بلند کرتے ہیں اور ہمیں ہر مشکل کا سامنا کرنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔ ان شعروں میں خون شہیداں کی گرمی ہے۔ اسی طرح بھگت سنگھ نے پھانسی کے سائے میں بیٹھ کر آخری خط جو اپنے چھوٹے بھائی کرتار سنگھ کو لکھا ہے اس میں اقبال کے دو اشعار کے بعد ایک مصرعہ واجد علی شاہ کا تحریر کیا ہے:

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کیسی عجیب بات ہے کہ آزادی کے پچاس سال بعد بھی غالب اور اردو دونوں بے گھر ہیں۔ اردو فرقہ وارانہ سیاست کی شکار ہوئی۔ تقسیم ہند نے سب سے زیادہ نقصان اردو زبان کو پہنچایا ہے۔ اگر اس وقت غالب کے دو سو سالہ جشن کے موقع پر غالب کو گلی قاسم جان میں اپنا گھر مل جائے اور اردو کو شمالی ہندوستان میں اپنا علاقہ، جہاں سے وہ ہندی کے ساتھ دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے زندہ رہ کر ترقی کر سکے، تو بہت بڑے نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔ اس کی مثال بہار کی ریاست میں موجود ہے جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ غالب اور اردو ایک ہی تہذیب کی پیداوار ہیں اور شمالی ہندوستان کی مشترکہ

میراث ہیں۔ فرقہ وارانہ سیاست کے اثرات نے اس تہذیب کو بھی زخمی کردیا ہے۔

ہندو مسلم اتحاد ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی ہم وسیع تر قومی اتحاد کا تصور کر سکتے ہیں اور جب وطن کے چمن میں مختلف تہذیبوں، مختلف مذہبوں کے پھول کھل سکتے ہیں، میرے ذہن میں اتحاد اور دوستی کا جو تصور ہے وہ بہت حسین ہے۔ میں اس کی جمالیاتی فضا کو ایک کہانی کی شکل میں بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

برسوں پرانی بات ہے میں نے ایک بنگالی کہانی پڑھی تھی۔ اب نہ تو کہانی کا نام یاد ہے نہ اس کا عنوان، صرف کردار یاد ہیں۔ درگا پوجا کا زمانہ تھا۔ بنگال کے ایک گاؤں میں دوپہر ڈھلنے کے بعد کچھ لڑکیاں تالاب میں نہانے جارہی تھیں۔ راستہ میں ایک چوڑی والا ملا۔ منیہار کی ٹوکری میں کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں دیکھ کر لڑکیاں تڑپ اٹھیں اور چوڑیاں پہننے کے لیے بیٹھ گئیں۔ منیہار کو پیسے دے کر سب ہنستی کھیلتی تالاب کی طرف چلی گئیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد منیہار نے دیکھا کہ ایک بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں والی لڑکی خاموش اور اداس کھڑی ہوئی ہے۔ اس نے پوچھا کہ تم نے چوڑیاں کیوں نہیں پہنیں، تو لڑکی نے جواب دیا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں اگر ادھار دے دو تو پہن لوں گی۔ کہنا کہ تم نے اس کی بیٹی کو ادھار چوڑیاں پہنائی ہیں۔ وہ اس پر راضی ہو گیا اور لڑکی کی دونوں کلائی کو لال لال چوڑیوں سے بھر دیا۔ وہ خوش خوش تالاب کی طرف چلی گئی اور منیہار گاؤں کے مندر کی طرف لیکن جب پجاری سے بات کی تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب پجاری نے کہا کہ میری تو کوئی بیٹی نہیں ہے۔ میں نے تو شادی بھی نہیں کی۔ لیکن جب منیہار کی زبان سے لڑکی کے حسن کی تعریف سنی تو چیخ اٹھا کہ یہ تو درگا کی تصویر ہے۔ میں نے عمر بھر اس کی پوجا کی لیکن انھوں نے مجھے آج تک درشن نہیں دیئے اور ایک اجنبی کو جس نے کبھی ان کی پوجا نہیں کی، درشن دے کر خوش کر دیا۔ وہ کہاں گئی ہے۔ جلدی بتاؤ۔

جب دونوں تالاب کے کنارے پہنچے تو وہاں سناٹا تھا، لڑکیاں نہا کر جا چکی تھیں۔ پجاری نے پھر شکایت شروع کر دی ”درگاماں، یہ کیسی ناانصافی ہے کہ تم نے اپنے پجاری کو درشن نہیں دیئے۔“ تھوڑی دیر میں بیچ تالاب میں پانی کے اندر سے دو نہایت خوبصورت ہاتھ باہر نکلے اور وہ لال لال چوڑیوں سے جگمگا رہے تھے۔

بنگالی کہانی یہاں ختم ہو گئی۔ میں نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ اتنے میں سورج

ڈوب گیا اور گاؤں کی چھوٹی سی مسجد سے شام کی اذان کی آواز آئی۔ منیہار مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اتر پردیش کے شہر فیروز آباد سے چوڑیاں بیچنے آیا تھا۔ اس کا نام عبداللہ تھا اور اس مسجد کے گنبد پر کلس کے نیچے شام کی سرمئی اور گلابی روشنی میں کنول کا پھول مسکرا رہا تھا۔ یہ پھول چار پانچ برس کا سفر طے کر کے مسجد کے گنبد تک پہنچا ہے اور ہندو، بودھ اور مسلم اتحاد باہمی کی خوبصورت علامت ہے، زمانہ ماقبل تاریخ میں یہ دھان کے کھیتوں، تالابوں اور جھیلوں میں نظر آتا تھا۔ پھر لکشمی کے بازو کی آرائش بن کر ظاہر ہوا۔ اجنتا کی دیوار پر ایک بودھستو کے ہاتھ میں مسکرا رہا ہے۔ ادب اور آرٹ کی دنیا میں یہ پیروں، ہاتھوں اور آنکھوں کا استعارہ ہے۔ جب کنول کی شکل کے چراغ ان بنے تو چراغ کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ بودھ وہاروں سے ہوتا ہوا یہ صوفیوں کی درگاہوں میں سامان آرائش بنا اور مسجد کے محرابوں اور گنبدوں کو سجانے سنوارنے کے کام آیا۔ ہمایوں کے مقبرہ کا گنبد جس پر کنول کا پھول نہیں ہے اتنا خوبصورت نہیں جتنا تاج محل کا گنبد یا دہلی کی جامع مسجد کے گنبد۔ ہندوستانی مسجدوں کے گنبد۔ ایران، عراق اور عرب ممالک کے گنبدوں سے مختلف ہیں۔ ان کا مزاج ہندوستانی ہے۔

میں سوچ رہا ہوں کہ یہ کنول کا پھول اپنی لطافت اور نزاکت، پاکیزگی اور شرافت کے ساتھ مسکراتے رہے گا یا نیوکلیر جنگ کے شعلوں میں جھلس کر راکھ کا ڈھیر بن جائے گا۔ میں اس خیال سے خوف زدہ ہوں کہ خدانخواستہ نیوکلیر جنگ ہوئی تو کیا ہو گا۔ میری پرورش اور تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہے جس میں روز قیامت اور یوم حساب پر یقین ایمان کا جزو سمجھا جاتا ہے کسی کو نہیں معلوم کہ قیامت کب آئے گی مگر جب آئے گی تو پہاڑ دھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑ جائیں گے اور سورج اپنی بلندی سے نیچے اتر کر سوا نیزے کے فاصلے پر آجائے گا۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا نیوکلیر جنگ اس سے کم بھیانک ہو گی۔ پرانے زمانے کے حکمراں اپنے زمانے کے سنتوں، صوفیوں اور شاعروں سے نصیحت حاصل کرتے تھے۔ ہمارے پردھان منتری کو باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے سینے میں ان کا شاعر دوست بیٹھا ہوا ہے۔

●●

گوشۂ
حاجی انیس دہلوی

○

ہزاروں غم ملے لیکن، کبھی آنسو نہیں آئے
ہماری طرح جینے کا، کوئی انداز کیا جانے

❑

انیسؔ اپنی ہستی ہے دن کا اُجالا
جب آنکھیں مُندیں گی تبھی رات ہوگئی

❑

اُس نے خوشیوں کے خزانے وا کئے مجھ پر مگر
بے تحاشا روشنی کی تیرگی حاصل نہ ہو

❑

زندگی بھرپور جی لو وقت جتنا مل سکے
جانے کب وہ مختصر کر دے کہانی کاٹ کر

❑

کیا اُن سے انیسؔ آپ گلہ کرنے چلے ہیں
جو لوگ طبیعت میں وفا ہی نہیں رکھتے

❑

رضوان احمد

بلائے جاں تھی غالبؔ جس کی ہر بات

الفی سال ختم ہوتے ہوتے ایک اور پر بہار گل و گلزار شخصیت کو اپنے ساتھ لے گیا۔ یوں تو الفی سال صفر سے عبارت ہے اور یہ سفر بہتوں کو صفر بنا گئے لیکن ہمارے درمیان سے جو قیمتی شخصیتیں اٹھ گئیں انھوں نے شعور اور لاشعور میں زیادہ خلا پیدا کیا۔ حاجی انیس دہلوی بھی ایک ایسی ہی باغ و بہار شخصیت کا نام تھا جنھوں نے سال کی تیسویں تاریخ کو داعی اجل کو لبیک کہی اور 31 دسمبر کو دہلی کے قبرستان مہندیان میں دفن ہوئے۔

حاجی انیسؔ دہلوی ایک ہشت پہل شخصیت کا نام تھا۔ انھوں نے کبھی کسی مکتب، مدرسے اسکول یا کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن کائنات کا اتنا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے تجربات اتنے وسیع تھے کہ بات کرنے پر گویا دبستاں کھل جاتا تھا۔ مجھے اب یاد نہیں آرہا ہے کہ ان سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی البتہ ایسا یاد پڑتا ہے کہ ان سے میرا تعارف مرحوم سلامت علی مہدی صاحب نے کروایا تھا۔ غالباً ''شمع'' کے دفتر میں۔ میں سلامت صاحب کا زبردست مداح تھا اور ان سے ملنے کے لیے شمع کے ادارے سے نکلنے والے ڈائجسٹ ''شبستان'' کے ایڈیٹر سلامت علی مہدی سے ملنے کے لیے گیا تھا۔ وہیں حاجی انیسؔ دہلوی صاحب سے ملاقات ہوئی یہ غالباً 1969ء کی بات ہے۔ اس کے بعد 1972ء میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کی بنیاد پڑی اور اس کے باعث حاجی صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ جب بھی دہلی جاتا ان سے ملنے کے لیے ان کے ''رہبر کارنر'' پر ضرور حاضری دیتا۔ وہ اتنے مہمان نواز تھے کہ کھلاتے پلاتے صبح سے رات ہو جاتی۔ اکثر سلامت علی مہدی صاحب بھی وہاں آجاتے تھے اور جو لوگ سلامت صاحب سے ملے ہیں انھیں اندازہ ہے کہ ان کی گفتگو میں کیا کیفیت ہوتی تھی کہ بس وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ انسان

پتہ : سکریٹری، بہار اردو اکادمی، اشوک راج پتھ، پٹنہ۔ ۴

کھائے پیے بغیر ان کی گفتگو صبح سے شام تک سن سکتا تھا۔ اس طرح سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ ان سے زیادہ قربت اس وقت بڑھی جب 1974 میں اردو ایڈیٹرس کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا جو بہت ہی ہنگامہ خیز اجلاس تھا۔ ہم لوگ ایک ساتھ ہی ٹھہرے تھے۔ چار پانچ دنوں تک گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ پھر 1975ء میں کلکتہ اجلاس ہوا جس میں حاجی صاحب، سلامت صاحب کے ساتھ ہی تشریف لائے تھے اور ایک ڈنر کے موقع پر جب مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات ودیا چرن شکلا صاحب سے حاجی صاحب کا تعارف کروایا جارہا تھا اور ان کے ساتھ جب ایڈیٹر ''فلمی ستارے'' کہا گیا تو شکلا صاحب یکبارگی ہنس پڑے اور کہا کہ کیا فلمی ستارے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ حاجی صاحب نے بھی زور کا قہقہہ لگایا اور فرمایا۔

بنا کر فقیروں کا کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

اس کے بعد حاجی صاحب کے ساتھ میں نے پنجاب کا سفر کیا، آندھرا پردیش کا سفر کیا اور ہم لوگ ہفتوں ایک دوسرے کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ان اسفار میں جہاں بہت سے مدیران تھے وہیں سلامت علی مہدی صاحب تھے جن کی باتوں سے ہم لوگ راستے بھر لطف اندوز ہوتے رہتے تھے اور پھر حاجی صاحب تو اپنی باتوں سے محفل کو زعفران زار بناتے ہی رہتے تھے۔

حاجی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوستوں کے دوست تھے۔ ان سے اگر میں نے کسی کو ایک بار ملوادیا اور وہ ان کے پاس کسی بھی کام کے لیے گیا تو انھوں نے کبھی انکار نہیں کیا۔ انھوں نے کئی اخبارات اور رسائل نکالے تقریباً نصف صدی تک اس دشت کی صحرا نوردی کی۔ سب سے پہلے انھوں نے ''رہبر کارنر'' کے ذریعہ ابن صفی کے جاسوسی ناول چھاپنے شروع کیے تھے اس وقت جاسوسی ناولوں کا دور دورہ تھا اور ان کے یہ ناول ہاٹ کیک کی طرح فروخت ہوتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک ''نرالی دنیا'' ڈائجسٹ نکالنا شروع کیا جس کے کئی شمارے شائع ہوئے مگر یہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ پھر انھوں نے ''ہمارا رہبر'' نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا مگر وہ بھی زیادہ دنوں تک شائع نہیں ہو سکا۔ صحافت میں ان کے قدم ''فلمی ستارے'' کے سبب ہی جم سکے۔ بعد میں انھوں نے خواتین کا رسالہ 'باجی' نکالنا شروع کیا۔ اس رسالے نے بھی اپنے قدم جلد ہی جمالیے۔ حالانکہ انھوں

نے جب فلمی ستارے نکالنا شروع کیا تھا وہ شمع کے عروج کا زمانہ تھا اس وقت روبی بھی بازار پر چھایا ہوا تھا اس کے علاوہ بھی متعدد چھوٹے بڑے فلمی رسالے شائع ہوتے تھے لیکن حاجی انیس دہلوی نے فلمی ستارے کو ایک نئے رنگ روپ میں پیش کیا اور ان کا یہ رسالہ صرف فلمی ہی نہیں ادبی حلقوں میں بھی جلد ہی مقبول ہو گیا۔ انتقال سے قبل انھوں نے ایک ادبی رسالہ 'ایوان ادب' بھی نکالنا شروع کیا تھا لیکن اس کے صرف دو ہی شمارے شائع ہو سکے مگر ان دونوں شماروں کی حیثیت دستاویزی ہے۔ انھوں نے پہلے ہی شمارے میں اعلان کر دیا تھا کہ انھوں نے یہ رسالہ کچھ کمانے کے لیے نہیں بلکہ گنوانے کے لیے نکالا ہے لیکن پہلے شمارے کی اشاعت کے بعد ہی وہ بہت شدت سے بیمار ہو گئے اور پھر دوسرا شمارہ ان کی موت سے چند دنوں قبل ہی چھپ کر آیا تھا۔

حاجی صاحب نے 71 سال کی عمر پائی۔ تقریباً نصف صدی صحافت میں لگائی اور گزشتہ ایک دہائی سے انھوں نے شاعری بھی شروع کر دی تھی اور ان کا ایک شعری مجموعہ "قدم بہ قدم" شائع ہو کر منصۂ شہود پر آیا تھا۔ جس کی ادبی حلقوں میں زبردست پذیرائی ہوئی تھی۔ یہ بھی اپنے آپ میں ایک مثال ہی ہے کہ صرف ایک سال کے اندر اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اس کو کئی اردو اکادمیوں اور اردو اداروں نے انعام و اعزاز سے نوازا تھا۔

حاجی صاحب شدید علالت کے سبب گزشتہ پندرہ سولہ برسوں سے سماعت سے محروم ہو گئے تھے لیکن ان میں بلا کی ذہانت تھی۔ وہ ہونٹوں کی جنبش سے جملے پہچان جاتے تھے اور نہ پہچانتے ہوں تو کاغذ قلم ساتھ ساتھ رکھتے تھے اور فوراً لکھوا لیتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے شگفتہ انداز میں کہتے تھے کہ بھائی اب فیکس کا زمانہ آگیا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی فیکس والا ہی بنا دیا ہے۔

ان کی موت کی خبر سننے کے بعد میرے ذہن میں یادوں کا سیلاب سا موجزن ہو گیا کیوں کہ گزشتہ پچیس تیس برسوں میں ان سے سیکڑوں ملاقاتیں ہوئیں، سفر، خلوت اور جلوت میں ساتھ ساتھ رہے، کتنے ہی جلسے جلوس اور تقریبات میں شریک ہوئے لیکن کچھ باتیں یاد کر کے تو ذہن میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ حیدر آباد میں ہم لوگ بسوں پر بیٹھ رہے تھے اور ایشیا کے سب سے بڑے ڈیم کو دیکھنے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے لیکن حاجی صاحب باتھ روم سے برآمد ہی نہیں ہو رہے تھے۔ ہم لوگوں نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تو

حاجی صاحب اندر سے رقص کرتے ہوئے نکلے تو ان کی ایک نئی صفت کا پتہ چلا اور سلامت صاحب نے بتایا کہ وہ کتنے مشاق رقاص ہیں۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ بہتوں کو انگلیوں پر نچانے کا فن جانتے ہیں لیکن ان کی اس صفت سے واقفیت نہیں تھی اور اس کے بعد تو سلامت صاحب نے اپنے نطق کے دریا ہی بہا دیئے۔ اسی سفر میں ہم لوگ جب ڈیم دیکھ کر واپس لوٹ رہے تھے تو ایک جگہ پر آدی باسی خواتین جنھیں وہاں کی زبان میں لمباڑن کہا جاتا تھا رقص کر رہی تھیں تو حاجی صاحب نے بھی ان کے ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا اور ہم سب کو خوب خوب محظوظ کیا۔

ایک بات اور بھی یاد آرہی ہے غالباً 1984ء کی بات ہے رمضان المبارک کے موقع پر مرکزی وزیر محسنہ قدوائی کے گھر پر ایک افطار پارٹی تھی جس میں صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ بھی تشریف لائے ہوئے تھے حاجی صاحب نے ان سے کہا کہ گیانی جی اس بار راشٹر پتی بھون میں بھی افطار پارٹی ہونی چاہیے۔ گیانی جی نے فوراً ہی اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ اس بار راشٹر پتی بھون میں افطار پارٹی کا انعقاد کیا جائے۔ یہ بات رکھنے کی ہے کہ اس سے قبل کبھی کبھی راشٹر پتی بھون میں افطار پارٹی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی بنیاد حاجی صاحب کی فرمائش پر گیانی ذیل سنگھ نے ڈالی تھی جو اب ہر سال منعقد ہوتی ہے۔ چار سال قبل وہ پٹنہ تشریف لائے تھے انھیں سمستی پور کے ایک ادارے نے اعزاز سے نوازا تھا۔ راستہ میں جاتے وقت اور واپسی پر پٹنہ میں رکے تو بیشتر وقت میرے ساتھ ہی گزارا۔ وہ جہاں ادیبوں شاعروں، صحافیوں سے ملے وہیں پھلواری شریف سے آگے ایک دور افتادہ گاؤں میں بھی تشریف لے گئے۔ میں نے وہاں جانے کا سبب پوچھا تو کہنے لگے بھئی وہاں ایک بہت پریشان حال ضعیف بیوہ خاتون رہتی ہے جس نے مجھے کئی خط لکھے تھے اور میں کچھ رقم اسے دینا چاہتا ہوں اور وہ رقم اسے دے کر واپس آئے تو ان میں بہت طمانیت کا احساس تھا۔ میں ان کے اس جذبے سے بے حد متاثر ہوا۔ میرا تو یہ اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو نوازتا ہے تو وہ اس کی خوبیوں کے سبب ہی نوازتا ہے۔ میں نے حاجی صاحب کی جدوجہد اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ بیس سال قبل وہ دہلی میں ایک کرایہ کے چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے لیکن اپنی جدوجہد سے انھوں نے دو بڑے اور عالیشان مکان خریدے، جدید ترین پریس لگایا، کمپیوٹر سیکشن قائم کیا متعدد اداروں سے ان کی وابستگی تھی خاص طور سے جب تک سلیم جعفری صاحب حیات

رہے دوبئی کے عالمی مشاعروں کے روح رواں حاجی صاحب ہی تھے اور ان ہی کے تعاون سے ان کے عظیم الشان یادگاری مجلے شائع ہوتے تھے۔ وہ ہر سال بلکہ سال میں کئی بار دوبئی، ابوظہبی، شارجہ، قطر وغیرہ تو جاتے ہی تھے اس کے علاوہ امریکہ اور لندن کے سفر میں بھی گئے۔ ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ "دست دعا" بھی جلد ہی شائع ہونے والا تھا لیکن افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا۔

میری ان سے آخری ملاقات گزشتہ سال اس وقت ہوئی تھی جب میں قومی کونسل کے ایک سیمینار میں شرکت کی غرض سے دہلی گیا تھا۔ انھوں نے اس کے مندوبین کو اپنے گھر کھانے پر بلایا تھا چونکہ میری ٹرین اسی وقت تھی اس لیے میں صرف تھوڑی دیر ہی رک سکا تھا اور یہ ملاقات بہت تشنہ رہی تھی۔ لیکن اب یہ تشنگی ابد تک باقی رہے گی کیوں کہ حاجی صاحب اس دنیا کو چھوڑ کر سفر آخرت پر جا چکے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کے تینوں صاحبزادگان کفایت دہلوی، ناصر دہلوی اور سمیع دہلوی بہت ہی فرماں بردار ہیں اور ان لوگوں سے یہ امید غلط نہیں ہے کہ وہ اپنے والد صاحب کے مشن کو آگے بڑھائیں گے۔ ہم تو حاجی صاحب کی موت پر یہی کہہ سکتے ہیں کہ

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

●●

ف. س. اعجاز

ذکر ایک ایڈیٹر اور رابطہ آفیسر کا

کسی شخص کے کارناموں کا جائزہ لینے یا اس کی زندگی کے کسی خاص پہلو پر روشنی ڈالنے سے پہلے اس کے بارے میں خاطر خواہ معلومات حاصل ہونا ضروری ہیں۔ میری خوش نصیبی ہے کہ انیس دہلوی، ایک سرگرم صحافی، سماجی کارکن اور دہلی کی ثقافتی محفلوں کی جان اور کئی انجمنوں کے روحِ رواں، میرے خاص دوستوں میں شامل رہے۔ لیکن افسوس اس کا ہے کہ ان کے مکمل سوانحی کوائف میری آنکھوں سے اوجھل ہیں اور پھر ایک طویل فاصلے سے کسی کے بارے میں محض کچھ اندازے قائم کر کے لکھنے کی جسارت کرنا کٹھن کام ہوتا ہے۔

بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ انیس دہلوی سے میرے مراسم برسوں پرانے ہیں۔ مشاعروں اور محفلوں میں ان کے ساتھ شرکت کے کئی مواقع آئے۔ ان کے موقر رسالوں میں میری شعری تخلیقات بطور خاص جگہ پاتی رہی ہیں۔ بلکہ ان کا مجھ پر خاص کرم رہا ہے۔ میری رائے میں وہ ایک کھرے آدمی اور بااصول مدیر ہیں۔

انیس صاحب اور مجھ میں دو ایک باتیں مشترک بھی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ ہم دونوں دہلوی ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ اس وقت دو رسالے نکالتے ہیں اور مجھے بھی کلکتہ سے دو رسالے نکالنے کا تجربہ ہے۔ پہلا اپنی طالب علمی کے زمانے میں نکالا اور تیرہ شماروں کے بعد بند کر دیا۔ دوسرا رسالہ "انشاء" اب پندرھویں سالگرہ منا چکا ہے۔ انیس دہلوی "فلمی ستارے" اور "باجی" رسائل نکال رہے ہیں اور ماضی میں دو ایک اخباری دھندے بھی کر چکے ہیں۔ میں بھی اپنے پہلے رسالے "فانوس ڈائجسٹ" (ہندوستان کا پہلا اردو ڈائجسٹ اور بنگال کا اولین آفسیٹ جریدہ جو اپنے برادرِ محترم کے ساتھ نکالا) کے بند ہو جانے کے بعد دو ہفتہ روزہ اخبارات کا عملی معاون یا مدیرِ بے قلمدان رہ چکا ہوں۔ میں نے کم از کم تین سال جم کر فلمی صحافت بھی کی ہے، اور اگر یہ تجربات مجھے حاصل نہ ہوتے تو میری یہ درگت یا

اہلیت نہ ہوتی جواب ہے، اور نہ میں انیسؔ دہلوی جیسے ہنر مندوں کا قدر داں اور پرستار ہوتا۔

نعمت اللہ انیسؔ کا گرچہ حافظ یوسف دہلوی سے کوئی رشتہ نہیں لیکن فلمی و ادبی صحافت میں وہ "دہلوی سیریز" کی ایک مکمل اور بھرپور کتھا ہیں جس کا آغاز بلاشبہ مرحوم حافظ یوسف دہلوی نے اپنے رسالے "شمع" کے ذریعہ کیا۔ بانیٔ "شمع" نے اردو صحافت کو انوکھا راستہ دکھایا اور فلم و ادب کی ایک ہی جریدے کے ذریعہ وہ شاندار خدمات انجام دیں کہ ان کا نام رہتی دنیا میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے ایک شخص کی کامیابی دوسروں کے لیے مشعل راہ بنتی ہے اور اس کے بعد اس کے نقوش قدم پر چلنے کے تمنائی بھی سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ اردو فلمی صحافت کے اچھے دنوں میں جو رسائل نکلنا شروع ہوئے ان میں ایک رسالہ "فلمی ستارے" بھی ہے جس نے نعمت اللہ انیسؔ کو انیسؔ دہلوی بنا دیا۔

حاجی انیسؔ ترکمان گیٹ کی کلاں مسجد کے زیر سایہ اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں اپنے تخت صحافت پر براجمان ہیں۔ "تخت" اس لیے کہا کہ اب انھوں نے اپنی کرسی (یا کرسیاں؟) اپنے بیٹوں کو دے دی ہیں۔ اور خود ایک چوکی پر ڈیسک کے آگے اپنے بیٹوں کفایت، ناصر اور سمیع کے ہادی و مرشد بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ "بیٹھے رہتے ہیں" سے کوئی یہ مراد نہ لے کہ خرقہ پوشوں کی طرح بیٹھے رہتے ہیں بلکہ ہمہ وقت اور ہمہ تن کام میں جٹے رہتے ہیں۔ جب دیکھو تیشے سے لگے مستری کی طرح کاری گری میں منہمک و مشغول نظر آتے ہیں۔ موصولہ ڈاک کی چھنٹائی ہو رہی ہے، غزلیں نظمیں الگ رکھی جا رہی ہیں، افسانے و مضامین الگ۔ خام تخلیقات کو اشاعت کے قابل بنایا جا رہا ہے، ناقابل اشاعت تحریریں مصنفوں کو واپس بھیجی جا رہی ہیں یا ردی کی ٹوکری کی نذر کی جا رہی ہیں۔ خطوں کے جواب بھی لکھے جا رہے ہیں، پروف ریڈنگ بھی ہو رہی ہے، قینچی سے کاٹنے تراشنے کا عمل جاری ہے اور ملاقاتیوں کی آمد کا سلسلہ بھی چل رہا ہے۔ اور یہ سب ایک ایسا آدمی کر رہا ہے جس کی سماعت اور نصف بدن کی خاصی طاقت فالج کی نذر ہو چکی ہے۔

عام طور پر حاجی انیسؔ دہلوی سے ملنے جو لوگ ان کے دفتر آتے ہیں اُن کی توجہ ان معمولات پر نہیں ہوتی۔ انیسؔ دہلوی کا پبلک ورک اتنا اچھا ہے کہ ان کے لکھنے پڑھنے والے ہی کیا وہ خود بھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ خیر سے دبئی کے سلیم جعفری مرحوم کی مشاعرہ تنظیم سے دس گیارہ سال وابستہ رہے۔ وابستگی کے آخری دو تین برسوں میں حاجی

انیسؔ دہلوی اپنے نام کے آگے سلیم جعفری کی "بونی کیر ئیرز" کا عوامی رابطہ آفیسر لکھنے لگے جیسے یہ کوئی پی ایچ ڈی کی ڈگری ہو جسے لٹریچر کے ڈاکٹر اپنے نام کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں۔ بہر حال بر صغیر میں اپنے اسمائے گرامی کے آگے ایم اے پی ایچ ڈی لکھنے والے اردو ادیبوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ لیکن ساری دنیا میں حاجی انیسؔ واحد مدیر ہیں جو خود کو رابطہ آفیسر لکھتے ہیں بلکہ لوگوں سے اپنی یہ حیثیت منوا بھی چکے ہیں۔ جب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے عظیم المرتبت نقاد آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر تبسم لاکر کسی محفل میں انھیں "جناب رابطہ آفیسر" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو لوگ محسوس کرتے ہیں حاجی صاحب واقعی کسی خطاب سے نوازے جا رہے ہیں۔ یہ کہنا البتہ مشکل ہے کہ خود انیسؔ دہلوی کو نارنگ جیسے اہلِ بینش کی داد متاثر کرتی ہے یا نہیں چونکہ انیسؔ صاحب نہ صرف دنیا کے واحد ڈیکلیرڈ پی آر او (P.R.O.) مدیر ہیں بلکہ ایسے واحد پی آر او بھی ہیں جو کسی کی نہیں سنتا۔ محترم جناب ادبی محفلوں میں مہمانیہ یا صدارتی خطبے میں کھلے عام کہتے ہیں "ڈاکٹر نارنگ کچھ کہیں یا قمر رئیس کچھ فرمائیں میری بلا سے، میں کسی کی نہیں سنتا۔ میں تو بس اپنی سناتا ہوں اور میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔

بات ٹھیک بھی ہے۔ حاجی انیسؔ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جب سے قدرت نے انھیں سماعت سے محروم کر دیا ہے وہ اشاروں اور کنایوں سے ہی دوسروں کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور حیرت انگیز حد تک ان کے بیشتر اندازے درست نکلتے ہیں۔ قدرت نے ان سے ایک حس چھین کر ان کی دیگر حسیں تیز کر دی ہیں۔ آلۂ سماعت ان کے لیے کارگر نہیں اس لیے اس کا استعمال وہ نہیں کرتے۔ اب ان کو اتنی مشق ہو گئی ہے کہ ایک بار کسی کی گفتگو کا سرا ہاتھ آجائے تو پھر اس کی لب کشائی سے پہلے خود بیان کر کے اُسے حیران چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ حاجی صاحب بھی صاف سن سکتے ہیں جیسے ان کا نہ سننے کا مظاہرہ محض اداکاری ہو۔ بہر حال بے سماعتی کبھی کبھی فتنہ و فساد کی موجب بھی ٹھہرتی ہے۔ مولائے روم کی ایک حکایت ہے کہ ایک بہرے کا پڑوسی بیمار ہو گیا۔ بہرے نے دل میں کہا کہ میرا فرض ہے اس کی عیادت کو جاؤں۔ لیکن ان بہرے کانوں سے میں اس نوجوان کی بات کیا سمجھوں گا جب کہ بیماری کے سبب اس کی آواز بھی کمزور ہو گی۔ لیکن مجھے وہاں جانا ہی چاہیے۔ یہ میرا فرض ہے۔ اس کے ہونٹوں کے ہلنے سے میں خود بخود قیاس

کرلوں گا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں اس سے پوچھوں گا میرے مصیبت زدہ دوست تم کیسے ہو؟ وہ کہے گا اچھا ہوں یا خوش ہوں۔
میں کہوں گا اللہ کا شکر ہے۔ بابا کیا کھایا ہے؟ وہ شوربہ یا اڑد کا شوربہ بتائے گا۔ میں کہوں گا تیرا پینا مناسب تھا۔ کون طبیب تیرا علاج کر رہا ہے؟ وہ کہے گا فلاں۔ میں کہوں گا وہ بہت مبارک قدم ہے۔ وہ آتا ہے تو تیرا کام اچھا ہو جائے گا۔

یہ قیاسی جواب ٹھیک کر کے بہرا اپنے نیک بیمار پڑوسی کے پاس گیا۔ اس کے پاس بیٹھا اور اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس سے پوچھا تو کیسا ہے؟ بیمار نے کہا۔ "میں تو مر گیا" اس نے کہا۔ "شکر ہے"۔ اُس سے بیمار کو تکلیف ہوئی کہ یہ کیسا شکر ہے۔ یہ ہمارا دشمن ہوا ہے۔ بہرے نے پھر کہا تو نے کیا کھایا ہے؟ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ "زہر!"۔ بہرے نے کہا۔ "یہ بالکل مناسب تھا۔" اس کا غصہ اور بڑھا، اس کے بعد بہرے نے کہا۔ "کون حکیم تیرے علاج کے لیے آتا ہے؟"۔ بیمار نے کہا۔ "ملک الموت آتا ہے۔" بہرے نے کہا۔ "اس کے قدم تو بہت مبارک ہیں، خوش ہو جا۔ میں تیرے پاس ابھی اس کے یہاں سے آیا ہوں۔ میں نے اس کو کہا ہے کہ تیری خبر گیری کرے۔"

نتیجہ ظاہر ہے کیا ہوا ہوگا۔ لیکن الحمد للہ اب تک ایسا میرے سامنے نہیں ہوا کہ کسی نے انیس دہلوی سے کھیت کی کہی ہو اور وہ کھلیان کی سمجھ بیٹھے ہوں۔

انیس صاحب کی صحیح عمر کا اندازہ لگانا بھی کبھی کبھی مشکل ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ کسی بین الاقوامی فلمی میلے کی افتتاحی تقریب میں چست سفاری سوٹ میں ملبوس کالی خضابی داڑھی کے ساتھ نپے تلے قدم رکھتے ہوئے تشریف لاتے ہیں تو جب تک ہال میں فلم ڈائرکٹر شام بینگل وارد نہ ہو جائیں فلموں کی شوقین غیر فلمی لڑکیاں انہی کو شام بینگل سمجھ کر ان کی جانب اپنی آٹوگراف بک بڑھاتی نظر آتی ہیں۔ ظاہر ہے ایسی حسینائیں آرٹ فلم کی شائقین ہوتی ہیں، ان میں بھی آرٹ کی دلدادہ زیادہ ہوتی ہیں فلم کی کم۔ اور انیس دہلوی کا آرٹ کسی سے چھپا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ان کی بیگم سے بھی نہیں جنھیں وہ اپنے آرٹ سے "باجی" کی مدیرہ بنا کر اردو قوم کی بچیوں میں اپنی تعلیم اور اخلاقی لٹریچر کا چلن عام کرنے پر مامور کر چکے ہیں۔ وحیدہ "باجی" کتنی خوش نصیب ہیں کہ انھیں ایسا شوہر ملا جو ایک دن اچانک انھیں اسلامی تکلفات کا برقع پہنا کر رسالہ "باجی" کی اجرائی کے لیے اسٹیج پر لے پہنچا

اور جناب اندر کمار گجرال کے ہاتھوں رسالے کی شاندار رسم اجرا ادا کرا دی۔ اب یہ "فلمی ستارے" کے مدیر کا آرٹ نہیں تو اور کیا ہے کہ جس زمانے میں بقول اکبر الہ آبادی بیبیوں کا پردہ مردوں کی عقلوں پر پڑ گیا ہے اور مرد بیگمات کو اسٹیج پر لانے سے پہلے ان کے برقعے اتروا دینا پسند کرتے ہیں یہ حضرت بیگم کو برقع پہنا کر اسٹیج پر لائے! حاجی جی دنیا اور دین دونوں کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ انھوں نے کس سادگی اور آسانی سے اپنی بیوی کو دنیا بھر کی باجی بنا ڈالا۔ خود دنیا بھر کا بھائی بننا کبھی منظور نہیں کیا۔ اب کسی کو اعتراض ہو تو ہو، حاجی جی کو یہ معلوم ہے کہ عورت صحیح ہو تو گھر بھی ٹھیک رہتا ہے اور دنیا بھی۔ ورنہ مرد کا کیا اسے چلتا پھرتا ڈپارٹمنٹل اسٹور بننے میں کیا دیر لگتی ہے۔

انیس دہلوی کا مزاج ہی ایسا دلچسپ ہے کہ لکھنے والا اس کا ذکر نہ کرے تو خود بددیانت کہلائے۔ وہ تصنع اور بے جا تکلف اوڑھے نہیں رہتے جیسا کہ بیشتر مشہور پرچوں کے مالکان کا شعار ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے جوان بچوں کے سامنے بھی زندہ دلی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ میں سوچتا ہوں اس خوشدلی اور بے تکلفی کے بجائے رسالے کے طفیل ملی "تھانیداری" ان کے مزاج کا حصہ بنی ہوتی تو کیا ہوتا۔

حاجی انیس اردو کی خدمت کے لیے اپنی خدمت کو بھی بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ پئے روزگار مشاعرہ و صحافت کے سلسلے میں انھیں اکثر سفر بھی درپیش ہوتا ہے۔ نقص صحت کے باوجود ان کے سفر اور ہر قسم کی محنت کا سلسلہ جاری ہے۔ جہاں پہنچتے ہیں شعراء اور شاعرات انھیں سر آنکھوں پر بٹھا لیتے ہیں۔ شاعرات میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں تو اس میں انیس دہلوی کا قصور نہیں ہے۔ ہر چند وہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں، لیکن حالات انھیں کبھی کبھی بدحواس بھی کر دیتے ہیں۔ بعض محرمات انھیں حاجی اور مربی سمجھ کر اپنے گھر بلانے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتیں۔ لیکن انھیں بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں ایک ظریف اور مرنجان المرنج آدمی کو مدعو کر بیٹھی ہیں۔

ایک بار حضرت کلکتہ تشریف لائے تو کسی پردہ نشین شاعرہ نے میری اور ان کی دعوت کی۔ دعوت تو میں نے لے لی۔ لیکن میں جا نہیں سکا۔ انیس صاحب نے بہت اصرار کیا بلکہ کچھ خفا بھی ہوئے کہ کسی کی دعوت لے کر ٹل جانا اچھی بات نہیں۔ بہر حال میرا جانا

ممکن نہیں ہوا۔ لہٰذا انیس صاحب کو اکیلے دعوت میں جانا پڑا۔ شام کو وہ خلاف معمول بہت تاخیر سے میرے دفتر پہنچے۔ چہرے سے خفگی کے بجائے بشاشت جھلک رہی تھی۔ جب سب ملاقاتی جا چکے تو ذرا رازدارانہ لہجے میں کہنے لگے "بھئی اعجاز صاحب آپ نے اس بچاری کو بہت مایوس کیا۔ میاں اصل مہمان تو اس کے آپ ہی تھے۔ آپ کہیں آتے جاتے نہیں ہیں اور بار بار وہ آپ کو پوچھتی تھی۔ جب کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا وہ کہتی شاید اعجاز صاحب آگئے۔ اور بھئی ہمارا کیا۔"

میں نے کہا "کیا ہوا میں نہیں گیا تو؟"۔ بولے "اس غریب کا نقصان ہو گیا۔ اس نے دو مرغیاں پکار کھی تھیں۔ ایک آپ کے لیے ایک میرے لیے۔ وہ آپ کو پوچھتی جاتی تھی اور مرغی کی رانیں ایک ایک کر کے میری رکابی میں ڈالتی جاتی تھی۔

انیس دہلوی کی چھیڑ خوباں سے لوگ کافی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایک بار ایک نعت گو شاعر نے ان سے دریافت کیا کہ جناب یہ جو آپ کا ہاتھ ٹھکانے بے ٹھکانے کسی کے شانوں والوں کو دبا دیتا ہے آخر ایسا کیوں؟۔ جواباً عرض کیا آپ دیکھتے ہیں شاعرات خود ہی میرے قریب آ کے بیٹھ جاتی ہیں۔ انھیں ملک سے باہر مشاعرہ پڑھنے کے لیے بھیجنے سے پہلے میں ان کے لچھن آزما لینا چاہتا ہوں تا کہ کل کلاں کو آرگنائزر شکایت نہ کر بیٹھے کہ کیسی بے غیرت بد چلن کو اس کے پروگرام میں بھیج دیا۔ لہٰذا پہلا سرٹیفکیٹ تو مجھے ہی دینا پڑتا ہے۔

حاجی انیس کی شوخی طبع اکثر لوگوں کا موضوع گفتگو بنی رہتی ہے۔ باغ و بہار طبیعت کے مالک ہیں اس لیے جہاں بیٹھتے ہیں ملنے والوں کا تانتا لگ جاتا ہے۔ شروع میں جب کوئی ان سے ملنے آتا ہے تو گفتگو کا آغاز اسے کاغذ پر لکھ کر کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد یہ کسی بھی موضوع پر اور کسی بھی سطح پر بات چیت کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔ فلم ہو، ادب ہو، ڈرامہ ہو، سنگیت ہو، سیر و سیاحت ہو، مولویت ہو، صحافت ہو یا سیاست۔ لہٰذا گفتگو فرصت میں ہو تو طویل بھی ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ کلکتہ کئی دنوں کے لیے آئے۔ میرے دفتر میں دن میں دو تین بار حاضری رہا کرتی تھی۔ پریس کی ردی دو تین دن پہلے فروخت کی جا چکی تھی۔ باقی جو رف پیڈ یا کاغذ کی کترنیں تھیں وہ آنے جانے والوں نے انیس صاحب سے سلام و پیام میں صرف کر ڈالیں۔ آخر مجھے ایک بڑے کاغذ پر یہ جلی عبارت لکھ کر پوسٹر کی طرح آویزاں کرنا پڑی "جو صاحب حاجی انیس سے گفتگو کرنا چاہتے ہوں براہ کرم چار نمبر کی ایک کاپی اپنے

ساتھ ضرور لائیں"۔ شام کو جب میں دفتر لوٹا تو فل سکیپ سائز کے تقریباً دو دستہ کاغذ کی ایک گانٹھ پیپر کلپ کی مدد سے دیوار پر کلینڈر کی جگہ لٹکی ہوئی دیکھی۔ اوپر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "فی سبیل اللہ...... حاجی صاحب کے پرستاروں کی طرف سے گفتگو کے لیے کاغذ"۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ تحریر مزاحیہ شاعر بازغ بہاری کی تھی۔

بات جب کاغذ کی چھڑ گئی ہے تو فرشتوں کے لکھے پر ناحق پکڑے جانے والی بات تک کیوں رہ جائے۔ شاید انیس دہلوی کی گھٹی میں کاغذ کے ریشے بھی شامل رہے ہوں۔ ایک دن میرے پوچھنے پر کہ آپ کا صحافت یعنی "کاغذی دنیا" میں داخلہ کیسے ہوا۔ فرمانے لگے "اے بھئی کہاں کی صحافت۔ ہم تو پرانے پرچی باز ہیں۔ راشن دوکان میں پرچیاں لکھتے تھے۔ پرچیاں لکھتے لکھتے یہاں تک آ گئے اور اب کاغذ ہی اپنا سرمایہ اور بستر بچھونا بن گیا ہے۔"

لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ صحافت کے ذریعہ نام حاصل کرنے کے باوجود ایک مزدور کو اردو پرچے کا ڈیکلریشن نکلوانے سے لے کر اسے مستحکم ذریعۂ معاش بنانے میں کتنی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اردو رسالے سے روزی روٹی کمانا کسی باکمال یا شعبدہ گر کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ دو چار رسائل کے مالکان کو چھوڑ کر اگر کسی اردو ایڈیٹر کے نصیب میں اس جریدے کی کمائی سے روٹی کھانا لکھا ہے بھی تو وہ بیچارہ پتے شوربے اور تلی بوٹی سے زیادہ کا حقدار نہ ہوتا ہوگا۔ لہٰذا اردو کے اوسط درجے کے بیشتر قدیم رسائل کے مدیران (مالکان) اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے پرچہ نکالنے کے سوا بھی کوئی پیشہ اختیار کیے ہوتے ہیں۔ بعض اپنے جرائد کے وسیلے سے مخصوص ادویات کا دھندا بھی کرتے آئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ طبابت اور اردو صحافت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ایک ایڈیٹر کا قصہ اس کا نام لیے بغیر سنا رہا ہوں۔

وہ ایک خاندانی حکیم کا بیٹا تھا۔ حکیم جی کئی سال قبل دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ایڈیٹر کا پرچہ خاصا مقبول تھا لیکن خود کفیل نہیں ہو پاتا تھا۔ اس لیے پرچے کا مالک یعنی وہ ایڈیٹر ہمیشہ فکر مند نظر آتا تھا۔ ہم دونوں اتفاق سے ایک دوسرے کے خیر خواہ بن گئے تھے۔ سلامت علی مہدی کی پر تکلف صحبتوں میں یہ خیر خواہی میری جانب سے دوستی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ مدیر کو اپنے والد کا طلاؤں اور معجونوں کا پیشہ ناپسند تھا۔ اس کے والد گمنامی میں مرے۔ اپنے پیچھے کچھ خاص نسخے چھوڑ گئے تھے۔ ایڈیٹر کو اس کے باپ کے ایک اچھے دوست نے ازراہِ ہمدردی مشورہ دیا کہ تم اپنے باپ کے چھوڑے ہوئے فلاں دو نسخوں کی

تشہیر اپنے جریدے کے ذریعہ کرو، پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ پرچے سے کیا ملنے والا ہے سوائے نام اور شہرت کے۔ البتہ یہ نسخے تمھیں مالا مال کردیں گے۔ پھر تم کسی کے محتاج نہیں رہو گے۔ بات تنگدست مدیر کی سمجھ میں آگئی اور اس نے دو خاص مجرب اور آزمودہ نسخوں کی پبلسٹی اپنے رسالے کے ذریعہ کرنا شروع کردی۔ دواؤں کے اشتہار میں کھوئی ہوئی جوانی کے لوٹ آنے کا دعویٰ اور مریضوں کے نام پتے اور ان کی تمام خط و کتابت صیغہ راز میں رکھنے کا وعدہ ہوا کرتا تھا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مدیر نے معالج کے طور پر پہلے تو ایک فرضی حکیم کا نام گھڑا۔ بعد میں خطوں کے ذریعہ کئی مریضوں نے حکیم صاحب سے نجی ملاقات پر اصرار کیا تو کسی ناخواندہ اور نئے نئے دوائیں کوٹنے والے کو سدھا کر اچھی تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ اسے حکیموں جیسی ایک شیروانی، کرتہ، پاجامہ اور ٹوپی بھی خرید دی گئی۔ جسے وہ ڈیوٹی کے اوقات میں پہن لیا کرتا تھا۔ یہ بندوبست کامیاب ثابت ہوا۔ مدیر کو پرچہ کم فروخت ہونے کا غم نہ رہا۔ ہر ماہ زندگی اور شباب سے مایوس چار چھ مالدار روگی پھنس جاتے تھے جو مدیر کی کفالت کے لیے بہت تھے۔ ہاں اس بندوبست میں یہ احتیاط رکھنا لازم ہے کہ مدیر یا اس کے رسالے کا اس فرضی دواخانے یا حکیم سے کوئی تعلق ظاہر نہ ہونے پائے۔ سو اس کے لیے ایک گول مول پتے کا انتظام بھی ہو ہی جاتا ہے۔

میں نے جس مدیر کا ذکر کیا اس نے میری شادی میں شرکت فرمائی تھی۔ اور مجھے یاد ہے کہ اس نے میرے ولیمے کی دعوت میں میرے کچھ ہم عمر دوستوں کی موجودگی میں ایک شیشی پیش کرتے ہوئے کہا تھا یہ مرے والد مرحوم کا خاص نسخہ ہے جو میں صرف اپنے اچھے دوستوں کو شادی کے موقع پر دیا کرتا ہوں تاکہ وہ اپنی خوشی دوبالا کرسکیں۔ اس شیشی میں ۱۱ گولیاں ہیں۔ روز ایک گولی رات کو پاؤ بھر دودھ کے ساتھ کھائیں۔ یہ کہہ کر اس نے وہ شیشی میرے کرتے کی جیب میں رکھ دی تھی۔ نہ جانے میرے جی میں کیا آئی میں نے اس سے آہستہ سے اس کی قیمت پوچھی۔ اس نے زیر لب کہا بعد میں بتاؤں گا۔ ویسے تمہارے لیے یہ تحفہ ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے بعد میں بہ اصرار اسی شیشی کی قیمت اس نے مجھ سے ۸۰ روپے وصول کی تھی۔ وہ بوتل چند ماہ میرے پاس جوں کی توں پڑی رہی پھر میں نے اسے کوڑے دان میں پھینک دیا۔ برسوں مجھے اس دوست کا عجیب سا خیال آتا رہا۔ اسے مرے زمانہ ہوچکا لیکن اب سوچتا ہوں تو اس کے لیے گھن کے بجائے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ

اس زمانے میں اکیڈیمیاں نہیں ہوتی تھیں اور اب ہر صوبے میں اردو اکیڈمی کے کرتا دھرتا کو مردانگی کی پلاز کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ اردو کی محبت میں مردانہ وار کارنامے انجام دے سکے۔ جھوٹ کیوں بولوں اب تو ہر ماہ اپنے رسالے کی اشاعت سے پہلے حسرت ہوتی ہے کاش میرا باپ بھی کوئی حکیم ہوتا اور اس کے چھوڑے ہوئے دو ایک نادر نسخے میرے ہاتھ لگ جاتے تو اردو کی کمائی سے دو روٹیاں میرے پیٹ میں بھی پڑ جاتیں۔ لیکن کیا کیا جائے میرے جیسے کتنے ہی زبانِ اردو کا لقمہ بن چکے ہیں چونکہ اردو صحافت یتیم ویسیر ہو چکی ہے۔ اور اکیڈمیاں کم سے کم ہم سے سوتیلی ماؤں جیسا ہی برتاؤ کرنے لگیں تو محرومی کا تاریک سایہ ہمارے سر سے چھٹ جائے۔ یہ تجربہ اس لیے بیان کر دیا تاکہ نئے رسالے نکالنے والے نوجوان اس سے عبرت حاصل کریں اور پرچے کا ڈیکلریشن نکالنے سے پہلے کامیابی کے کچھ فارمولے بھی حاصل کر لیں۔ تاکہ جلد مایوسی کا شکار نہ ہوں۔

آج ادبی، علمی، فلمی، سیاسی، سائنسی، رسائل کی صنعت قوم کی بڑی ضرورت پوری کرنے کے باوجود ایڑیاں رگڑ رہی ہے۔ انیسؔ دہلوی نے اپنے بیٹوں کو رسالوں کے علاوہ دیگر کاموں کی تربیت دے ڈالی، یہ اچھا کیا۔ چونکہ وہ وقت پلٹ کر پھر آسکتا ہے جب راشن کی پرچیاں لکھنا اردو رسالہ چلانے سے زیادہ سود مند ثابت ہو۔ انیسؔ دہلوی جو دہلی کی ادبی اور سماجی انجمنوں اور محفلوں کی جان ہیں اور مشاعروں کے ذریعہ ناقابل فراموش خدمات انجام دے چکے ہیں اس ڈھلتی عمر میں بھی اپنی سرگرمیوں میں فعال ہیں۔ یہ حوصلہ اور قوتِ ارادی خدا کی دین ہے۔ وہ محض خون کے رگوں میں دوڑتے پھرنے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے خانگی طور طریقے، ان کی سادگی، خلوص، شوخی، کھلنڈرا پن، ظرافت، بے ساختگی اور طبیعت کا لاابالی پن انھیں اپنے دوستوں میں ممتاز کر دیتا ہے۔ اپنے معاصرین کو ان کی مشکل اور ضرورت میں اپنا تعاون پیش کرنے میں وہ کبھی نہیں چوکتے۔ (یہ مضمون انیس دہلوی کی حیات میں لکھا گیا تھا۔) میں تو ان کے لیے دعا کرتا ہوں:

”تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار“

●●

قمر سنبھلی

بزرگ صحافی اور متحرک شخصیت حاجی انیسؔ دہلوی

سن دو ہزار (یا بالفاظ دگر بیسویں صدی) کے آخری لمحات جاتے جاتے اردو زبان و صحافت کے ایک باحوصلہ مجاہد، مسلسل متحرک رہنے والی فعال شخصیت اور ہر دل عزیز انسان حاجی انیس دہلوی کو بھی اردو دنیا سے چھین لے گئے، 7/ستمبر 1930ء کو جناب حاجی عنایت اللہ کے یہاں پیدا ہونے والے ''نعمت اللہ'' جو بعد میں انیسؔ دہلوی کے نام سے مشہور ہوئے، ستر سال کی جدوجہد سے پُر بھرپور زندگی جینے کے بعد 30/دسمبر 2000ء کو مولائے حقیقی سے جاملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم نے واجبی تعلیم کے ساتھ کمزور معاشی حالات میں عملی زندگی کا بہت کم عمری میں آغاز کیا۔ مگر اپنی محنت، ذہانت، اور مسلسل متحرک رہنے کے سبب نہ صرف یہ کہ خوش حالی کے دن دیکھے، عزت و شہرت حاصل کی، بلکہ اپنے بچوں کے مستقبل کو بفضل خداوندی روشن کر گئے۔ ان کے پروان چڑھائے گئے ادارے مثلاً رہبر کارنر'' (ایکسپورٹر اور پبلی کیشنز) ''رہبر آفسیٹ پرنٹرز'' ''رہبر کمپیوٹرز'' ''رہبر یونانی دواخانہ'' تین رسالے ''ماہنامہ ''فلمی ستارے'''' باجی'' اور سہ ماہی ''ایوان ادب'' مرحوم کی مساعی کا روشن نتیجہ ہیں۔

انیسؔ دہلوی کا صحافت کی طرف بچپن سے ہی رجحان تھا۔ خود اپنی تحریر کے مطابق 1946ء میں صرف 16 سال کی عمر میں صحافت کی ابتداء مختلف اخبارات میں مضامین وغیرہ لکھ کر کی۔ 1950ء میں اپنا ایک دیواری روزنامہ (وال پیپر) ''اجالا'' کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ 1960ء میں ہفت روزہ ''ہمارا رہبر'' جاری کیا۔ 1966ء میں ماہنامہ ''نرالی دنیا'' نکالا۔ ان کے علاوہ ماہنامہ ''سازش'' ''عمران دی گریٹ'' ''جاسوسی فتنہ'' ''عمران سیریز'' ''فریدی سیریز'' اور ہندی میں ''سچی کہانیاں کرائم منتھلی'' جیسے پرچے بھی نکالے۔ (رہبر کارنر کی

پتہ: 5572۔ نئی سڑک، دہلی۔6

طرف سے کتنے ہی ناول شائع کیے جن میں کچھ ان کے اپنے ناول بھی شامل تھے۔)

مذکورہ بالا رسائل اور اخبار مرحوم نے وقفہ وقفہ سے نکالے لیکن بہت زیادہ عمر، ان میں سے کسی نے نہیں پائی۔ مگر 1972ء میں "فلمی ستارے" نام سے جو ماہنامہ جاری کیا اس نے اپنا ایک مقام بنایا اور بڑی پابندی کے ساتھ گذشتہ تقریباً تیس برسوں سے ہنوز جاری ہے۔ اسی طرح 1990 میں خواتین کا ماہنامہ "باجی" جاری کیا۔ اسے بھی نیم ادبی، مذہبی حلقوں میں پسند کیا گیا اور اس نے نہ صرف خواتین بلکہ ہر حلقے میں اپنا اثر قائم کیا اور اس کی باقاعدہ اشاعت بھی تاحال جاری ہے۔ 2000ء کے آغاز میں ایک خالص ادبی رسالہ "سہ ماہی ایوان ادب" نہایت اہتمام کے ساتھ جاری کیا۔ جس نے مختصر مدت میں اردو کے ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کرلی اور اپنی ساکھ بنالی۔ ایوان ادب کے تین ضخیم شمارے مرحوم کی حیات میں بڑے اہتمام کے ساتھ منظر عام پر آئے چوتھا شمارہ 2000ء کا آخری اشو بھی مکمل ہو کر پریس جاچکا تھا کہ حاجی صاحب پر پھر دماغی حملہ ہوا اور انھیں ابتدائے نومبر میں ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم کے "آئی۔ سی۔ یو" میں داخل کرانا پڑا۔

اور بالآخر تقریباً سات ہفتے ہسپتال میں رہنے کے بعد 30ر دسمبر کو وہ لمحہ آہی گیا جو ہر جان دار کا مقدر ہے۔ یہاں شاید یہ ذکر بے محل ہو کہ راقم الحروف کا مرحوم کے ساتھ ایک طویل عرصہ سے بالکل گھریلو تعلق رہا اور گذشتہ ۱۲۔ ۱۳ برسوں سے ان کے رسائل کا شعری نگراں ہونے کے سبب ان کے ساتھ کام کرنے سے مزید قربت حاصل ہو گئی تھی، مگر اسے افسوس ناک اتفاق ہی کہیے کہ اس تعلق دیرینہ اور قربت کے باوجود میں مرحوم کے انتقال کے وقت دہلی میں موجود نہیں تھا اور یوں ان کے جنازے میں شرکت سے محروم رہ گیا اور مٹی بھی نہ دے سکا۔ اس کا دیر تک قلق رہے گا۔

حاجی انیس دہلوی بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ خود محنت کرتے تھے اور دوسروں سے بھی یہ توقع رکھتے تھے، کہ ان کی طرح محنت سے کام لیں۔ اپنی پیرانہ سالی اور مختلف عوارض میں کافی مدت سے گرفتار رہنے کے باوجود ان کی قوت عمل، عزم و حوصلہ، اور ارادوں میں فرق نہیں آیا تھا۔ ان کے کام کے معمولات دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ تین تین رسالے نکالنا اور اپنے وقت پر پوسٹ کر دینا کم اہم بات نہیں۔ ان کا دفتر بہت مختصر افراد پر مشتمل تھا۔ بیشتر کام خود تن تنہا انجام دیتے تھے۔ پروف ریڈنگ سے پیسٹنگ تک، ترتیب و

تزئین سے لے کر ترسیل تک سارا کام خود کرتے۔ یہی نہیں اسی کے ساتھ کمپیوٹر کمپوزنگ، طباعت، بائنڈنگ اور ڈس پیچ وغیرہ کا کام اپنی نگرانی میں کراتے۔ ملک و بیرون ملک کے بے شمار احباب، قلمی معاونین، خریداروں اور ایجنٹوں سے رابطہ اور خط و کتابت مستزاد۔ غرض صبح سویرے سے دیر رات تک انھیں کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور اکثر رات کا کھانا بھی اپنے دفتر کے اسی تخت پر (جس پر بیٹھ کر وہ کام کرتے تھے) لیتے تھے۔ بس دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے وہیں تخت کے نیچے چٹائی بچھا کر قیلولہ کر لیتے اور پھر کام میں مصروف ہو جاتے۔ نماز کی پابندی ایک زمانے سے کرتے تھے، یہاں تک کہ جلسوں اور تقریبات میں بھی نماز کا وقت آ جائے تو وہیں کہیں جگہ بنا کر یہ فریضہ انجام دے لیتے۔ اس طرح 15/ سے 18/ گھنٹے روز کام کرتے تھے جو نوجوان حضرات کے لئے سبق ہے۔

ان کاموں کے ہجوم کے ساتھ سوشل کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے اور خدمت خلق کو فرض سمجھتے تھے۔ تعلقات بڑے وسیع تھے اس لئے حلقہ احباب بڑا وسیع تھا۔ ہر ایک کے دکھ درد کے ساتھی اور خوشی و غم کے شریک تھے۔ ادبی تقریبات کی رونق ان سے دوبالا ہو جاتی۔ اپنی بزلہ سنجی اور خالص دہلی کی زبان و لہجہ کی وجہ سے ہر محفل کی جان بنے رہتے۔ گوناں گوں مصروفیات کے باوجود عمر کے آخری چار، پانچ برسوں میں مشاعروں میں شرکت کے لئے دور دراز کے سفر کے لئے بھی وقت نکال لیتے تھے اور سفر کی صعوبتیں برداشت کر لیتے تھے۔

حالانکہ کئی برس سے سماعت سے بالکل محروم ہو چکے تھے لیکن اس سے ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ خود کہتے تھے کہ "پینسٹھ سال میں نے دوسروں کی سنی ہے اب دوسرے میری سنیں" یوں گفتگو یک طرفہ ہوتی تھی مگر وہ مخاطب کی بات اس کے ہونٹوں کی حرکت یا ذرا سے لکھ کر اشارا کر دینے سے ہی اس کا منشا سمجھ جاتے تھے اور مکمل جواب دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں خود ان کا ایک حقیقت پر مبنی شعر نقل کرنا یہاں بر محل ہوگا۔

پڑھ لیتا ہے چہروں سے انیس آپ کے جذبات
کیا غم ہے جو کانوں سے سنائی نہیں دیتا؟

اردو کے عاشق تھے اس کی ترویج و ترقی کے لئے جو خدمت ان کے سپرد ہوئی اس

کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ لاتعداد ادبی، نیم ادبی، رفاہی، ثقافتی انجمنوں، تنظیموں اور اداروں سے وابستہ تھے۔ ایک زمانہ تک سیاست سے بھی تعلق رہا، 46ء سے 72ء تک مگر 72 کے بعد بالکل کنارہ کش ہو گئے تھے۔ چار بار حج وزیارت کی سعادت بھی نصیب ہو چکی تھی۔ مجلس فروغ ادب دبئی کے رابطہ آفیسر اور خلیجی ممالک میں عالمی مشاعروں کے معاون رہے۔ ہندوستان بھر کے دور دراز مقامات کے ادبی اسفار کے ساتھ غیر ممالک مثلاً سعودی عرب، برطانیہ، عدن، بحرین امارات، پاکستان، نیپال وغیرہ کی سیاحت بھی کی اور اردو کے سفیر کے فرائض بھی انجام دئے۔

حاجی انیس دہلوی کی مختلف الجہت خدمات کا ان کی زندگی میں بھرپور اعتراف بھی کیا گیا اور ان کی خدمات کے سلسلے میں بے شمار اعزازات، انعامات اور ایوارڈس سے انھیں نوازا گیا۔ 1989ء میں عرب امارات اردو سوسائٹی ابو ظہبی کی جانب سے "گولڈ میڈل" عطا ہوا۔ 1987ء میں پنجابی کلا سنگم کا "کلا شری" ایوارڈ صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ کے ہاتھوں حاصل کیا۔ 85 میں "افتخار غالب" ایوارڈ، 86ء میں "شوبھنا کلا سنگم" ایوارڈ، 84 میں بہترین صحافت کے "مانو شری" ایوارڈ، 84 میں ہی فلم انسٹی ٹیوٹ ایوارڈ، ذوق انسٹی ٹیوٹ ایوارڈ 86 میں فلم اولوکن ایوارڈ، 94 میں ماہنامہ انشاء کلکتہ کا ادبی ایوارڈ، 91ء میں "آندھرا فلم جرنلسٹ ایسوسی ایشن" ایوارڈ، 94 میں "اکھل بھارتیہ ایکتا منچ سروج" (مدھیہ پردیش) ایوارڈ، 95 میں انجمن ترقی اردو ہند شاخ شیوپوری مدھیہ پردیش کی جانب سے اعزاز۔ 97ء میں سنیل دت کے ہاتھوں "شام بہار ٹرسٹ انبالہ" ایوارڈ۔ 87 میں وی آئی پی کلب کراچی کا یکجہتی ایوارڈ 95ء میں "اپولو ٹائر" ایوارڈ 98ء میں پاکستان سے پاک پشتو فلم اصلاحی جرگہ کا حسن کارکردگی ایوارڈ۔ 94ء میں انکور ساہتیہ سیوا کلا پریشد ایوارڈ شیوپوری۔ 95ء میں "خواجہ احمد عباس ایوارڈ ساہتیہ کار سنسد سمستی پور بہار۔ ان ایوارڈوں اور اعزازات کے علاوہ بھی کتنے ہی انعامات سے نوازے گئے۔ 1998 میں ان کے پہلے مجموعہ کلام "قدم بہ قدم" پر دہلی اردو اکیڈمی نے بھی ایوارڈ دیا۔ مرحوم کو عمر کے اخیر حصہ میں شاعری کا ذوق بھی ودیعت ہوا۔ یوں تو ان کے قول کے مطابق یہ جراثیم ابتداء میں ہی تھے مگر صحافت اور دیگر مصروفیات کی وجہ سے شاعری کے جراثیم طاقت نہ پکڑ سکے ادھر چند برسوں سے شاعری ان پر غالب آ گئی تھی اور کثرت سے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے تھے۔

پہلا شعری مجموعہ "قدم بہ قدم" کے نام سے 97ء میں منظر عام پر آیا۔ حمد و نعت و مناقب کا ایک مجموعہ "دست دعا" کے نام سے مکمل کر چکے تھے اور پوری طرح اس کی کمپوزنگ بھی ان کی حیات میں ہو چکی تھی۔ مگر ان کی طویل بیماری کی وجہ سے اشاعت کی ان کی حیات میں نوبت نہ آسکی۔ امید ہے اب جلد ہی وہ بھی منظر عام پر آجائے گا۔ حاجی انیس دہلوی کو اپنے کاموں اور تینوں رسالوں سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ شدید بیماری کے عالم میں بھی ان کا ذہن اپنے رسالوں کی طرف ہی رہتا کہ یہ بلاناغہ وقت پر شائع ہوتے رہیں۔ مرض الموت میں جبکہ وہ تقریباً سات ہفتے "کوما" کے عالم میں آئی۔ سی۔ یو (انتہائی نگہداشت کا شعبہ) میں داخل رہے۔ اس درمیان دو ایک بار بہت تھوڑے وقفوں کے لئے ہوش آیا بھی تو اس لمحہ میں بھی اپنے سامنے موجود شخص سے یہی سوالات کیے۔ "کیا باجی پوسٹ ہو گیا؟" "فلمی ستارے کے پروف دیکھ لئے؟" "ایوان ادب پریس بھیج دیا" وغیرہ...... اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں اپنے ان رسالوں سے کتنا تعلق اور دلی لگاؤ تھا۔ ہمیں اس بات سے اطمینان ہوتا ہے کہ حاجی صاحب مرحوم کے لائق فرزندان عزیزم کفایت دہلوی، ناصر دہلوی اور سمیع دہلوی صاحبان نہ صرف اپنے والد مرحوم کی ان کی یادگاروں کو اسی طرح باقی رکھنے کا عزم رکھتے ہیں بلکہ انھیں مزید سنوارنے اور نکھارنے کے لئے پوری طرح کمربستہ نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے حوصلوں کو جوان رکھے اور ان کے ارادوں کی تکمیل کے اسباب پیدا فرمائے نیز انھیں اردو والوں کا تعاون نصیب رہے۔

دعاء ہے کہ رب رحیم و کریم مرحوم کی لغزشوں سے درگزر فرما کر ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ (آمین) ●●

نامور صحافی اور وسیع النظر شاعر

الحاج نعمت اللہ انیس دہلوی

(میری یادوں کے آئینے میں)

۲۲ر نومبر ۲۰۰۰ء کی شب کو لندن سے دہلی پہنچا تھا۔ دوسرے ہی دن میں اپنے عزیز و اقارب سے ملنے چنڈی گڑھ روانہ ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی مجھے پنجاب جانا پڑا۔ جب چار روز بعد امر تسر سے واپس لوٹا تو سب سے پہلے اپنے دوست، محسن، صحافی اور نامور شاعر حاجی انیس دہلوی کو ان کے دفتر دہلی میں فون کیا تو ان کے فرزند ناصر دہلوی نے بتایا کہ حاجی انیس صاحب ۶ نومبر کو دوبارہ برین ہیمرج ہو جانے کی وجہ سے Vimhans ہسپتال کے آئی۔ سی۔ یو میں زیر علاج ہیں۔ تین دن بعد میں نے جب پھر فون کیا تو پتہ چلا کہ انیس بھائی ابھی تک کومہ کی حالت میں ہی ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ میں ان سے ملنے دہلی جانا چاہتا تھا مگر میں خود بخار اور سخت نزلہ میں مبتلا تھا اس لیے دہلی نہ جا سکا۔ ۳۰ر دسمبر کی شام کو میری بیگم پرم جیت کھنہ نے حاجی صاحب کی خیریت معلوم کرنے کے لیے جب دہلی ان کے دفتر فون کیا تو یہ المناک خبر سننے کو ملی کہ وہ جگمگاتا ہوا جیالا تبسم۔ وہ میرا دوست۔ میرا ہمدم الحاج نعمت اللہ انیس دہلوی وقت سے پہلے ہی ہم سے بچھڑ گیا تھا۔ اس معروف شاعر، نامور صحافی اور دیرینہ دوست کے انتقال کر جانے سے دل کو سخت چوٹ پہنچی۔ ایسے پُر خلوص انسان کی بے وقت موت صرف میرے لیے ہی تکلیف دہ نہیں تھی بلکہ ہندوپاک اور یورپ میں بسنے والے اردو زبان اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر قاری کے لیے ایک اندوہناک سانحہ تھا۔ میرا دل تو آج بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ حاجی صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔

انیس بھائی سے میری پہلی ملاقات پچیس۔ چھبیس برس قبل ۱۹۷۵ء میں ہوئی

پتہ : 92,Grove Road, Hounslow,Middx.Tw3 3PT.(U.K.)

تھی۔ ماہنامہ "نرالی دنیا" کو بند کر کے انھوں نے "فلمی ستارے" شائع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں ترکمان گیٹ میں ہی ان کی کتب اور رسائل کی دکان تھی۔ میرا ایک افسانہ "ڈومنی" "فلمی ستارے" میں شائع ہو چکا تھا۔ ان سے ملاقات کرنے جب میں ترکمان گیٹ ان کی دکان پر پہنچا تو وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ ہم دیر تک اردو زبان کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ہم دونوں چوں کہ اردو زبان اور ادب کے اہم تخلیق کاروں اور ان کے شہ پاروں کے عاشق رہے ہیں، اس لیے ہم میں پکی دوستی ہو گئی۔ انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں ماہنامہ "فلمی ستارے" کے لیے مستقل طور پر لکھتا رہوں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ انھیں تاحیات میرا قلمی تعاون ملتا رہے گا۔ میری شعری اور نثری تخلیقات باقاعدگی سے "فلمی ستارے" میں شائع ہونے لگی تھیں۔

حاجی صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ بڑے ملنسار اور خوش اخلاق انسان تھے۔ ان کی شخصیت کسی صاف شفاف آئینہ کے مانند تھی۔ وہ یاروں کے یار تھے۔ ان کی کسی بات پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی ان کی دوستی مشتبہ تھی۔ اس بات کی تصدیق اسی دن ہو گئی تھی جب وہ دسمبر ۱۹۸۱ء کی ایک انتہائی سرد شام کو برف باری کے دوران اچانک لندن میں میرے غریب خانے پر تشریف لائے تو میں انھیں اس قدر سردی کے موسم میں اپنے سامنے دیکھ کر دنگ رہ گیا، اور میرے منھ سے بے ساختہ نکلا۔ انیس بھائی۔ آپ اس موسم میں لندن؟ انھوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "گلشن بھائی ہم یاروں کے یار ہیں اور تمہاری محبت۔ تمہارا خلوص موسم کی خرابی کے باوجود ہمیں یہاں کھینچ لایا ہے۔" میں نے انھیں خوش آمدید کہا اور ان کا سواگت کرنے کے لیے بازو پھیلا دیے اور وہ مجھ سے اس طرح بغل گیر ہو گئے جیسے دو بچھڑے ہوئے بھائی برسوں بعد ایک دوسرے سے ملے تھے۔ ایسی محبتوں کے پیکر آج کے دور میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

انیس بھائی نے تین چار دن میرے غریب خانے پر قیام کیا تھا۔ میری بیگم ان دنوں لندن میں نہیں تھی۔ کرسمس کی تعطیلات کی وجہ سے میرا کالج بند تھا اور مجھے فراغت کے بہت سے لمحات میسر تھے جو میں نے انیس بھائی کے لیے وقف کر دیے تھے۔ دسمبر کی اس برف آلود شام کو گرم گرم کافی کی چسکیوں کے ساتھ ساتھ دیر تک مغرب میں بسے ہوئے اردو کے شعرا اور ادیبوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ دوسرے دن میں نے لندن میں

اردو کے معروف شاعر سوہن راہی اور آنجہانی راج کھیتی کو فون کر کے انیس بھائی کی لندن میں آمد کی نوید سنائی تو وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ ان دنوں اتفاق سے اردو کے ایک اور نامور شاعر جناب ضیا فتح آبادی صاحب چند مشاعروں میں شرکت کرنے کے لیے بھارت سے لندن تشریف لائے ہوئے تھے۔ میں نے سب سے انیس بھائی کی ملاقات کرائی۔ پھر ان کے اعزاز میں کئی ادبی محفلیں اور مشاعرے منعقد کیے گئے۔ ان تمام محفلوں میں انیس بھائی لندن کے سب شعرائے کرام اور ادبا سے بڑے خلوص، پیار، محبت اور خندہ پیشانی سے ملے تھے۔ انھوں نے اپنی لطیف اور پُر مزاح باتوں سے اہلِ لندن کے دلوں کو جیت لیا تھا۔ ہر قلمکار کی یہی رائے تھی کہ انیس دہلوی ایک سچا اور کھرا انسان تھا۔ دوستوں اور قلمکاروں سے محبت کرنے والا انسان اور انسانیت ہی اس کے یہاں دوستی کی معراج تھی۔

جنوری ۱۹۹۰ء میں جب میں اور میری بیگم پرم جیت کھنہ ان سے ملاقات کرنے ان کے دفتر کلاں مسجد گئے تو وہ ہم سے بڑے تپاک سے ملے اور اپنا شفقت بھرا ہاتھ میری بیگم کے سر پر رکھ کر اسے اپنی چھوٹی بہن کا درجہ دیا۔ میری بیگم ان کے اخلاص کی پاکیزگی، مزاج کی لطافت اور دوستوں سے ٹوٹ کر ملنے کی چاہت سے بہت متاثر ہوئی۔ اس کے بعد ہم جب بھی بھارت جاتے انیس بھائی سے ملنے ان کے دفتر اور دولت کدے پر ضرور جاتے۔ ان سے اور ان کے خاندان کے ہر فرد سے مل کر ہمیں یوں محسوس ہوتا جیسے ہم کوئی غیر نہیں بلکہ ایک ہی کنبے کے افراد ہوں۔

حاجی انیس دہلوی ایک اچھے انسان ہی نہیں، نامور صحافی اور وسیع النظر شاعر بھی تھے۔ وہ ایک ایسے فنکار تھے جو بہت معمولی آغاز سے اپنی دن رات کی محنت، لگن، تعلقات اور حسنِ اخلاق سے کام کرتے ہوئے خود ایک انجمن، ایک ادارہ بن گئے تھے۔ انیس بھائی ادب پرست اور ادیب نواز شعرا میں سے تھے جن سے ایک بار اگر کوئی مل لیتا تھا تو وہ ان سے بار بار ملنے کی تمنا رکھتا تھا۔ بطور شاعر انیس دہلوی نے ایک قلیل عرصہ میں ادبی دنیا میں اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "قدم بہ قدم" دسمبر ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آیا تھا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ اس شعری مجموعے کو دہلی اردو اکادمی کی جانب سے خصوصی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ اپنے اس قابلِ قدر مجموعے کی ایک جلد انیس بھائی نے مجھے بھی عطا فرمائی تھی:

انیس دہلوی کی شاعری جس قدر میرے مطالعہ میں آئی ہے وہ فنی۔ فکری

اور شعری لطافتوں سے معمور ہے اور عصری تقاضوں سے بھی ہم کنار ہے۔اس میں کلاسیکی روایات بھی رواں دواں ہیں اور وہ تجربات بھی نمایاں ہیں جو وقت کے کروٹ بدلتے ہوئے حالات اور واقعات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اپنے مجموعے کے ابتدا میں ہی انھوں نے یہ شعر رقم کیا تھا:۔

ستر برس کی دھوپ گئی سر سے اے انیسؔ
کچھ تجربوں کے نُور نے اجلا بنا دیا

شاعری میں جداگانہ اسلوب اپنانا سہل نہیں ہے۔اپنا ایک منفرد لہجہ تراشنا بھی آسان نہیں ہے۔پوری اردو شاعری میں نامور اور عظیم شعرا کی ایک کثیر تعداد موجود ہے جو زبان اور ادب میں لازوال ہیں لیکن وہ شعرا جن کا ایک ہی شعر سن کر شاعر کا نام سامنے آئے ان میں حاجی انیسؔ دہلوی سر فہرست ہیں۔ان کے دو شعر ملاحظ فرمائیں۔

میں اس کے ستم سہ کے دہائی نہیں دیتا
دنیا کو مرا درد دکھائی نہیں دیتا
کم ظرف کو احسان کا احساس نہیں ہے
ورنہ مجھے اس طور بُرائی نہیں دیتا

حاجی صاحب کے اشعار کا مطالعہ کر کے یوں محسوس ہوتا ہے کہ لفظی کرتب بازی کی جگہ احساس اور تجربے کی کامیاب ترسیل ان کی غزلوں کی غیر معمولی خصوصیت ہے۔انھوں نے جذبات کے اظہار اور ردِ عمل کے رویہ میں انفرادیت برتی ہے۔ان کی غزل کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:۔

پڑھ لیتا ہے چہروں سے انیسؔ آپ کے جذبات
کیا غم ہے جو کانوں سے سنائی نہیں دیتا

یہ شعر انیسؔ دہلوی نے اس وقت قلمبند کیا تھا جب ذیابیطس کی وجہ سے ان کی سماعت چلی گئی تھی اور وہ دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ان کی شاعری میں دل برداشتگی کا اظہار، تمناؤں اور آرزوؤں کی ناکامی اور زندگی کے تلخ حقائق کا کرب جا بجا ملتا ہے۔انیسؔ دہلوی کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ صحافت کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی ان کی طبیعت کو فطری مناسبت تھی۔

اس قدر متنوع صلاحیتیں رکھنے والے روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ یوں تو ایک روز جو بھی ہم سے بچھڑ جاتا ہے اس کی جگہ خالی ہی رہتی ہے۔ مگر الحاج انیس دہلوی کے انتقال سے اردو کی صحافتی اور ادبی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ ایک بہت بڑا خلا ہے اور یہ آسانی سے پُر نہ ہو سکے گا۔

حاجی انیس دہلوی ہم سے بچھڑ کر بہت دور جا چکے ہیں مگر ان کی نیکیاں، ان کی خوبیاں اور ان کی تحریروں کی پرچھائیاں ہمیشہ میری یادوں کے آئینے میں محفوظ رہیں گی اور انھیں کوئی بھی حقیقت پسند مورخ زندگی بھر فراموش نہیں کر سکے گا۔ ●●

کفیل آزر

حاجی انیس میرے محترم میرے مشفق

ہمارے ملک کا رواج مردہ پرستی کا رواج ہے۔ یہاں کوئی بھی زندگی میں بڑے سے بڑا کام کرلے بہت ہی خوش قسمت ہوگا وہ جسے زندگی میں اس کے کام کی پذیرائی مل جائے۔

ایسے ہی خوش قسمتوں میں ایک نام حاجی انیس دہلوی کا بھی ہے۔ حاجی جی سے ایک زمانے تک غائبانہ تعارف رہا۔ میں ممبئی میں تھا کہ وہ دہلی سے "فلمی ستارے" نکالتے تھے۔ پھر باجی شروع کردیا۔ نیم ادبی اور فلمی رسائل میں سب سے کامیاب رسالہ "شمع" تھا جسے معتبر بھی سمجھا جاتا تھا اور اس کی کھپت بھی اچھی خاصی تھی۔ ایسے کامیاب رسالے کے سامنے "فلمی ستارے" کے بارے میں عام قاری کی رائے بھی یہی تھی کہ یہ ستارے بجھ جائیں گے، شمع روشن رہے گی۔ لیکن حاجی جی نے ہمت نہیں ہاری۔ حوصلے سے کام کرتے رہے اور ایک ستارے نے شمع کو گل کردیا۔ حاجی جی نے فلمی ستارے میں میرے بارے میں ہر خبر شائع کی۔ کبھی کبھی تو پورے ایک صفحہ پر میرا ہی کلام ہوتا تھا۔ میرے انٹرویو بھی چھاپے۔ میں جب ممبئی سے دہلی آتا تھا تو حاجی جی سے ضرور ملتا تھا۔ اس زمانے میں نہ ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا نہ سماعت سے محروم ہوئے تھے چنانچہ بڑے مزے لے لے کر اپنی زندگی کے ان اوراق کو کھولتے تھے جن پر جدوجہد کی مشکل ترین تحریر درج تھی۔ کام کے سلسلہ میں میں نے حاجی جی جیسا محنتی اور جفاکش انسان نہیں دیکھا۔ وہ فلمی ستارے اور "باجی" کی ایک ایک سطر اپنے ہاتھ سے کاپی پر جوڑتے تھے، انھیں سجاتے سنوارتے تھے۔ لوگ ان کے بارے میں کہتے تھے کہ حاجی جی بہت کنجوس ہیں، ایک چائے کو نہیں پوچھتے، مجھے پتہ نہیں کہ حاجی جی کی نظروں میں ان اشخاص کا کیا مقام رہا ہوگا اس لیے کہ میں تو جب بھی گیا چائے بھی پی ہے۔ اور کبھی کھانا بھی کھایا ہے۔ اب جب میں بالکل ہی ممبئی چھوڑ کر دہلی آگیا تو حاجی

پتہ: ۴۲۲۔ نیا محل، جامع مسجد، دہلی۔ ۶

جی نے کئی بار اشاروں میں (دوسروں کی باتیں بتا کر) ان سے منسلک ہونے کی دعوت دی۔ لیکن میں نوکری نہیں کر سکتا تھا۔ حاجی جی ہر فنکار کی طرح جوان دل اور جوان دماغ رکھتے تھے۔ جب وہ شاعری کرنے لگے اور ان کی کتاب کو دہلی اردو اکاڈمی نے ۵ ہزار روپے کا انعام دیا تو اس سلسلے میں دہلی سے باہر ان کے مداحوں نے ان کی خوب پذیرائی کی خوب جشن کیے لیکن حاجی صاحب نے کبھی اس پذیرائی کو قابل فخر نہیں سمجھا۔ ہمیشہ یہی کہا سب اللہ کی طرف سے ہے۔ میں کس قابل ہوں جو بات اب ہو رہی ہے وہ جوانی میں نہیں ہوئی۔ میں جس بات کا اظہار انتہائی ممنونیت کے ساتھ کر رہا ہوں وہ حاجی صاحب کی شفقت، محبت اور خلوص کا ایک ایسا واقعہ ہے کہ جسے میں مرتے دم تک نہیں بھلا سکتا۔ آپ سب جانتے ہیں ۶ دسمبر ۹۲ کو بابری مسجد شہید ہوئی اور اس واقع کا بدترین بھیانک اور وحشیانہ فساد ممبئی میں ہوا۔ مسلمانوں کا جانی اور مالی نقصان ہوا، دلی کے حالات بھی دگر گوں تھے۔ میں ممبئی میں تنہا تھا۔ فلمساز ایم۔ این۔ لیتین اور کمل چودھری کا آفس باندرہ (مغرب) میں تھا وہاں فساد کی ہلکی سی خبر بھی نہیں تھی۔ زندگی روزانہ معمول کی طرح گذر رہی تھی۔ میں آفس ہی میں رہ گیا کمل کے گھر سے کھانا آجاتا تھا۔ دلی کی خیریت میں فون پر لے لیتا تھا۔ ایسے میں ایک دن پوسٹ مین ڈاک لایا تو اس میں ایک پوسٹ کارڈ میرا بھی تھا۔ میں نے جلدی سے دیکھا۔ وہ خط حاجی انیس دہلوی کا تھا۔ آپ یقین کریں میں نے اس خط کو پڑھا جس میں صرف یہ لکھا تھا کہ اپنی خیریت بھیجو۔ میں یہ جملہ پڑھ کے بے اختیار رو پڑا یہ سوچ کر کہ اول تو دلی کے حالات بھی نازک ہیں اور پھر پرانی دہلی۔ اتنا مصروف شخص ان کے دل میں میرے لیے اتنی محبت اور شفقت ہے کہ ہر شخص جہاں نفسا نفسی کا شکار ہو وہاں حاجی جی اپنے اس جونیر دوست کو یاد کریں۔ انھیں میری اتنی فکر ہو...... حاجی جی کی اس محبت کا جواب نہ میں قلم سے دے سکتا ہوں نہ عمل سے کہ اس کا جواب ہو ہی نہیں سکتا۔ اس فساد کے بعد مجھے ممبئی اتنی بدصورت لگی کہ میں اسے طلاق دے کر دلی آگیا۔ پھر حاجی جی سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ انھیں پھر اٹیک آیا، ٹھیک ہو کے گھر آگئے۔ ان کی ہمت کا قائل ہو گیا کہ وہ ضروریات سے فراغت کے لیے گھوڑے کی طرح چاروں ہاتھ پیروں سے گھسٹ کر بیت الخلاء گئے، پھر وضو کیا اور آکے مغرب کی نماز ادا کی پھر "فلمی ستارے" کا کام کرنے لگے باتیں بھی ہوتی رہیں۔ حاجی جی کو اپنی زبان اور اپنی قوم سے بے حد محبت تھی انھوں نے کتنے ہی شاعر بقیہ صفحہ ۲۱۲ پر

مومن خاں شوقؔ

چند ناقابل فراموش یادیں
پر خلوص اور بے لوث صحافی حاجی انیسؔ دہلوی

یادیں ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

یادیں زندگی میں آدمی کو کبھی بے چین و بے قرار کر دیتی ہیں تو کبھی سکون پہنچاتی ہیں، کبھی ہنساتی ہیں تو کبھی رلاتی ہیں۔

یادیں انسان کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ کسی کو بچھڑے ہوئے ساتھیوں کی یاد ستاتی ہے تو کسی کو ترک وطن کیے ہوئے افراد خاندان کی یاد، تو کسی کو اپنے قریبی دوستوں کی یاد ستاتی ہے لیکن مجھے آج اُردو زبان، اُردو شعر و ادب کے محسن، ادب نواز، نامور صحافی و ممتاز شاعر انیسؔ دہلوی کی یاد نے بے چین و بے قرار کر دیا جب کہ میری نظر سے ماہنامہ "خوشبو کا سفر" کا تازہ شمارہ (فروری ۲۰۰۱ء) گزرا۔ میں اس شمارہ کا مطالعہ کر ہی رہا تھا کہ مطالعہ کے دوران کفایت دہلوی مدیر "باجی" اور "فلمی ستارے" کی تحریر "نامور صحافی اور شاعر الحاج انیسؔ دہلوی" پڑھنے کو ملی تو مجھے ماضی کے وہ پر خلوص واقعات و لمحات، اُن کی ادبی تحریریں اور ان کی ادب نوازیاں ایک کے بعد دیگر میرے ذہن کے پردے پر اُبھرنے لگیں۔ ویسے انیسؔ دہلوی صاحب میرے کلام کے ذریعے مجھ سے واقف تھے۔ پھر انیسؔ دہلوی سے خط و کتابت کا سلسلہ تھا۔ وہ ایک سچے اور پر خلوص صحافی کی طرح اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہر مکتوب کا جواب مختصر ہی سہی ضرور دیا کرتے تھے۔ ہندوستان کے دیگر جرائد و رسائل کے مدیران میں جناب اعجاز صدیقی مرحوم سابق مدیر ماہنامہ "شاعر" جناب خورشید احمد سابق مدیر "نیا دور" لکھنؤ، اور جناب ف. س. اعجاز مدیر "انشاء" کلکتہ بھی جناب انیس

پتہ: اشرف ولا، ملے پلی، حیدر آباد۔ ۱

دہلوی کی طرح مکتوب کا جواب ضرور دیتے تھے اور دیتے ہیں جو قابل قدر عمل ہے۔

انیس دہلوی کے خلوص و پیار اور ان کی دوستی اور سادگی کا میں قائل اس وقت ہوا، ۲۴ر جنوری ۱۹۹۹ء کو جب جناب انیس دہلوی، جناب صلاح الدین نیر مدیر "خوشبو کا سفر" کے دولت خانے پر ان سے ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے۔ اس وقت جناب بشیر امجد اور میں وہاں موجود تھے۔ دوران گفتگو یہ معلوم ہوا کہ وہ حیدر آباد سٹی زن سوسائٹی کی جانب سے منعقدہ کل ہند مشاعرہ، جو ۲۴ر جنوری رات ۹ بجے قلی قطب شاہ اسٹیڈیم میں منعقد کیا گیا تھا، شرکت کے لیے آئے تھے۔ جناب مدن موہن، سابق وزیر حکومت آندھرا پردیش، نے اس مشاعرہ کی صدارت کی تھی۔ مہمان خصوصی جناب زاہد علی خان ایڈیٹر روز نامہ سیاست تھے۔ اس ملاقات میں اس بات کا بھی انکشاف ہوا کہ انیس دہلوی کی قوت سماعت بے حد کمزور ہے۔ مگر وہ خوب بولتے ہیں، گفتگو کرتے ہیں۔ سماعت کی کمزوری کے باوجود وہ سرپرست "باجی" چیف ایڈیٹر "فلمی ستارے" اور رہبر کارنر کے نگران ہیں جہاں گھر بیٹھے شعراء ادبا کی کتابیں انتہائی صحت کے ساتھ مناسب خرچ پر دو ماہ کے اندر اندر تیار کر دیا کرتے تھے۔

غیر رسمی باتوں کے بعد جناب بشیر امجد نے اپنا چوتھا مجموعہ کلام "ساز حیات" جو ایک ہفتہ قبل شائع ہوا تھا، انیس دہلوی کے حوالے کرتے ہوئے یہ خواہش کی کہ کل یعنی ۲۵ر جنوری کو بعد مغرب، اردو ہال حمایت نگر میں، کتاب کا رسم اجراء ہے آپ بطور مہمان خصوصی اس تقریب میں شرکت کریں تو باعث تشکر ہوگا۔ جس پر انیس دہلوی نے خندہ پیشانی سے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ یہ رسم اجراء تقریب ادارۂ "میرا شہر میرے لوگ" کے زیر اہتمام منعقد کی گئی تھی۔ صدر ادارہ جناب صلاح الدین نیر نے خیر مقدمی و تعارفی تقریر کی۔ معتمد عمومی ادارہ جناب رئیس اختر نے ادبی اجلاس کی کارروائی چلائی۔ معتمد ادارہ مومن خاں شوق معتمد مشاعرہ تھے۔ "ساز حیات" کی رسم اجراء پروفیسر حبیب ضیاء سابق صدر شعبہ اردو ویمنس کالج (جامعہ عثمانیہ) نے انجام دی۔ جناب عبدالرحیم آرزو گلبرگہ اور جناب نیپال سنگھ ورما جنرل سکریٹری ادارہ گیت چاندنی کے علاوہ جناب انیس دہلوی نے بھی "ساز حیات" کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقع پر جناب انیس دہلوی کی گل پوشی ادارہ میرا شہر میرے لوگ، ادارہ سوغات نظر اور دیگر ادبی اداروں کی جانب سے کی گئی۔ مشاعرہ میں منتخب شعراء نے کلام سنایا۔ مہمان خصوصی انیس دہلوی نے اپنا منتخب کلام

سنا کر خوب داد و تحسین حاصل کی۔

"پڑھ لیتا ہے چہروں سے انیسؔ آپ کے جذبات
کیا غم ہے جو کانوں سے سنائی نہیں دیتا"

۲۶؍ جنوری کو "بزم جوہر" کے زیر اہتمام جناب انیسؔ دہلوی کی تہنیتی تقریب و محفل مشاعرہ ڈاکٹر راہی کی معتمدی میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر راہی نے تعارفی تقریر کی، بزم جوہر کی جانب سے انیسؔ دہلوی کی گل پوشی کی گئی۔ بعد ازاں مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ حیدر آباد کے نمائندہ شعراء نے کلام سنایا۔ انیسؔ دہلوی نے ایک سے زائد غزلیں سنائیں۔ انیسؔ دہلوی حیدر آباد میں دیگر ادیبوں و دانشوروں سے ملاقات کے بعد دہلی واپس ہوئے۔

ماہنامہ "باجی" اور ماہنامہ "فلمی ستارے" مارچ ۱۹۹۹ء میں انیسؔ دہلوی نے "حیدر آباد کا سفر نامہ" کے زیر عنوان نہ صرف ۲۲؍ تا ۲۶؍ جنوری قیام حیدر آباد میں ادبی مصروفیات کی روئیداد پیش کی بلکہ ادارہ میرے شہر میرے لوگ اور "بزمِ جوہر" کی محفلوں کی تفصیل معہ فوٹوز کے شائع کی۔ حیدر آباد میں ہم لوگوں سے مختصر ملاقات کے بعد انیسؔ دہلوی نے ادارہ میرا شہر میرے لوگ ادارہ سوغات نظر کے زیر اہتمام منعقدہ ہر ماہ ادبی اجلاس و مشاعرہ کے فوٹوز اور بزمِ جوہر کے خصوصی اجلاس کی فوٹوز بھی "باجی" اور "فلمی ستارے" میں پابندی سے شریک کرتے رہے۔ جیسے ہی فوٹو جناب انیسؔ دہلوی کو ملتا وہ خط کے ذریعہ اطلاع دیتے، فوٹو "باجی" یا "فلمی ستارے" کے فلاں شمارہ میں چھپ رہا ہے۔ اس کے علاوہ حیدر آباد کے شعراء کی غزلیں اکثر و بیشتر "باجی" "فلمی ستارے" "ایوان ادب" میں شائع کرتے جس میں خاص طور پر جناب صلاح الدین نیر، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، مومن خاں شوقؔ، ڈاکٹر راہی، رؤف خیر، باسط نقوی، بشیر احمد، حفیظ انجم، یوسف یکتا، اسحاق ملک، نادر اسلوبی اور دیگر شعراء کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ وہ کسی کو چاہتے تو ٹوٹ کر چاہتے تھے جس کی مثال اس بات سے ملتی ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹے جناب سمیع دہلوی کی شادی جو اکتوبر ۱۹۹۹ء دہلی میں ہوئی تھی، جناب صلاح الدین نیر اور مجھے شادی کا دعوت نامہ ارسال کیا۔ ہم اس شادی میں شرکت نہ کر سکے انھیں ہم نے مبارک باد دی تھی۔ جس پر انھوں نے ہمیں شکریہ کا مکتوب لکھا تھا۔ نومبر ۱۹۹۹ء میں انیسؔ دہلوی نے سہ ماہی "ایوان ادب" کی اشاعت کا اعلان کیا تو انھوں نے مجھے مکتوب لکھا کہ "آپ کا نام سہ ماہی "ایوان ادب" کے لیے نمائندہ حیدر آباد کے طور پر شامل کر رہا ہوں اُمید کہ پسند

فرمائیں گے۔" جب سہ ماہی ایوان ادب کا پہلا شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء منظر عام پر آیا تو سفیران سہ ماہی "ایوان ادب" دہلی میں، جو دنیا بھر کے ۴۲ مقامات کے نمائندوں میں حیدر آباد سے مومن خاں شوق شامل تھا۔ سہ ماہی "ایوان ادب" کا جوگندر پال کے نام اور "خلیق انجم نمبر" قابل مطالعہ اور واقعی ادب کا ایوان ہے۔

انیس دہلوی کی ادبی خدمات اور شب و روز کا ادبی منظر نامہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ سرپرست "باجی" بھی ہیں، چیف ایڈیٹر "فلمی ستارے" "ایوان ادب" (سہ ماہی) کے مدیر اعلیٰ اور رہبر کارنر کے مالک ہیں۔ کبھی دہلی کے کل ہند مشاعرہ میں، کبھی کلکتہ، کبھی حیدر آباد اور ممبئی کبھی لکھنؤ وغیرہ کے مشاعرہ میں شرکت کیا کرتے ہیں۔ ایسا نامور صحافی، ممتاز شاعر علالت کے بعد ۳۰ر دسمبر ۲۰۰۰ء کی شب اس دارِ فانی سے رخصت ہوا۔ جس کا ہم سب کو بے حد رنج و ملال رہا مگر ان کا کام، ان کا خلوص ہمارے دلوں کو گرماتے رہیں گے اور ان کی یادیں ادب اور صحافت کی دنیا میں زندہ و جاوداں رہیں گی۔

بقول جناب کفایت دہلوی "انیس دہلوی ۷ر ستمبر ۱۹۳۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور باشعور ہوتے ہی صحافتی مشاغل سے وابستہ ہوگئے۔ کم عمری میں ہی اپنے محلّہ کے لیے دیواری اخبار روز نامہ "اُجالا" شروع کیا جو بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں ہفتہ روزہ "ہمارا رہبر" اور پھر ۱۹۶۶ء میں فلمی ماہنامہ نرالی، دنیا ڈائجسٹ شروع کیا جس نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔ اس کے علاوہ اردو اور ہندی میں ایچ. اقبال کے جاسوسی ناول "سازش" "جاسوسی فتنہ" اور "عمران دی گریٹ سیریز" کے نام سے شائع کیے۔ ۱۹۷۲ء میں شروع کیا گیا ماہنامہ "فلمی ستارے" اور ۱۹۹۰ء میں جاری ہونے والا ماہنامہ "باجی" آج بھی مقبول خاص و عام ہیں۔ کچھ عرصہ قبل شروع کیا گیا سہ ماہی "ایوان ادب" بھی پابندی سے شائع ہو رہا ہے...... بحیثیت شاعر بھی انیس دہلوی ایک معتبر مرتبہ کے مالک تھے۔ ۱۹۹۷ء میں ان کا مجموعہ کلام "قدم بہ قدم" منظر عام پر آچکا ہے۔ اسی مجموعہ میں انھوں نے اپنی بات کی ابتداء میں اپنا یہ شعر لکھا تھا۔

ستر برس کی دھوپ گئی سر سے اے انیس
کچھ تجربوں کی دھوپ نے اُجلا بنا دیا

حاجی انیس دہلوی کے چند اشعار جو مجھے بے حد پسند ہیں۔

فرازِ عرش پہ مہماں ہیں رحمتِ عالم
کہ تاجِ عظمتِ انساں ہیں رحمتِ عالم
سمجھ سکو تو ہیں تفسیرِ ذاتِ ربانی
پڑھو تو صورتِ قرآں ہیں رحمتِ عالم

ہے دل میں انیسؔ اب تو یہی ایک تمنا
ہو جائے میسر مجھے دیدار نبیؐ کا
مرا وجود مجسم خطا ہے اے مولیٰ
ترے کرم سے فقط آس ہوں لگائے ہوئے

☆☆☆

جلائیں ہم جسے بس، وہ چراغ جلتا ہے
ہمارے آگے ہواؤں کا دم نکلتا ہے
غموں کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہوئے ہو انیسؔ
تمہارے ہاتھ خوشی کا ثمر نہ آئے گا

مذہب کسی کا کچھ ہو مجھے اس سے کیا غرض
سب بھائی ہیں، کسی سے عداوت نہیں مجھے
اس نے انیسؔ مجھ کو، نوازا ہے بے پناہ
اپنے خدا سے شکوۂ قسمت نہیں مجھے

میں اپنی جان اُس پہ لٹانے کے بعد بھی
ہوں قرض دار، قرض چکانے کے بعد بھی
اپنے اپنے دکھ میں سب کھوئے ہوئے ہیں دیکھئے
اے انیسؔ اس دور میں تہذیبِ غم خواری نہیں

حال کیا تم کو بتاؤں، ان کی قربت کا انیسؔ
دھڑکنیں اتنی بڑھیں دل کی کہ طوفاں ہو گئیں

●●

اختر شاہ جہاں پوری

انیسؔ دہلوی کا طریقِ شعر

شاعری کو مشرق سے خصوصی نسبت رہی ہے۔ یہاں شاعری کا جو چرچا رہا ہے وہ مغرب کے حصے میں نہیں آیا۔ شاعری صرف ادبی میدان تک محدود نہیں تھی بلکہ مزاروں، مساجد اور عمارات کی پیشانی کے طغروں میں بھی شاعری پائی جاتی ہے۔ ہندوستان، افغانستان اور ایران کی آب و ہوا دوسرے ممالک کے مقابلے میں زیادہ راس آئی۔

ہندوستان میں شاعری کو فروغ مغلیہ دور میں حاصل ہوا یہاں تک کہ بادشاہ، شاہزادے، شاہزادیاں بھی شاعری سے شغف رکھتے تھے اور اکثر شعر و سخن کی محفلیں آراستہ کرتے تھے۔ دورِ بادشاہت میں لکھنؤ اور دلی شاعری کے دو اسکول مانے جاتے تھے لیکن فوقیت دلی کو حاصل تھی۔ اسی دلی کی سرزمین پر پرورش پائے انیسؔ دہلوی۔ جن کی پیدائش ۱۹۳۰ء میں ہوئی اور آپ اوائل عمر ہی سے صحافت سے منسلک ہو گئے لیکن دل میں چھپے شاعری کے جذبات نے جب اظہار کے لیے قرطاس و قلم کی ضرورت محسوس کی تو انیس دہلوی کو ۱۹۹۵ء میں شاعر ہونے کا اعلان کرنا پڑا۔ گویا اس وقت آپ کی عمر ۶۵ سال کی تھی۔ آپ نے کل ملا کر پانچ سال شاعری کی لیکن مجھے یہ بات کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ آپ نے اتنی کم مدت میں ایسے ایسے بے مثال اشعار کہے ہیں کہ لوگوں کے لیے عمرِ نوح بھی ناکافی ہو گی۔ انیسؔ صاحب ہر چند کہ کلاسیکل شاعری کے دلدادہ تھے لیکن ان کے اشعار میں تنوع ہے، انفرادیت ہے، سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ سادگی اور شوخی بھی ہے۔ ان کے اشعار میں دوستوں کی منافقت، ظلم و تشدد کی گرم بازاری اور رہبرانِ قوم کی ناعاقبت اندیشی کی بھی جھلک ملتی ہے۔ اب کچھ مثالیں ان کے اشعار سے:۔

پتہ : ارتکین چوپال، شاہ جہاں پور۔ ۲۴۲۰۰۱ (یوپی)

چلو انیسؔ چلیں بزمِ یار میں ہم بھی
سنا ہے حسن کی خیرات بٹنے والی ہے

چمکنے لگے میری پلکوں پہ موتی
مری آنکھ شاید صدف بن رہی ہے

میں لکھنؤ نہیں دلی کا رہنے والا ہوں
انیسؔ میری غزل کو مری فغاں کہیئے

خود آئنہ بھی انھیں دیکھنے سے قاصر ہے
وہ اپنے چہرے پہ ایسی نقاب رکھتے ہیں

کتنا اچھا ہے مری راہ میں کانٹے رکھنا
بس یہی اس کی ادا راستہ دکھلاتی ہے

بھٹکے ہوئے ہیں قافلے کیسے ملیں گی منزلیں
سب تو بنے ہیں راہزن کوئی بھی راہبر نہیں

انیسؔ دہلوی فالج کے حملے میں سماعت سے محروم ہو جانے پر بھی کتنے مطمئن اور صابر و شاکر نظر آتے ہیں۔

پڑھ لیتا ہے چہروں سے انیسؔ آپ کے جذبات
کیا غم ہے جو کانوں سے سنائی نہیں دیتا

انیسؔ دہلوی اپنی سہل پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قافلے گزرتے جا رہے ہیں اور ہم غبار چھٹنے اور راستہ صاف دکھائی دینے کے منتظر ہیں لیکن اس میں ایک اشارہ اور بھی ملتا ہے کہ شاعر عازمِ سفر بھی ہے اور یہی زندگی کی علامت ہے۔

اُڑا گئے ہیں بہت دھول جانے والے لوگ
چھٹے غبار تو کچھ راستہ نظر آئے

ہندوستان میں مذہب کے نام پر جس طرح ظلم و تشدد ہو رہا ہے اس سے معصوم ذہنوں کو بھی سفاکی کا سبق دیا جا رہا ہے جو مستقبل کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

پتھر بنا کے پھولوں کو، کیا مل گیا جناب
بچوں کے ذہن آپ نے سفاک کر دیئے

کچھ ایسے حادثے گزرے کہ یہ ہوا محسوس
محبتوں سے یہ ہندوستان خالی ہے

انیسؔ دہلوی نے اپنے شہر کو اپنے خون سے تابندہ رکھنے کی جس خواہش کا اظہار کیا ہے وہ ان کا اپنا طریق الفت و محبت ہے۔

جبینِ شہر ہمارے لہو سے روشن ہے
چراغِ عشق بڑی آبرو سے روشن ہے

اُردو زبان کی شیرینی سے کس کو انکار ہے لیکن شاعر کو اپنے محبوب سے اس وجہ سے زیادہ رغبت ہے کہ اس کا محبوب اُردو جانتا ہے اور اُردو محبت کی زبان ہے۔

جو دل باندھے وہ جادو جانتا ہے
مرا محبوب اُردو جانتا ہے

خانہ بدوشوں کا پڑاؤ کسی جگہ بھی مستقل نہیں ہوتا اسی وجہ سے وہ کسی سے آشنا نہیں ہو پاتے، محبت کرنا تو دور کی بات ہے، لیکن شاعر کے دل میں کسی کی محبت نے ایسا گھر کرلیا کہ وہ نقلِ مکانی کے لیے تیار نہیں۔

ہم خانہ بدوشوں کے کہیں گھر نہیں ہوتے
اک تیری رفاقت ہے کہ من باندھے ہوئے ہے

انیسؔ دہلوی نے ایسے انسانوں کو جو خود کچھ کرنا نہیں چاہتے بلکہ سب کچھ معجزاتی طور پر ہو جائے اس امید پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، ان سے اتفاق نہ کرتے ہوئے، اُنھیں ہمت اور حوصلے سے کام لینے کی ترغیب دی ہے۔

آزمائش سے گزرنے کی نہیں ہے ہمت
معجزوں کے لیے ہر شخص عصا مانگے ہے

دیوار بن کے وقت اگر راستہ نہ دے
جھونکا ہوا کا بن کے گزر جانا چاہیے

انیسؔ دہلوی اخبارات میں قتل و غارت گری کی خبریں پڑھ کر بے چین ہو جاتے ہیں اور اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ کبھی امن و امان سے متعلق خبریں بھی پڑھنے کو ملیں۔

اخبار بانٹ دیتے ہیں ہر روز سب کو غم
یا رب! وہ دن بھی ہو کوئی اچھی خبر ملے

بعض لوگ دوسروں کو خوش حال دیکھ کر رنجیدہ خاطر ہو جاتے ہیں لیکن اس شعر میں شاعر ان لوگوں کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ زرداروں کو بھی سکون حاصل نہیں بلکہ کوئی خواہش اور تمنا انھیں بھی بے چین رکھتی ہے اسی وجہ سے انھیں سکون میسر نہیں۔

امیروں کی چمک دیکھی ہے سب نے عیش دیکھا ہے
امیروں کا مگر کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

انیسؔ دہلوی اس دور کشاکش میں اپنے دوستوں میں منافقوں سے بے خبر نہیں۔

حیران ہو کیوں تیر کمیں گاہ سے آئے
کیا سوچ رہے تھے کہ منافق نہ ملیں گے

انیسؔ دہلوی کے اس شعر میں جس میں اُنھوں نے شاعری کو وسیلہ شرکت محفل جانانہ کہا ہے، غالبؔ کے شعر کی یاد تازہ کرتا ہے۔

زہے نصیب میری شاعری نے آج انیسؔ
شریکِ محفلِ جانانہ کر دیا مجھ کو

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
(غالبؔ)

انیسؔ دہلوی کے کلام کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ وہ اپنے سینے میں ایک درد مند دل رکھتے تھے۔ سماجی بد حالی، اعلیٰ اقدار کا زوال انھیں بے چین کر دیتا تھا اور وہ اسے شعری پیکر میں ڈھالنے کے لیے بے چین ہو جاتے تھے۔ ان کے اشعار میں بلا کی تاثیر ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

معطر ہے مشامِ جاں بھی ان سے، دل کی دنیا بھی
سخن کے باغ میں تو نے جو گل بوٹے کھلائے ہیں

●●

معصوم مراد آبادی

حاجی انیس دہلوی

"فلمی ستارے" کے بانی حاجی انیس دہلوی، صدی کے آخری لمحوں میں ہم سے رخصت ہو گئے۔ دو ماہ تک موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد انھوں نے 71 برس کی عمر میں 30 دسمبر 2000 کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ ایک محنت کش مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک بھی تھے۔ انھیں فلمی، ادبی، سیاسی اور سماجی حلقوں میں یکساں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ماہنامہ "فلمی ستارے" خواتین کا ماہنامہ "باجی" اور پھر سہ ماہی "ایوان ادب" کی باقاعدہ، دیدہ زیب اور کامیاب اشاعت نے ادبی صحافتی اور سماجی حلقوں میں انھیں اعتبار عطا کیا تھا۔ انھیں خود کام کرنے کا جتنا سلیقہ تھا اتنا ہی دوسروں سے کام لینے کا بھی۔ حاجی جی کچی اور کھری باتیں کرنے کے عادی تھے۔ وہ جہاں اپنی کامیابیوں پر خوش ہوتے تھے وہیں ان میں اپنی کمزوریوں کو چھپانے یا ان سے نظریں چرانے کی عادت نہیں تھی۔

حاجی انیس دہلوی کا دل بہت بڑا تھا اور اس میں کسی قسم کے حسد، تعصب یا تنگی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ مقابلہ آرائی پر یقین محکم رکھتے تھے اور اپنے مدمقابل کو مضبوط دیکھنا چاہتے تھے۔ گذشتہ دنوں جب فلمی اور ادبی صحافت کا ستون سمجھے جانے والے ماہنامہ "شمع" کی اشاعت بند ہوئی تو حاجی جی کی بے چینی اور کرب دیدنی تھا۔ فلمی ستارے کے مالک اور مدیر ہونے کے ناطے انھیں "شمع" کے بجھنے کی کاروباری خوشی ہونی چاہیے تھی لیکن وہ اس خبر سے بہت رنجیدہ ہوئے اور اپنی موت کے آخری لمحوں تک ان پر اس کا بہت اثر رہا۔ زندگی کے آخری دنوں میں جب کہ ان کی سماعت، قویٰ اور جسم نے یکے بعد دیگرے ان کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے اردو کے ادبی اور فلمی قارئین کی تشنگی اور انھیں مایوسی سے بچانے کے لیے بھرپور جدوجہد کی اور وہ فلمی ستارے کو "شمع" بنانے کی کوشش کرتے کرتے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ وہ شدید محنت اور بے تکان جدوجہد کے آدمی تھے

اور عمر کے آخری دنوں میں ان پر شاعری اور مذہب کا غلبہ تھا۔

الحاج نعمت اللہ عرف حاجی انیس دہلوی کی پیدائش 7/ ستمبر 1930 کو دہلی میں ہوئی تھی۔ گوکہ انہوں نے باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی لیکن علم سے ان کا وسیع رشتہ تھا۔ زندگی کا آغاز اردو کتابوں ناولوں اور جاسوسی سلسلہ وار کہانیوں کی اشاعت سے ہوا۔ 1960 میں ہفت روزہ "ہمارا رہبر" اور پھر 1966 میں فلمی ماہنامہ "نرالی دنیا" شروع کیا جس نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ اس دوران انھوں نے اردو ہندی میں ابن صفی اقبال کے جاسوسی ناولوں کی سیریز شائع کی۔

1972 میں ماہنامہ "فلمی ستارے" کا آغاز کیا جو ان کا سب سے مقبول رسالہ بنا۔ 1990 میں انھوں نے خواتین کیلئے ایک خالص اصلاحی اور مذہبی ماہنامہ "باجی" جاری کیا۔ کچھ عرصہ قبل ہی انھوں نے سہ ماہی "ایوان ادب" کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا جسے ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس عرصہ میں انھوں نے شاعری کی طرف رجوع کیا اور ان کا مجموعہ کلام "قدم بہ قدم" منظر عام پر آیا۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ "دست دعا" زیر طبع ہے۔ انھیں متعدد ادبی، صحافتی اور سماجی اعزازات بھی ملے اور انھوں نے کئی ملکوں کے ادبی سفر کیے۔ وہ جہاں گئے اپنے دوستوں اور خیر خواہوں کی بڑی تعداد چھوڑ آئے۔ یہی ان کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا راز تھا۔

حاجی انیس دہلوی کی شخصیت میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو دہلی میں بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملی ہیں۔ وہ اپنے سے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کے معاملے میں بڑے سخی ثابت ہوئے تھے۔ اسی لیے اجنبیوں اور نوواردوں کے ساتھ بھی ان کا وہی سلوک ہوتا تھا جو وہ اپنے متعلقین اور دوستوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ سچا اور صحیح مشورہ دیتے جس کی کوئی فیس مقرر نہیں تھی۔ اردو صحافت اور طباعت کی بنجر زمین میں ان کے تجربوں اور سلیقہ مندی کی داد وہ لوگ بھی دیا کرتے تھے جو حاجی جی کو دور سے جانتے تھے۔ وہ "کم خرچ بالا نشیں" والی کہاوت کی زندہ مثال تھے جس کا عکس ان کے وجود، گھر، دفتر اور بچوں میں نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے بیٹوں کفایت دہلوی، ناصر دہلوی اور سمیع دہلوی کی تربیت بھی اسی نہج پر کی تھی اور اپنے ملنے والوں سے حسن سلوک کی ایسی تلقین کی تھی کہ ان کے بعد بھی ان کی بہت سی خوبیاں باقی رہیں گی۔

اپنے ادارے میں کام کرنے والوں سے وہ برابری کی سطح پر برتاؤ کرتے تھے اور کسی بھی کارکن کو یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کسی ایسے ادارے میں کام کر رہا ہے جہاں مالک اور مزدور کی کوئی تفریق ہے۔ اپنے کارکنوں کی ضروریات حتیٰ کہ قیام و طعام کا بھی وہ پورا خیال رکھتے تھے۔

بات غالباً 1979 کی ہے۔ راقم الحروف نے غالب اکیڈمی نئی دہلی سے کتابت کا کورس مکمل کیا تھا۔ ایک اشاعتی ادارے میں کام کی غرض سے حاضری ہوئی تو انہوں نے ایک رقعہ حاجی انیس دہلوی کے لیے لکھ دیا۔ کاتبوں میں حاجی جی کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ وہ اجرت کم دیتے ہیں لہٰذا ان کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس واقعہ کے تقریباً 5 برس بعد ایک ادارے میں حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی، جہاں میں سرخیاں اور لے آؤٹ کا کام دیکھتا تھا۔ انھوں نے کام کو سراہا اور اپنے ساتھ دفتر میں لے گئے اور کہا کہ آپ فلمی ستارے کی سرخیاں لکھ دیا کیجیے۔ اس طرح حاجی جی سے براہ راست تعلق قائم ہوا تو انھیں سمجھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔

حاجی جی کی شخصیت ایسی تھی کہ اسے دوسروں کی زبانی سمجھنا آسان نہیں تھا جب تک ذاتی تجربہ نہ ہو۔ کچھ عرصہ ان کے ساتھ کام کرنے کے دوران اپنائیت اور خلوص کا احساس ہوا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی میں نے کتابت اور آرٹ کا پیشہ ترک کر کے صحافت کی دنیا آباد کر لی۔ جو رشتہ فلمی ستارے کی سرخیاں لکھنے کے لیے استوار ہوا تھا وہ اخبار میں خبروں اور مضامین کی اشاعت کے بعد بڑھتا چلا گیا۔ حاجی صاحب جب بھی ملتے خلوص اور محبت سے ملتے۔ ایک ایک رپورٹ اور مضمون کی تعریف کرتے۔ خامیوں اور کمیوں کی طرف بھی اشارہ کرتے۔ نیک اور سچے مشورے دیتے اور کامیابی کے تیر بہدف نسخے بتاتے۔ اسی لیے وہ جہاں اور جب کسی تقریب میں نظر آتے ان کی پدرانہ شفقت اور دعائیں لینے کو جی چاہتا تھا۔

راستو! کیا ہوئے وہ لوگ جو آتے جاتے
میرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے

حاجی انیس دہلوی نے بڑی زندہ طبیعت پائی تھی اور انھوں نے عمر کو اسی زندہ دلی سے بسر کیا۔ ملک و بیرون ملک میں ان کے ۔۔ ۔۔۔ کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ وہ پاکستان اور خلیجی ملکوں اور مغرب سے آنے والے ادیبوں اور شاعروں کی بڑی تواضع کرتے تھے۔ اسی لیے نہ صرف

ہندوستان بلکہ جہاں جہاں اردو کے قدم پہنچے ہیں وہاں حاجی جی کو چاہنے والے موجود ہیں۔

متحدہ عرب امارات میں اردو کا علم بلند کرنے والے مرحوم سلیم جعفری سے ان کے قلبی مراسم تھے اور وہاں ہندپاک مشاعروں کا جو سلسلہ انھوں نے شروع کیا تھا اس میں حاجی جی ہندوستان میں کو آرڈی نیٹر کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس طرح حاجی جی نے بے شمار ہندوستانی شاعروں کو خلیج کی سیر کروائی۔ کینسر کے موذی مرض میں سلیم جعفری جیسے دوست کی ناگہانی موت بھی ان کے لیے شدید صدمہ کا باعث بنی۔ حاجی جی کی شخصیت کا ایک وصف یہ تھا کہ جس سے ایک بار ان کی دوستی ہو جاتی اسے وہ آخری درجہ تک نبھاتے تھے۔ وہ تعلقات کو توڑنے پر نہیں بلکہ جوڑنے پر یقین رکھتے تھے اسی لیے ان کے دشمنوں کی تعداد صفر سے بھی کم تھی۔ وہ کسی کو تعاون دینے یا اس سے تعاون لینے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس طرح باہمی تعاون کا سلسلہ دراز ہوتا جاتا تھا۔

ان کی طبیعت میں بذلہ سنجی بھی خوب تھی۔ ان کی سماعت کئی برس سے پوری طرح جواب دے گئی تھی۔ اس دوران جب کبھی ان سے ملاقات ہوئی تو خیر و عافیت دریافت کرنے اور اخبار کا حال پوچھنے کے بعد ایک کاغذ اور قلم بڑھا کر کہتے ”مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ لیا اب تمھیں جو کچھ کہنا ہے لکھ دو تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔ پھر مذاق میں کہتے کیا کروں ساری عمر دوسروں کی سننے میں گذری اب میں نے طے کیا ہے کہ کسی کی نہیں سنوں گا صرف اپنی کہوں گا۔ اس طرح ان سے گفتگو نصف زبانی اور نصف تحریری ہو گئی تھی۔ اس معذوری کے باوجود انھوں نے ادبی اور سماجی محفلوں سے منہ نہیں موڑا۔ ہاں ان کے ساتھ ایک معاون کا اضافہ ضرور ہو گیا تھا۔ ان کے بے تکلف دوستوں میں مرحوم سلامت علی مہدی، مرحوم سلطان اختر اور مرحوم عقیل ناروی کے علاوہ ڈاکٹر خلیق انجم، کمار پاشی، پروانہ ردولوی، مخمور سعیدی، فیروز دہلوی طارق صدیقی امیر قزلباش، رحمان نیر، فاروق ارگلی اور نذیر احمد وغیرہ شامل ہیں۔ سلامت علی مہدی جو آخری دنوں میں بیماری اور حالات سے مجبور ہو گئے تھے وہ جب بھی لکھنؤ سے دہلی آتے حاجی صاحب کے مہمان ہوا کرتے تھے۔

حاجی جی نے اپنی وضع قطع کبھی تبدیل نہیں کی۔ ان میں نمائش اور بناوٹ قطعی نہیں تھی وہ ہر چیز میں سلیقہ برتتے تھے اور فضول خرچی کے روادار بالکل نہیں تھے۔ اپنے دفتر کے بیشتر امور خود ہی انجام دیتے تھے۔ علی الصبح دفتر میں اپنی نشست پر آ کر بیٹھ جاتے۔

خطوں کے جواب دینا، کہانیوں اور مضامین کا انتخاب کرنا، کتابت شدہ مواد کی تصحیح سے لے کر "فلمی ستارے" کے صفحات کی تیاری تک وہ سارے کام خود ہی انجام دیتے تھے۔ حتیٰ کہ دوپہر کو آنے والے منی آرڈر یا وی پی فارموں کا اندراج بھی ایجنٹوں کے رجسٹر پر خود ہی کرتے تھے۔ ان کے چاہنے والوں کا بڑا حلقہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جنھیں انھوں نے خط و کتابت کے ذریعہ اپنایا تھا۔ فجر کے بعد شروع ہوئی ان کی دفتری مشغولیات رات گئے تک جاری رہتی تھیں۔ عام طور پر اخبارات و رسائل کے دفتروں میں ایک بے ہنگم پن اور بے ترتیبی نمایاں ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس حاجی جی کا دفتر سلیقہ اور قرینہ کی مثال تھا۔ اسی لیے وہ ایک چھوٹے سے دفتر سے بیک وقت تین رسالوں کو چلا رہے تھے۔ وہ اپنے رسائل سے اولاد کی طرح لگاؤ رکھتے تھے۔ خدا کرے ان کے قائم کیے ہوئے تینوں رسالے اسی شان سے نکلتے رہیں۔ یہی میری دعا ہے۔ آمین!

●●

بقیہ صفحہ ۱۹۸ سے

اور شاعرات کو راتوں رات مقبول بنا دیا۔ انھیں خلیجی ممالک کے شاعروں میں لے گئے۔

موت دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ اسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔ حاجی جی چلے گئے لیکن اپنے پیچھے اپنا وہ سب سرمایہ چھوڑ گئے جو ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ "فلمی ستارے" "باجی" اور "ایوان ادب" کے ساتھ ایسے لائق بیٹے بھی یعنی کفایت دہلوی، ناصر دہلوی اور سمیع دہلوی۔ میں رب العزت کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ ان کے یہ فرزند اُن کی یادوں کو امانت سمجھ کر سنبھالیں۔ یہ کامیابی کی ان منزلوں سے بھی آگے بڑھ جائیں جہاں تک حاجی جی پہنچے تھے۔ ان کی عمر میں اللہ تعالیٰ برکت و ترقی عطا فرمائے (آمین) اللہ حاجی جی کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دینا۔ (آمین)

فریدہ خان

انیسؔ دہلوی سے روبرو گفتگو

جب میں نے حاجی انیس دہلوی صاحب سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے نہایت سادگی سے یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ "بھئی میرا انٹرویو کر کے کیا کرو گی؟" لیکن میں ایک دن اُن کے دولت خانہ پر پہنچ گئی اور ان کا انٹرویو کرنے میں کامیاب رہی۔

پھر یہ انٹرویو انھیں کی زیر نگرانی شائع ہونے والے "خواتین کا ماہنامہ باجی" (اکتوبر ۱۹۹۹ء) میں شائع ہوا تھا۔ (فریدہ خان)

س انیس دہلوی صاحب سب سے پہلے میں آپ کی عمر، آبائی وطن، خاندان، تعلیم و تربیت اور ابتدائی زندگی کے بارے میں جاننا چاہوں گی؟

ج میرا پیدائشی نام نعمت اللہ ہے۔ میں انگریزی تاریخ کے حساب سے ۷؍ ستمبر 1930ء میں دہلی میں پیدا ہوا۔ میرے والد مرحوم حاجی عنایت اللہ دہلوی کے یہاں گیارہ اولادیں پیدا ہوئیں ان میں سب سے بڑا میں ہوں جن میں سے ہم سات بہن بھائی حیات ہیں۔ میں ابتداء سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوقین رہا ہوں۔ چار جماعتیں اینگلو عربک اسکول، محلہ قبرستان سے پڑھیں اس کے بعد پانچویں جماعت میں اینگلو عربک اجمیری گیٹ میں داخلہ لے لیا۔ ابھی پانچ جماعتیں پوری بھی نہ ہوئی تھیں کہ گھریلو مسائل کی وجہ سے مجھے تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور پھر میں نے ایک راشن کی دوکان پر منشی گیری کی ملازمت اختیار کر لی، جہاں راشن کی پرچیاں بنانی ہوتی تھیں اور پچاس روپے ماہوار ملا کرتے تھے۔ یہ بات 1944ء کی ہے۔ مجھے چونکہ پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا اس لیے میں نوکری کے دوران بھی اردو ہندی اور انگریزی اپنے طور پر پڑھتا رہا۔ مدرسے کی تعلیم اور قرآن مجید کی تعلیم بھی حاصل کی۔

س جنگ آزادی کی تحریک جب اپنے آخری مراحل پر تھی بے شک اس وقت آپ کی عمر بہت کم رہی ہوگی پھر بھی آزادی کی جدوجہد میں آپ نے کس طرح حصہ لیا؟

ج 1942ء میں جب میری عمر تقریباً بارہ سال تھی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آزادی کی تحریک زوروں پر تھی میں اور میرے ہم عمر ساتھی مل کر انگریزی سامراج کے خلاف خوب نعرے لگایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہم لڑکوں کے ذمہ یہ کام تھا کہ سرکاری عمارتوں اور تھانوں پر انگریزی حکومت کے خلاف پمفلٹ لگانا۔ چونکہ ہم لوگ دہلی کی تمام گلیوں کوچوں سے واقف تھے اس لیے انگریزوں کے خلاف پمفلٹ لگاکر روپوش ہو جاتے تھے۔ اس جدو جہد کے سربراہ رشید خاں مرحوم، اور نا آصف علی ہوا کرتے تھے۔ اور ہم لڑکے ارونا آصف علی کی بنائی "آصف کور [illegible] والنٹیر تھے۔

س ہر چند کہ ہمارے [illegible] رہنماؤں کی جدو جہد، کوششیں اور قربانیاں کام آئیں اور ملک انگریزی سامراجیت سے آزاد ہو گیا لیکن اس کے فوراً بعد ہی ملک میں جو افرا تفری پھیلی، فسادات برپا ہوئے اور ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا اس خونی دور کی یادیں آپ کے ذہن میں کس حد تک محفوظ ہیں؟

ج جب 1947ء میں تقسیم ہند کا سانحہ رونما ہوا تو یہاں کا جتنا پڑھا لکھا مسلمان طبقہ تھا اس نے مرکزی حکومت کے تبادلے کے ساتھ ساتھ پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا خود میرے بڑے بھائی (والد کی پہلی بیوی سے) جو کہ پوسٹ مین تھے انھوں نے اور ان کے اٹھارہ ساتھیوں نے اپنی ملازمت چھوڑ کر پاکستان جانے کے لیے فارم بھر دیا لیکن جب ہمارے والد صاحب کو علم ہوا تو انھوں نے سمجھایا کہ یہ ہمارا اپنا ملک ہے ہمیں ہر حالت میں یہیں رہنا چاہیے تو انھوں نے پاکستان جانے سے انکار کر دیا۔ میں نے اس وقت کے وزیر مواصلات رفیع احمد قدوائی سے مل کر ان سب کے فارم کینسل کروائے اور انھیں پھر سے نوکری پر بحال کروایا۔ 1947ء میں جب سرکاری ملازمین نے پاکستان جانا منظور کر لیا تو ان لوگوں نے اپنی پناہ گاہ عارضی طور پر پرانا قلعہ اور ہمایوں کا مقبرہ بنائی کیوں کہ اس وقت نظام الدین سے اسپیشل ٹرین پاکستان جاتی تھی۔ ان کے ساتھ پولس اور فوج کا بھی انتظام ہوتا تھا تاکہ یہ لوگ حفاظت سے پہنچ جائیں۔ جب پناہ گزینوں کو ان کیمپوں میں رہتے کافی دن گزر گئے تو چونکہ وہیں کھانا پینا رہتا تھا اور وہیں پیشاب پاخانہ، تو غلاظت سے ہیضہ پھیل گیا اور لگاتار اموات ہونے لگیں۔ میں نے ایک سوشل ورکر کی حیثیت سے کیمپ میں خدمات انجام دیں۔ میں ابتداء سے ہی کانگریس سے وابستہ رہا ہوں۔ اس وقت میں کھدر دھاری تھا اور

چونکہ پرانا قلعہ میں مسلم لیگ کی ذہنیت کے لوگ زیادہ تھے تو انھوں نے کانگریسی ہونے کی وجہ سے ہماری خدمات کو قبول نہ کیا۔ ہمایوں مقبرہ کیمپ میں جو لوگ پناہ گزین تھے ان کا تعلق مسلم لیگ سے اتنا گہرا نہ تھا۔ بہر حال میں نے ان حالات میں بھی تن من سے ان پریشان حال لوگوں کی خدمت کی۔ میں سرکاری طور پر ملے راشن اور دوائیں پرانا قلعہ اور ہمایوں کے مقبرہ میں جاکر تقسیم کرتا تھا، ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ مرنے والوں کے کفن دفن یعنی قبریں کھودنے کا فرض بھی انجام دیا۔ علاوہ ازیں دہلی کے ان مخدوش علاقوں میں جہاں ہندو اور مسلمان دونوں مصیبتوں کا شکار تھے، میں نے بالالحاظ مذہب وملت انسانیت کو بنیاد بناکر یکساں راحت رسانی کا کام کیا۔

س انیس صاحب 1947ء کا پر آشوب اور ہلاکت خیز زمانہ نہ صرف آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکا ستم رسیدہ لوگوں کی بے لوث خدمت بھی کی۔ براہ کرم یہ بتائیں کہ 1947ء کا انسانی خون کا سیلاب آپ کے احساس کو اور کیا کیا سوغاتیں دے گیا؟

ج انسانی اور سماجی رشتوں کے حوالے سے یہ کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ 1947ء میں برصغیر کی پوری قوم خدا کا نام لے لے کر اسی کے بندوں کی بلی چڑھا رہی تھی، انسانی لہو سے غسل کر کے اپنے اپنے معبود کی بندگی کی جا رہی تھی۔ آگ زنی، لوٹ مار، توڑ پھوڑ مذہب کے خاص رنگ مانے جا رہے تھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ سب کچھ بھگوان یا خدا کے حکم کی تعمیل تھا۔ جن بیبیوں کی کسی نے انگلی نہیں دیکھی تھی وہ ننگے سر اور خستہ لباس میں جائے پناہ کی تلاش میں بھوکی پیاسی ماری ماری پھر رہی تھیں۔ حد تو یہ ہے کہ شیطان جسے ہم ہر برائی کا خالق مانتے ہیں وہ خود اپنے کو انسان کے مقابلے میں کوتاہ قد تصور کر رہا تھا۔ بڑا ہی اذیت ناک دور تھا اسی زمانے میں میری ایک بہن جو بڑے اچھے علاقے میں رہ رہی تھیں، ان کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں گئیں۔ اس دور میں میری والدہ بھی زچگی کی حالت کا شکار ہو کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ان کو دفنانے کے لیے قبرستان بھی نہ جاسکے کیوں کہ 72 گھنٹے کا کرفیو لگا ہوا تھا۔ سو ان کو محلے کی سات سو سالہ درگاہ دادا پیر کی پائنتی میں دفنادیا گیا۔ جب ان کو دفنانے کی تیاری کر رہے تھے اسی لمحے دو مزید خواتین کے جنازے بھی آگئے اور اس طرح ایک قبر میں تینوں کو سلادیا گیا۔

س آپ کے کہنے کے مطابق برصغیر کی تقسیم سے پہلے متحدہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں آپ نے ایک سپاہی کی حیثیت سے شب و روز گزارے تو کیا آپ بتائیں گے کہ آپ یہ لڑائی کس کی کمان میں لڑ رہے تھے؟

ج بادی النظر میں ہم کہہ سکتے ہیں، کہ سپریم کمانڈر گاندھی جی (باپو) تھے لیکن در حقیقت باپو کے رفقائے کار اور ہم قدم اسم با مسمیٰ مولانا ابوالکلام آزاد، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن، پنڈت جواہر لال نہرو، سحبان الہند مولانا احمد سعید، محترمہ سبھدرا جوشی وغیرہ اکائی کی مانند جنگ آزادی کا پرچم بلند کیے ہوئے تھے اور مجھ جیسے ادنیٰ سپاہی انھیں مجاہدین وطن کے زیر سایہ آزادی کی جنگ میں مصروف کار تھے۔ سچ پوچھیے تو میں یہ کہوں گا، کہ بنیادی قیادت حصول آزادی کا وہ جذبہ تھا جو ہم سب کے دلوں میں موجزن تھا۔

س جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ آزادی کے فوراً بعد ہندوستان میں مسلم اکثریت کا تعلیم یافتہ طبقہ پاکستان ہجرت کر گیا۔ آج پچاس سال بعد پاکستان میں وہ پڑھا لکھا طبقہ جو یہاں سے ہجرت کر کے گیا تھا وہ طبقہ کس مقام پر ہے اور ہندوستان میں وہ مسلمان جس نے کسی بھی حالت میں اپنی جنم بھومی نہیں چھوڑی اس کا مستقبل کیا رہا؟

ج آزادی کے بعد 1965ء تک یہ حال تھا کہ جو مسلمان تعلیم یافتہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر، انجینئر، وکیل گویا کہ پڑھا لکھا طبقہ پاکستان کا رخ کر لیتا تھا ہمیں یہاں اندھیرا نظر آتا تھا اس کے باوجود ہم نے اپنا ملک نہیں چھوڑا کیوں کہ ہم سوچتے تھے کہ ہماری مسجدیں اور مقدس مزارات پوچھیں گے کہ تم ہمیں کیوں ویران کر گئے، ہمیں کس پر چھوڑ کر جا رہے ہو۔ 1965ء میں ہند پاک جنگ ہوئی اور پھر 1971ء میں بنگلہ دیش وجود میں آیا اور تب سے آج تک وہ مسلمان جو یہاں سے ہجرت کر گئے تھے پریشان حال ہیں۔ بڑے سے بڑے سرمایہ داروں کو سکون نصیب نہیں ہے جب کہ جو مسلمان یہاں سے ہجرت کر گئے تھے ان میں سے زیادہ تر لوگ وفات پا گئے ہیں۔ ان کی اولادیں جو وہیں پیدا ہوئیں پلی بڑھیں اپنے ملک پاکستان کے لیے سب کچھ کر رہی ہیں ان پر آج پچاس سال گزرنے کے بعد بھی مہاجر کا لفظ چپکا ہوا ہے ان کو ہندوستانی تسلیم کیا جا رہا ہے ان پر ظلم ہو رہا ہے ان کا کاروبار برباد کیا جا رہا ہے وہاں اردو زبان پر مسلمانوں کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ مسلمان مسلمان ہو کر آپس میں لڑ رہے ہیں۔ قبیلے قبیلے کی لڑائی ہو رہی ہے۔ شیعہ سنی، اہل جماعت اور اہل حدیث کی لڑائی ہو رہی ہے یہ

بہت بری لعنت ہے۔ جہاں تک ہندوستان میں آزادی کے بعد مسلمانوں کے مستقبل کا سوال ہے تو یہاں مسلمان ہر شعبہ میں خدمات کرتے نظر آرہے ہیں۔ اپنے فرائض نبھارہے ہیں، رہی بات چھوٹے موٹے فسادات، تفریقات اور تعصبات کی تو وہ کہاں نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں ہندو مسلمان ساتھ ساتھ رہ رہے ہیں۔ مندر اور مسجد ساتھ ساتھ ہیں ایک طرف مندروں میں ہری اوم کی گھنٹی بجتی ہے تو دوسری طرف مسجدوں میں نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔ اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔

س آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ اردو ادب، صحافت، ثقافت، فلمی ادب، سیاست، سماجی امور نیز کھیل کود میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ پھر بھی آپ یہ ضرور بتائیں کہ جب آپ کچھ نہیں تھے تو کیا تھے؟

ج شوق کے آئینے میں اگر خود کا جائزہ لوں، تو فلم بینی اور ڈرامہ سازی میری پہچان بنتی ہیں لیکن! شغل کے آبجو میں اگر خود کو دیکھوں، تو میں اخبار نویس اور رسالہ ساز کے علاوہ کچھ بھی نہیں، شاید میری تخلیق ہی کاغذ سیاہ کرنے کے لیے کی گئی یا میں از خود رسائل و جرائد کا جیسا تیسا مقدر بن گیا۔

س اردو فلمی صحافت کا باقاعدہ آغاز کب اور کیسے ہوا؟

ج ذرائع ابلاغ کی کمی اور رسائل سے محرومی کے باوجود میں وقتاً فوقتاً روزنامہ "تیج" (اردو) روزنامہ "ملاپ" "پرتاپ" آل انڈیا ریڈیو کے ذرائع سے غزلیات وغیرہ کی ترسیل کے ساتھ ساتھ 1950ء میں پہلی بار دیواری اخبار "اجالا" کی داغ بیل ڈالی۔ ڈی، سی، ایم فٹ بال ٹورنامنٹ کے سیزن میں جب میں خود بھی نیشنل کلب کا وائس پریذیڈنٹ تھا، پانچ بجے شام تک فٹ بال میچ دیکھتا اور میچ دیکھنے کے بعد ایک گھنٹے کی بھرپور محنت کے بعد "اجالا" کے پلیٹ فارم سے آنکھوں دیکھا حال تحریر کر کے چسپاں کر دیتا تھا جسے لوگ بصد شوق پڑھتے تھے اور ایسے قارئین دہلی کے ہر گوشے میں موجود تھے۔

س دیواری جریدہ "اجالا" ترکمان گیٹ کے علاوہ اور کہاں کہاں آویزاں کیا جاتا تھا؟

ج اجالا کی مستقل جگہ خانقاہ شاہ ابو الخیر کے نزدیک ترکمان گیٹ پر جہاں لوگ کسی معروف روزنامہ کی طرح منتظر رہا کرتے تھے۔ یہ دیواری اخبار 1960ء تک جاری رہا۔ پھر دیکھتے دیکھتے قد و قامت کے اعتبار سے میں بڑا ہو گیا اور 1946 میں ہفتہ وار "ہمارا رہبر" شائع

کیا جو کئی سال تک جاری رہا 1966ء میں ماہنامہ "نرالی دنیا" کا آغاز کیا۔ 1972ء سے "فلمی ستارے" ماہنامہ منظر عام پر آیا اور تادم تحریر پوری آب و تاب سے اشاعت پذیر ہے۔

س شاید آپ اختصار سے کام لے رہے ہیں ورنہ میری ناقص معلومات کے بموجب "فلمی ستارے" سے پہلے کچھ جاسوسی رسائل بھی آپ کی "زنبیل صفحات" کی زینت رہے ہیں؟

ج یقیناً آپ کی معلومات درست ہیں "رہبر کارنر" کے حوالے سے چند سال بڑے شدومد سے جاسوسی رسالے 1964ء تا 1984ء "جاسوسی فتنہ، عمران سیریز" "فریدی سیریز، سازش، عمران دی گریٹ" جاسوسی ادب کی دنیا میں سکہ رائج الوقت کی طرح رواں دواں رہے۔ مزید یہ کہ میں نے تقریباً چار سو ہندی جاسوسی ناول بھی شائع کئے ہیں۔ ہندی میں ایک ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام سے نکالا تھا۔

س انیس آپ کا تخلص اور تخلص کی عمر بھی کچھ کم نہیں، تقریباً پچاس سال ضرور ہوگی۔ نصف صدی میں آپ نے یقیناً ہزاروں اشعار کہے ہوں گے لیکن طویل عرصے تک بحیثیت شاعر آپ نہ تو معروف ہوئے اور نہ ہی مشاعرے آپ کی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں۔ آخر کیوں؟

ج اس کی وجہ کوئی خاص نہیں، کچھ تو عدیم الفرصتی اور کچھ خود پر بے اعتباری، سالہا سال تک اشعار کہہ کر رد کرتا رہا یا اپنی بیاض میں لکھتا رہا کہ ابھی اس قابل نہیں کہ لوگ انھیں سنیں یا پڑھیں، بھلا ہو ڈاکٹر اختر نظمی صاحب گوالیاری کا جنہوں نے میرے معمولی اشعار سن کر انھیں "غیر معمولی" کا سرٹیفکیٹ عطا کر دیا اور بضد ہوئے کہ میں اپنے اشعار کو مشاعروں اور رسائل کی نذر کر دوں، یوں مجھے حوصلہ ہوا اور میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے شاعر ہونے کا اعلان کر دیا اور بہت کم عرصے میں دنیائے شاعری کا ہر چھوٹا بڑا نہ صرف پہچاننے لگا بلکہ کسی حد تک مجھ سے مانوس بھی ہو گیا۔

س اگر آپ اجازت دیں تو ہم پیچھے مڑ کر دیکھ لیں، میرا خیال ہے کہ آپ کے شوق کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی، آپ کے مختلف شوق آپ کی شخصیت کی غمازی کرتے ہیں۔ فلم بینی کے شوق کی حدیں کہاں جا کر ختم ہوئی تھیں یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں؟

ج طالب علمی کے زمانے ہی سے فلم دیکھنے کا رسیا تھا۔ حد یہ فلم کا پہلا شو دیکھنا اتنا ضروری

تھا جتنا کہ لوگ زندہ رہنے کے لیے سانس لینا لازمی قرار دیتے ہیں۔ ہر جمعہ میرے لیے عید کی طرح آتا تھا۔ آپ کو یہ سن کر شاید استعجاب ہوگا اور رنج بھی کہ فلم "آن" کے ریلیز ہونے کا دن ہی میرے پہلے لڑکے کی تدفین کا بھی دن تھا۔ اپنے لخت جگر کو دفن کر کے جب میں فلم آن کا افتتاحی شو دیکھنے گیا تو منیجر پر گویا حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ منیجر نے رنجیدہ خاطر ہو کر کہا کہ صاحبزادے آج ہی تو آپ کے بچے کی تدفین ہوئی ہے اور آج ہی آپ فلم دیکھنے چلے آئے؟ تو میں نے صبر کی دہلیز سے انھیں جواب دیا کہ پہلے دن کا پہلا شو پھر کہاں مل سکے گا۔

س آپ کی فلم بینی پر آپ کے والدین بالخصوص والد بزرگوار کا ردعمل کیا ہوتا تھا؟

ج والد بزرگوار کا ردعمل بہت سخت تھا اس لیے ہم ان سے چھپ کر فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ والد صاحب کے ڈر کی وجہ سے انٹرول میں واپس بیچ کر آجاتے تھے پھر دوسرے دن جو فلم آدھی رہ جاتی تھی اسے دیکھ لیتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے نیو امر سنیما جو حوض قاضی کے قریب ہے وہاں پر ایک فلم آئی تھی "حاتم طائی کے سات سوال" اس کے سات حصے ہم نے چودہ مرتبہ میں دیکھے تھے۔ لوگ انٹرول میں کھانے پینے جاتے تھے اور ہم ہاتھ منہ دھو کر گھر واپس چلے جاتے تھے تاکہ والد صاحب کو محسوس نہ ہو کہ ہم چوری چھپے فلم دیکھتے ہیں۔

س ملک کا ایک بڑا طبقہ اس رائے سے اتفاق کرتا ہے، کہ فلمی نغمے شاعری کی زد سے بہت دور نظر آتے ہیں۔ آج فن اور فکر دونوں کا فقدان ہے، نیز! یہ کہ ڈیڑھ دہائی پہلے کی تخلیق شدہ اور آج کی فلموں میں کہانی، پچویشن، اداکاری اور اخلاقی مناظر کا ایک فیصد بھی اثر نہیں۔ اس رائے سے آپ کس حد تک متفق ہیں؟

ج پرانی فلمیں ہر چند کہ بہت ترقی یافتہ اور سائنٹفک نہیں ہوتی تھیں، مگر ان کے مناظر، ان کے مکالمے اور گیت اتنے پر اثر ہوتے تھے کہ ایک بار فلم دیکھ کر کم ذہن لوگ بھی گلی کوچوں میں ان کی تکرار کیا کرتے تھے۔ آج یہ حال ہے کہ کئی بار فلم دیکھ کر بھی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ہم نے کیا دیکھا ہے اور کیوں دیکھا؟ کچھ یہی ابتری ساز و نغمہ کا بھی مقدر ہے، آج کا میوزک تمام تر مغرب زدہ ہے۔ موسیقی کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود ہم موسیقی کی دنیا میں گداگر کی طرح زندہ ہیں۔ نغمہ نگاری کے اعتبار سے یہ بات سچ ہی ہے کہ فلمی شاعری فکر و فن سے سراسر محروم تھی، محروم ہے اور محروم رہے گی۔ فلمی نغمہ اصلاً

شاعری نہیں، شاعری کا عکس بھی نہیں۔ فلمی دھنوں کی پگڈنڈی پر الفاظ کے خوش رنگ پھول بچھانے یا یوں کہئے کہ کچھ قرینے سے سجا دینے کا نام نغمہ نگاری ہے اور یہ بات میں اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں۔ خواجہ احمد عباس اور ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریر و ترتیب کے ڈراموں اور فلموں میں میری کردار نگاری میرے تجربے کی کسوٹی ہے۔ میں نے تمثیلی مشاعرے میں مرکزی کردار بحسن و خوبی نبھا کر مولانا ابوالکلام آزاد سے اعزاز حاصل کیا ہے۔ ان دنوں میں ایک فلم (رمن لال ڈیسائی کی فلم چین چرایا تو نے) کے لیے نغمہ لکھ رہا ہوں۔ مگر ہزار چاہتے ہوئے بھی فن کا مظاہرہ نہ کر سکوں گا۔ فکر و فن کی روشنی صرف رسالوں، کتابوں اور مشاعروں ہی کا حصہ ہے۔

س انیس صاحب! آپ نے اپنی شاعرانہ زندگی میں کتنے مشاعروں میں شرکت کی۔ کچھ خاص مشاعرے یاد ہوں تو تفصیل سے بتائیں؟

ج مشاعروں کی کل تعداد بتانا ممکن نہیں ہے البتہ خاص خاص محافل سخن کی کچھ روداد سنا سکتا ہوں۔ اندرون ملک مشاعروں میں شرکت کی روداد خاصی طویل ہے مگر میں اختصار سے کام لے کر عرض کروں گا۔ پہلے پہل انٹر نیشنل مشاعرہ میں نے انبالہ (پنجاب) کا پڑھا اور توقع سے زیادہ پسند کئے جانے کی وجہ سے مجھے خصوصی طور پر نوازا گیا۔ اس موقعہ پر اداکار سنیل دت کے ہاتھوں ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اس کے علاوہ ناگپور (مہاراشٹر)، سورت (گجرات)، بھوپال (ایم پی)، الہ آباد، کانپور، مراد آباد اور کلیئر شریف (اتر پردیش)، جبل پور (ایم پی) شامل ہیں۔ الہ آباد کی شرکت میں خاص بات یہ رہی کہ مشاعرے کے علاوہ کوی سمیلن میں بھی کوی کی حیثیت سے شریک ہوا۔ دو درجن سے زیادہ انعامات و اعزازات حاصل کر چکا ہوں سماجی خدمات کے سلسلے میں (حال ہی میں اردو اکاڈمی امریکہ نے اپنے مشاعروں میں مدعو کیا ہے)

س اب تک کی تخلیقات پر مبنی کل کتنی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

ج ابھی تک صرف مجموعۂ کلام "قدم بہ قدم" آیا ہے۔ اب حمد و نعت کا مجموعہ "دست دعا" اور شاعری کے حوالے سے "سرکش" کی تکمیل میں مصروف ہوں۔ ایک کتاب "انیس دہلوی شخصیت دفن اور کارنامے" بھی شائع ہونے والی ہے۔ اب تک متعدد کتابوں پر دیباچے، تبصرے، آل انڈیا ریڈیو دوردرشن کے ذریعے فلمی مضامین اور شاعری نشر ہو چکی

ہے۔ پچھلے ہفتے ہی اتر پردیش اردو اکاڈمی کے صحافت سیمینار میں ادبی رسائل و جرائد کے مسائل پر مقالہ پیش کر کے آیا ہوں۔

13ر کو بمبئی، دوحہ قطر، دوبئی، کراچی کے ادبی دورے کے بعد اکتوبر میں وشاکھاپٹنم میں مدعو ہوں جہاں آل انڈیا مشاعرہ اور سیمینار میں شرکت کرنا ہے۔ سیمینار کا عنوان ہے "جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ" اردو شعر و ادب اور سیمیناروں کے حوالے سے ادبی مصروفیات کا سلسلہ الحمد اللہ جاری ہے۔

س جیسا کہ آپ کے اسم مبارک کی ابتداء لفظ حاجی سے ہوتی ہے اور یہ احترامی لفظ اس کی دلالت کرتا ہے کہ الحمد اللہ! آپ حج کی سعادت سے دامن مراد بھر چکے ہیں، براہ کرم یہ فرمایئے، کہ آپ نے حج کی سعادت کب حاصل کی؟

ج خدائے بزرگ و برتر کے کرم خاص کی بدولت مجھ حقیر فقیر نے پہلا فریضہ حج 1956ء میں ادا کیا، اور باری تعالیٰ کی بخششوں پر لمحہ لمحہ قربان جایئے کہ آئندہ ہی برس مکرر حج کی سعادت سے مالا مال ہوا۔ پھر ایک سال کے وقفہ سے 1959ء میں تیسری بار حج بیت اللہ کے فریضہ سے باریاب ہوا۔ مزید بر آں 1990ء میں اہلیہ محترمہ کے ہمراہ عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی! وہ بھی رمضان المبارک کے دوران اسی سال نماز عید الفطر بھی بیت اللہ شریف میں پڑھنے کی سعادت ملی۔

س فریضہ حج کی ادائیگی کے سلسلے میں کیا گیا سفر کبھی نہ بھولنے والا سفر ہوتا ہے، اس سفر کا ایک ایک لمحہ ایک ایک مقام اور ہر ایک رفیق سفر زندگی کے آخری سانس تک کے لیے یاد داشت کے خزانے میں یوں محفوظ ہو جاتا ہے، کہ جیسے یہ سب بھی نوشتہ تقدیر کا "جزو لاینفک" ہو۔ بروئے اختصار آپ اپنے شریک سفر حضرات کے بارے میں کچھ بتایئے؟

ج بالکل درست کہا، حج کے مبارک سفر کے دوران ہمراہیوں کو اگر کوئی خدانخواستہ بھلانا بھی چاہے تو بھلا نہیں سکتا لہٰذا دیگر حجاج کرام کی طرح مجھ کمترین کو بھی دوران اسفار "حج" و "عمرہ" اپنے تمام ساتھی آج بھی یاد ہیں اور ہمیشہ یاد رہیں گے!

س ان محترم رفقاء میں کچھ کے اسماء گرامی؟

ج ان میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن (مرحوم) محترم مولانا محمد سعید صاحب کشمیری، پیر مقبول جیلانی صاحب کشمیری رہنما قاری محمد ادریس صاحب (شاہی امام جامع مسجد نئی

دہلی)، شیخ الحدیث حضرت مولانا عمر دراز شاہی مدرسہ مراد آباد، حضرت مولانا وحید قاسمی (رکن جمعیۃ علمائے ہند) اور خادم الحجاج سید سعید الدین بانی مسلم ٹور کارپوریشن بمبئی، خادم الحجاج حبیب اللہ جبل پور کے نام شامل ہیں۔

س "فلمی ستارے" دنیائے ادب وصحافت میں آپ کی شناخت کے لیے بہت کافی تھا، پھر آپ کو رسالہ "باجی" کے اجراء کا خیال اگر آیا تو کیوں اور کب؟

ج 1990ء میں جب عمرہ کے سفر کے دوران میں حیدر آباد کے مہمان خانہ رباط میں ٹھہرا ہوا تھا، کہ باتوں باتوں میں "رباط" کے منیجر عبد اللہ صاحب نے اصرار کیا، کہ آپ نوک قلم کے وسیلے سے کوئی ایسا کام بھی ضرور کریں کہ جس سے اسلام کی بھی کوئی خدمت ہو اور ملت مرحومہ اور بالخصوص اس کی دبی کچلی خواتین میں کچھ بیداری آئے اور وہ سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جائیں۔ لہٰذا جب میں سعودی عربیہ کے مقدس شہر مدینہ منورہ میں حاضر تھا، تو یکایک دل کے کسی گوشے سے رباط (حیدر آباد) کے منیجر صاحب کی پر سوز آواز ابھری، کہ یہی وقت ہے، ملت مرحومہ کے لیے کچھ سوچ لیجئے، کچھ طلب کر لیجئے اور میں نے اس پاک مقام پر دل سے دعا کی، کہ خالق کل میری تازہ آرزو کی راہ میں ثابت قدمی نیز روشن خیالی عطا فرما، ارتقاء سے ہمکنار فرما اور اپنی رحمت کاملہ کے صدقہ ماؤں اور بہنوں کی فلاح کی غرض سے جاری ہونے والے میرے تازہ "جریدے" کو مقبول عام بنا کر ملت کے دینی مقاصد کا بہترین ذریعہ بنا۔ (ذرا سے توقف کے بعد انھوں نے مزید انکشاف فرمایا کہ) رسالہ "باجی" کا موزوں ترین نام بھی ذہن کو مدینہ منورہ میں عطا ہوا۔ اور تمام کاغذی خاکہ بھی۔

س پھر رسالہ باجی کا پہلا شمارہ کب منظر عام پر آیا؟

ج خواتین کا ترجمان رسالہ "باجی" ممکنہ اہتمام اور حسب استطاعت آرائشوں کے ساتھ نومبر 1992ء میں رونما ہوا، اس کی رونمائی کی تقریب میں اس وقت کی چیدہ شخصیات اور سابق وزیر اعظم جناب اندر کمار گجرال صاحب کی نیک خواہشات شامل حال تھیں۔ اس وقت کے وزیر خارجہ گجرال صاحب اپنی ایک خصوصی تقریب کو چھوڑ کر باجی کی رسم اجراء میں ایوان غالب تشریف لائے اور کافی وقت گزارا۔

س آپ کی صحافتی زندگی کے ابتدائی سفر میں جو بلاشبہ امتحان اور آزمائش کا زمانہ ہوگا اس وقت تمام تر مشکلات کے باوجود آپ کے شانہ بشانہ کون کون لوگ تھے؟

ج اس وقت ہمارے ہم قدم مرحوم سلامت علی مہدی، مخمور سعیدی (موجودہ سکریٹری اردو اکاڈمی دہلی)، م. افضل (سابق ایم پی)، معصوم مراد آبادی (ایڈیٹر خبردار ویکلی)، ماجد رمن (نیوز ایڈیٹر راشٹریہ سہارا ویکلی) قیس رام پوری (شاعر آرٹسٹ راشٹریہ سہارا)، طالب رام پوری (جرنلسٹ)، نواب حسن اریوزامروہوی (آرٹسٹ ہما، ہدی، نئی دہلی) نفیس سیوہاروی (آرٹسٹ نئی دنیا) تھے نیز ان کی معاونت اور مخلصانہ کاوشیں آج بھی مجھے حاصل ہیں اور کامل یقین ہے کہ جب تک ادارہ کی سرگرمیاں ہیں تب تک ان سب کا تعاون مجھے ملتا رہے گا! (انشاء اللہ الرحمٰن)

س قوت سماعت سے آپ کی محرومی کے اسباب و عوامل کیا ہیں اور یہ سانحہ کب گزرا؟

ج مجھے خوب یاد ہے اور کیوں نہ یاد ہو، ابھی ابھی کی تو بات ہے 1992ء میں (جسے ہم اس صدی کا سیاہ ترین سال کہہ سکتے ہیں) مجھ پر اچانک فالج کا حملہ ہوا، فالج کے حملے کے اثر سے دماغ، زبان اور قوت سماعت متاثر ہوئے، اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر آرمی ریٹائرڈ ایچ ایل کپور صاحب نے ازراہ محبت مجھے آرمی ہسپتال میں خصوصی طور پر دکھایا۔ وہاں کے انتہائی قابل ڈاکٹروں کی نگرانی میں میرا میڈیکل چیک اپ ہوا جس کی رپورٹ یہ تھی کہ سب کچھ نارمل ہے البتہ دماغی طور پر مجھے "اسپیشل برین" کا مالک قرار دیا گیا۔ ہاں قوت سماعت سے محرومی کا روایتی علاج آلۂ سماعت (سننے کی مشین) کے استعمال کا مشورہ دیا گیا جس پر میں نے فی الفور عمل کیا۔ مگر انھیں دنوں دبئی میں منعقد جشن "جون ایلیا" کے رابطہ آفیسر کے فرائض انجام دینے کے باعث آلۂ سماعت پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ پڑا اور اس نے ساتھ چھوڑ دیا۔ تب سے سمجھنے اور سمجھانے کے جملہ امور اشاروں اور قلم، کاغذ سے انجام پارہے ہیں۔ اب اس دیرینہ الجھن سے نجات کے لیے ایک اور سعی کے طور پر آپریشن تجویز ہوا ہے جس کے خرچ کا تخمینہ پانچ لاکھ روپئے تک ہونے کا اندازہ ہے۔ اس مرحلے پر میں تمام ادب نوازوں سے دعاؤں کا طالب ہوں۔

س دبئی اور سرزمین عرب کے سفر کے علاوہ آپ نے امریکہ، کناڈا وغیرہ کا سفر تو کیا ہے لیکن اس کے علاوہ کسی یورپی ملک کا سفر بھی کیا ہو تو اس کی بھی کوئی ہلکی سی جھلک دکھایئے؟

ج جی ہاں! میں نے یورپی ممالک کے قلب برطانیہ کے عظیم ترین شہر لندن کا سفر کیا ہے اور اس کی وجہ تسمیہ میرے مسقط کے چند عرب دوست اور ان کی لطیف خواہش تھی۔

ہوا یوں کہ مسقط سے میرے کچھ دوست آئے اور مجھ سے اصرار کیا کہ آج کی کم سن مگر باکمال گلوکارہ نازیہ حسن سے چند باتیں اور اس کے ساتھ بطور یادگار ایک ایک تصویر کھنچوانے کے لیے ہمارے ساتھ "لندن" چلیں۔ آپ کے جریدے میں نازیہ حسن کا تعارف اور تصویر چھپی ہیں وہ آپ کو جانتی بھی ہے اور آپ کا احترام بھی کرتی ہے اس لیے آپ کی رفاقت کامیابی کا زینہ ثابت ہوگی۔ ان کو آمادۂ سفر دیکھ کر مجھے بھی یہ لالچ ہوا کہ چلو اسی بہانے اردو ادب کے لائق سپوت جناب گلشن کھنہ، افتخار عارف، عاشور کاظمی، سوہن راہی، حکیم دھرم پال، ساقی فاروقی، ضیا فتح آبادی اور راج کھیتی جو ایک عرصے سے لندن میں مقیم ہیں اور ان سے قلمی روابط تو ہیں ہی بالمشافہ گفتگو کا موقع مل جائے گا۔ یوں ملی جلی خواہشات کے ساتھ ہمارا قافلہ لندن پہنچا اور وہاں دس روز قیام پذیر رہا اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اپنے اپنے طور پر سب کی آرزوؤں کی تکمیل بھی ہو گئی۔

س فلمی ادب اور "فلمی ستارے" کے سربراہ ہونے کے باعث فلم کی کون کون سی شخصیتیں ایسی ہیں جن سے آپ کے برادرانہ اور گہرے روابط رہے ہیں؟

ج دلیپ کمار، سائرہ بانو، موسیقار نوشاد علی، کمال امروہی، پران، مینا کماری، شتروگھن سنہا، راجندر کمار، شاہ رخ خان اور جانی واکر ایسے فلمی ستارے ہیں جن سے میرے گھریلو مراسم رہے ہیں اور ان کے یہاں اکثر تقاریب میں شریک رہا ہوں۔ اور ایک بار بحیثیت صحافی دلیپ کمار اور سائرہ بانو کے ہمراہ پاکستان کا دورہ بھی کیا ہے۔ یہ واقعہ 1984ء کا ہے۔

س نئی نسل کے لکھنے والوں کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

ج وطن عزیز میں نئی پیڑھی پر مشتمل قلم کار برادری انتہائی باشعور ہے۔ علم و فن پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ معتقدین کا احترام اور متاخرین کی تقلید ان کی نگارشات کو جلا بخشنے کے لیے کافی ہیں۔ کتب بینی، اخبار بینی، عالمی معیار کے جریدوں کی ورق گردانی کرتے رہنا اور جربہ سازی سے اجتناب ارتقاء کی بنیاد ہیں، بچوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

●●

پھول عقیدت کے

انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام اردو گھر میں
حاجی انیس دہلوی مرحوم کی وفات پر تعزیتی جلسہ

حاجی انیس دہلوی خلوص، محبت، مروت اور وضع داری جیسی خوبیوں کے حامل انسان تھے۔

● حاجی انیس دہلوی بہت مخلص، محبت کرنے والے، وضع دار اور ہر دل عزیز انسان تھے۔ ان خیالات کا اظہار انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام 9/ جنوری 2001ء کو حاجی انیس دہلوی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے منعقدہ تعزیتی جلسے میں ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر نثار احمد فاروقی، جناب مخمور سعیدی اور دوسرے مقررین نے کیا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے کی جب کہ نظامت کے فرائض جناب مخمور سعیدی نے انجام دیے۔ جلسے کا آغاز قمر سنبھلی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے حاجی انیس دہلوی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ حاجی صاحب کا انجمن اور مجھ سے ایک خاص تعلق تھا۔ وہ میری ہمیشہ سرپرستی کرتے تھے، وہ جب بھی ملتے بہت خلوص اور محبت سے پیش آتے۔ ڈاکٹر انجم نے کہا کہ حاجی صاحب کی اردو زبان وادب اور صحافت کے میدان پر بہت گہری نظر تھی چونکہ وہ بچپن ہی سے صحافت کے میدان میں آگئے تھے اس لیے صحافت کی باریکیوں سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس میدان میں غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔ انھوں نے کئی رسالے اور اخبار نکالے جو کافی مقبول ہوئے۔ انھوں نے میری شخصیت اور فن پر اپنے سہ ماہی رسالے "ایوان ادب" کا نمبر نکالا۔ یہ ان کی مجھ سے بے پناہ محبت اور لگاؤ کا ثبوت ہے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ انھیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت کرے۔

جناب ابوالفیض سحر نے کہا کہ انیس دہلوی کی شخصیت عجیب و غریب تھی۔ انھوں نے تنہا جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ بڑے سے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں کے بس کا نہیں۔ اردو زبان کی ترقی اور فروغ ہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔

جناب معصوم مراد آبادی نے اپنے مضمون کی تلخیص پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ حاجی صاحب محنت اور بے تکان جدوجہد کے آدمی تھے۔ وہ اپنے سے چھوٹوں سے بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ ملک اور بیرون ملک ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔

پروفیسر ظفر احمد نظامی نے حاجی انیس دہلوی کا ایک دلچسپ خاکہ پیش کیا جس میں حاجی انیس دہلوی کی شخصیت اور خدمات پر بہت دلنشیں انداز میں روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے کہا کہ حاجی صاحب بہت مخلص اور ہمدرد انسان تھے۔ وہ ہمیشہ میرے رسالے "فکر و آگہی" کی ترقی کے سلسلے میں فکر مند رہتے اور جب بھی ملاقات ہوتی اس سلسلے میں ضرور گفت و شنید کرتے۔

جناب فاروق ارگلی نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ حاجی صاحب کا اس دنیا سے چلے جانا ہم اہل قلم کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔

ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ حاجی صاحب نہ صرف گنگا جمنی تہذیبی اقدار سے واقف تھے بلکہ وہ ان پر عمل پیرا بھی تھے۔ میں اپنی طرف سے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر فیروز دہلوی نے کہا کہ اڑتیس سال کی رفاقت کو ایک دو منٹ میں بیان کر دینا آسان نہیں۔ حاجی صاحب کے اندر بہت سی خوبیاں تھیں۔ انھوں نے بہت سخت اور نامساعد حالات میں خدمات انجام دیں۔

مخدوم زادہ مختار عثمانی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل غم زدہ ہیں آنکھیں بھی سب اشکبار ہیں
غم میں انیس آپ کے سب بے قرار ہیں

ہمدرد، غمگسار، سراپا خلوص مند
اک شخصیت ہے اور فسانے ہزار ہیں

چرچا انیس کا ہے سبھی کی زبان پر
بعد وفات بھی وہ بہت ذی وقار ہیں

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کہا کہ شاد اور ناشاد ہر حال میں زندگی تو گزارنی ہی ہوتی ہے لیکن ایسا کچھ کر جائیں کہ بعد وفات بھی یاد کیے جائیں، یہ بڑی بات ہے۔ حاجی انیس دہلوی نے ان حالات میں زبان، ادب اور صحافت کی خدمت کی جب بہت کم لوگ ایمانداری اور استواری کے ساتھ ادب سے رشتہ جوڑے رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ حاجی انیس دہلوی صاحب نہ صرف یہ کہ اپنی زندگی کے معاملات میں وضع دار تھے بلکہ وضع قطع اور رہن سہن میں بھی وہ ویسے ہی تھے۔ ان کے اندر بلا کی فہم و فراست اور غیر معمولی صلاحیت تھی۔ وہ دہلوی تہذیب کے جیتے جاگتے نمونے تھے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کہا کہ موت تو ایک ایسی حقیقت ہے جس سے بڑی کوئی دوسری حقیقت نہیں ہے۔ لیکن انسان کی خوبیاں اور اس کے کارنامے ہمیں افسوس کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ بلاشبہ حاجی صاحب بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ سیلف میڈ انسان تھے۔

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے کہا کہ حاجی انیس دہلوی سے میری راہ و رسم کی عمر تیس بتیس سال ہے۔ میں نے انھیں بہت پر خلوص پایا۔ حاجی صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے حلقے میں بھی معروف رہے اور باہر بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے کہا کہ حاجی انیس دہلوی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے

تعزیتی جلسے کا انعقاد انجمن ترقی اردو (ہند) کا بہت مستحسن قدم ہے۔ اس کے بعد دو منٹ کھڑے ہو کر تمام حاضرین نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اسی کے ساتھ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

حاجی انیس دہلوی کے سانحہ ارتحال پر
گوشۂ ادب ابراہیم پور میں تعزیتی نشست

● صوبہ بہار سے نوجوان ادیب و شاعر اور سرکردہ صحافی محمد طالب حسین آزاد مطلع کرتے ہیں کہ گذشتہ سال 31/دسمبر 2000ء کو جیسے ہی بہار کے روزنامہ اخبارات سنگم اور قومی تنظیم میں یہ خبر پڑھنے کو ملی کہ اردو کے معتبر صحافی، ادیب اور شاعر انیس دہلوی اس دنیا سے چل بسے ویسے ہی پورے بہار خاص کر سیتامڑھی ضلع کے اردو حلقوں میں غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

حاجی انیس دہلوی کے سانحۂ ارتحال پر سیتامڑھی ضلع کے متعدد ادبی تنظیموں اور لائبریریوں میں تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں خاص کر حاجی انیس دہلوی کے فین محمد طالب حسین آزاد کی صدارت میں تعزیتی نشست گوشۂ ادب ابراہیم پور میں منعقد کی گئی جس میں بہت سارے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کر کے حاجی انیس دہلوی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو ادب سے ایک بہت بڑا ادیب کا اٹھ جانا بتایا۔ محمد طالب حسین آزاد نے کہا کہ حاجی انیس دہلوی اردو کے بہت بڑے ادیب و شاعر، صحافی اور ایڈیٹر ہی نہیں بلکہ اردو کے بہت بڑے خدمت گار تھے جو اس دنیا سے چل بسے۔ وہ ایک اچھے ادیب و شاعر اور مدیر ہی نہیں بلکہ وہ ایک بہت اچھے انسان بھی تھے۔ جنھوں نے اپنی ساری زندگی اردو کی خدمت کرنے میں گزار دی۔ ان کے اچانک انتقال سے اردو شعر و ادب میں جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کی تلافی حال میں پر ہونا ممکن نظر نہیں آتی۔ خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔
حاجی انیس دہلوی کے سانحۂ ارتحال پر سیتامڑھی کی معروف شخصیت اور دانشور محمد ابو لیث اردو مترجم موتیہاری کلکٹریٹ اور اردو ہندی کی مشہور و معروف ادیبہ و شاعرہ آشا پربھات کے دولت کدہ پر بھی تعزیتی نشست کا انعقاد عمل میں آیا اور بہت سارے ادیبوں، شاعروں اور اردو داں لوگوں نے حاجی انیس دہلوی کے انتقال پر اپنا رنج و غم کا اظہار کیا۔

محمد ابو لیث عرف کالے بابو نے کہا کہ 2000ء نے ہمارے درمیان سے ایسے ادیب و شاعر اور دانشور کو چھین لیا جنھوں نے اپنی ساری زندگی اردو کی خدمت کرنے میں گذار دی باجی، فلمی ستارے اور ایوان ادب جیسے رسالوں کے مدیر تھے اور پابندی سے نکالتے تھے جن کی تعریف کرنا گویا چاند کو چراغ دکھانا کے مصداق ہوگا۔

آشا پربھات نے کہا کہ حاجی صاحب اردو کے ایک اچھے ادیب و شاعر، صحافی اور مدیر ہی نہیں بلکہ ایک بہت ہی اچھے مخلص انسان بھی تھے ان کے انتقال سے اردو ادب میں جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں۔

حاجی انیس دہلوی کے انتقال پر جن لوگوں نے اپنا اظہار غم پیش کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر

محمد مطیع الرحمٰن، عزیز غنی صدیقی، پروفیسر اسعد اللہ، ابرار اکرم کے نام شامل ہیں۔

اردو دنیا کے مشہور شاعر و ادیب
حاجی انیسؔ دہلوی کے انتقال پر تعزیتی نشست

● سیتامڑھی ضلع کے شہری حلقہ راجوئی اور سیتامڑھی ضلع کے کونے کونے میں معمر صحافی اور ادیب و شاعر حاجی انیس دہلوی کے انتقال پر تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ سیتامڑھی کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں نے حاجی انیس دہلوی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا...... شہری حلقے راجوئی میں بڑے پیمانے پر تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ تعزیتی نشست کا اہتمام آواز ادب لائبریری راجوئی سیتامڑھی میں کیا گیا۔ آواز ادب لائبریری کے سکریٹری و روزنامہ قومی تنظیم کے نمائندہ محمد سراج احمد نے کہا کہ حاجی انیس دہلوی کے انتقال سے اردو ادب روٹھا روٹھا سالگ رہا ہے۔ کیونکہ وہ اردو ادب کے روح رواں تھے۔ اردو ادب کے آن شان تھے اور ہم مسلمانوں کے سچے رہنما تھے وہ بے باک صحافی تھے جو ہم لوگوں کی رہنمائی میں کبھی بھی پیچھے نہیں رہے۔ دوسری جانب محمد ممتاز نظامی نے بھی غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حاجی انیس دہلوی کے انتقال سے لگ رہا ہے کہ اردو ادب کا کوئی ستارہ ڈوب گیا۔ ان کے انتقال سے اردو ادب میں جو خلا پیدا ہوا اس کی تلافی ممکن نہیں۔ تعزیتی نشست کے بعد قرآن خوانی کا بھی اہتمام کیا گیا۔ قرآن خوانی کے بعد حاجی انیس دہلوی کے حق میں دعائیں کی گئیں۔ آواز ادب لائبریری میں جن شاعر و ادیبوں اور صحافیوں نے مشہور و معروف شخصیت کے مالک حاجی انیس دہلوی کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کیا مندرجہ ذیل ہیں۔ محمد طالب حسین آزاد، انور علی انور، شہود شمس، محمد ابرار اکرم، حافظ شاہد حسین، این نیازی، حافظ عمر فاروق، محمد سجاد اختر صبا، حشمت عرف چنا، محمد نصر اللہ انصاری، افضل پرویز، مہدی حسن، محمد آفتاب عالم دوسری جانب اطلاع کے مطابق ممبئی سے شرافت علی دلکش، نیپال سے ساجد انور نوری، قومی تنظیم کے چیف ایڈیٹر جناب اشرف فرید، سیتامڑھی سے صبا پروین مظہری پرسونی سیتامڑھی سے مشہور شاعر جناب عبدالخالق ترنم نے بھی حاجی انیس دہلوی کے انتقال پر تعزیتی پیغام پیش کئے۔

حاجی انیسؔ دہلوی کی یاد میں
مغل سرائے مشاعرے کمیٹی کے زیر اہتمام

● ہوٹل آشیانہ کے وسیع ہال میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مشاعرہ کمیٹی کے صدر رامیندر سنگھ صاحب اور نظامت غلام جیلانی صاحب نے فرمائی۔ مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے غلام جیلانی صاحب نے کہا کہ حضرت انیس دہلوی صاحب سے میرے بہت اچھے مراسم تھے وہ ایک ادیب، شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ ان کے انتقال سے ادب میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جسے بھرا نہیں جا سکتا۔ گذشتہ صدی جاتے

جاتے ایک عظیم ہستی کو ہم سب سے چھین کر لے گیا جو اچھا نہیں ہوا۔

پھر نوجوان شاعر سہیل عثمانی صاحب نے کہا کہ حضرت انیس دہلوی صاحب کے انتقال نے مجھے اس طرح چونکا دیا جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھنے کے بعد آدمی چونک پڑتا ہے مرحوم میرے کافی قریب تھے مجھے بہت پیار کرتے تھے جس رات میرے والد محترم نے ریڈیو پر یہ بری خبر سننے کے بعد مجھ سے کہا کہ حضرت انیس دہلوی صاحب نہیں رہے تو پوری رات سویا نہیں میرے گھر کے تمام افراد کو دکھ ہوا ہے کیونکہ وہ میرے گھر بھی جا چکے تھے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے آمین!

تعزیتی نشست میں مشاعرہ کمیٹی کے کنوینر غلام جیلانی صاحب نے ایک اعلان بھی کیا کہ آئندہ مغل سرائے کا 19واں مشاعرہ "بیادگار انیس دہلوی" ہوگا اس پر سبھی نے مبارکباد بھی دیا نشست میں جن لوگوں نے اپنے اپنے خیالات پیش کئے ان میں جناب زمزم رامنگری، سید فیروزالدین، مسلم اقبال، صغیر خان، ڈاکٹر عرفان آرزو، سر فراز نواز، عمیرا انجمی، سحر کاظمی، راجہ رام، آنند پرکاش، امرجیت سنگھ شعیب احمد اور دیگر ادب نواز حضرات بھی حاضر ہوئے!

تعزیتی پیغامات

ہرچرن چاولہ ______ نئی دہلی

• آپ کا بھجوایا ہوا رسالہ "قلمی ستارے" ملا جس میں پہلے ہی صفحہ پر حاجی انیس دہلوی صاحب کی تشویشناک بیماری کے ذکر کے ساتھ ان کی جلد شفا کیلئے آپ نے قلم کاروں اور مداحوں سے دعا کی درخواست درج تھی ہم دعا ہی کر رہے تھے کہ کل کے اخبار "قومی آواز" میں ان کی رحلت کی المناک خبر ملی۔ یہ میرے لئے بڑے دکھ کی بات ہے کہ میں واپس ناروے ماہ اپریل کے آغاز میں ان کے چاہنے والوں کے پاس ان کی صحت کی نہیں، ان کی بے وقت موت کی خبر لے جاؤں گا۔

حاجی صاحب کے انتقال نے اردو کا ایک سچا اور کھرا خیر خواہ ہم سے چھین لیا۔

انور جلال پوری ______ جلال پور

• روزنامہ انقلاب پر جیسے ہی نظر پڑی اپنے دیرینہ کرم فرما حاجی انیس دہلوی کے انتقال کی خبر پڑھی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ ہائے کیسے کیسے لوگ اس دنیا کو چھوڑ رہے ہیں۔ نصف صدی تک قلم کو رواں دواں رکھنا، زبان اور ادب کے چمن کی آبیاری کرنا، نہ شہرت کی خواہش نہ صلے کی پرواہ، کتنا عجیب جذبہ تھا حاجی صاحب کے سینے میں۔ ایسے ہی لوگوں پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے کہ

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

جو لوگ بھی ان سے ایک بار مل چکے ہیں انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ ان کے ہمراہ دبئی کے مشاعروں کا سفر کتنا یادگاری ہو تا تھا اسے لکھنے کے لئے صفحات درکار ہیں۔ ان کے اٹھ جانے سے دلی سونی ہو گئی اردو والے مرحوم کو اک عمر بھلا نہ پائیں گے۔

مشرف عالم ذوقی ______ دہلی

• مجاہد اردو حاجی انیس دہلوی کا انتقال پرملال، اردو ادب کے لئے نا قابل فراموش حادثہ ہے۔

ایک ایسا جانباز، جسے موت پر بھروسہ ہی نہیں تھا وہ بس اردو کیلئے پیدا ہوا تھا۔ بیمار پڑا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ تازہ دم۔ پیرالائس کا شکار مگر پھر تازہ دم۔ نئے ارادے، نئی امنگیں، نئے ولولے۔ خدا نے سننے کی طاقت چھین لی مگر، کوئی پرواہ نہیں

بازو میں طاقت اور ایک بار پھر جنگ کیلئے آمادہ۔ اردو۔ بس اردو۔ اور جگر دیکھئے، کہ اردو میں مثال نہیں ملے گی۔ اسپتال میں گئے۔ زندگی ملی۔ اور فلمی ستارے کو نئی آن بان شان سے "شمع" بناکر میدان میں ڈٹ گئے۔ "موت! ابھی پیچھا چھوڑو۔ دیکھتے نہیں میں کیا کرنے جارہا ہوں۔ وہ چلے گئے تو ایسا لگ رہا ہے اردو زبان یتیم ہوگئی ہو۔ وہ مجھ سے، میری کہانیوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

طرزی بھوپالی ______________ بھوپال

• دل و دماغ پر ایک عجیب قسم کا سناٹا چھا گیا کیونکہ حاجی صاحب کی خوش طبعی، خوش خلقی نیز اخلاص کے سبب ہم لوگ آپس میں اس قدر قریب آگئے تھے کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے ہی گھر کا کوئی بزرگ آج ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا ہوگیا ہو۔

نورامروہوی ______________ بمبئی

• دنیائے اردو کیلئے یہ واقعی سانحہ عظیم ہے۔ مشرقی وسطی، خلیجی ممالک سے حاجی صاحب نے ہندوستان کا جو رشتہ جوڑا مشاعروں کے ذریعے یہاں سے شعراء Export کرکے، غیر ممالک میں اردو سے ناآشنا بستیوں میں اردو مشاعروں کی قندیلیں روشن کرکے وہاں جو نور بکھیرا اور اس غریب زبان کو اس کا جائز حق دلانے کی کوششیں کیں وہ ناقابل فراموش ہیں اس حوالہ سے وہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گے۔

بالخصوص ہمارے لئے (دبئی والوں کیلئے) یہاں کے مشاعروں کیلئے ان کی ذات ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتی تھی۔

دیار غیر میں منتظمین مشاعرہ کو ہندوستانی شعراء سے فرداً فرداً رابطہ قائم کرنا، انہیں تیار کرنا، ان کے نخرے جھیلنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس ناممکن کو ممکن بنانا حاجی صاحب کا ہی طرۂ امتیاز تھا۔

واجد سحری ______________ نئی دہلی

• حاجی جی نے بڑی پروقار زندگی گزاری اور کس کس طرح محنت اور لگن سے ترقیاں کیں میں نے بڑے قریب سے دیکھا ہے مہمان نوازی تواضع وفاداری کا ہمیشہ ثبوت دیا ہے ہر ایک کی خدمت کرنا ان کا شعار تھا انہیں کی طرح سب سے میل جول رکھو خدمت خلق سے بھی کبھی غافل نہ رہنا تمہیں معلوم ہے میں ان کے قریب تھا جس روز حاجی صاحب کا انتقال ہوا میں رامپور کے لئے روانہ ہوچکا تھا بدنصیب ہوں ان کے جنازے میں شریک نہ ہوسکا۔

شہزاد اختر ______________ دہلی

• جناب الحاج انیس دہلوی صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے بھی قلم کانپ رہا ہے۔ جب میں دفتر میں حاضری کے لئے جاتا ہوں تو ایسا گمان ہوتا ہے کہ دفتر میں داخل ہوتے ہی وہ اپنی فطری مسکراہٹ سے میرا استقبال کریں گے۔ جب ان کی خالی نشست پر نظر پڑتی ہے دل پر ایک کٹار سی چل جاتی ہے۔ میں نے حاجی صاحب کی جبیں پر کبھی شکن نہیں دیکھی اور ہر طریقہ سے ضرورت مند کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ حاجی جی صرف گفتار کے ہی نہیں کردار کے بھی غازی تھے۔ وہ ہمیشہ نئے امکانات کی تلاش میں رہے، ہمیشہ سوچتے رہنا۔ نئے نئے خواب تراشنا اور ان خوابوں کو عملی تعبیر عطا کرنے کیلئے ثابت قدمی، مستقل مزاجی اور سنجیدگی کے ساتھ برابر مصروف کار رہنا۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم حقیقت رکھتی ہے کہ الحاج انیس دہلوی صاحب اپنے رسائل کے ذریعے اردو کی اور اردو کے ذریعہ معاشرے کی بے مثل خدمت کررہے تھے اور ساتھ ہی نئے لکھنے والوں کی برابر ہمت افزائی کرتے رہے۔ مرحوم اردو ادب اور صحافت کے ایک سچے اور مخلص خادم تھے جنہیں اردو دنیا کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتی۔

مختار ٹونکی ______________ ٹونک

• روزنامہ "راشٹریہ سہارا" کے ذریعہ الحاج انیس دہلوی کے سانحہ ارتحال کی خبر پڑھ کر دل رنج و قلق سے بھر گیا۔ ٹونک کے ادبی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ ہر شخص اداس ہوگیا کیونکہ ٹونک سے انہیں دلی لگاؤ تھا۔

ف۔ س۔ اعجاز ______________ کلکتہ

• عید کے بعد اس خبر نے مسرت ہی چھین لی کہ حاجی انیس صاحب انتقال فرماگئے۔

انیس صاحب میرے پرانے اور اچھے دوستوں میں تھے۔ ادھر کئی سال سے ہم میں بہت قربت ہوگئی تھی اور یہ دوستی گھریلو سطح پر آگئی تھی۔ اکتوبر میں وہ کلکتہ خاص ہومیوپیتھی علاج کے لئے تشریف لائے تھے، میں انہیں ڈاکٹر بینرجی کے پاس لے گیا تھا۔ تین پڑیوں سے ہی کچھ افاقہ ہوا تھا۔ حافظہ اور چال کچھ بہتر ہوگئی تھی۔

لیکن دہلی جاکر انہوں نے مجھے خط لکھا کہ رمضان بعد باضابطہ ہومیو پیتھی دوا لینا شروع کروں گا تاکہ ڈاکٹر کے بتائے ہوئے طریقے پر تمہارا منہ دوا لے سکوں۔

افتخار امام صدیقی ____ بمبئی

• سماعت سے محروم ہو جانے کے باوجود برسوں برس تک خود کو فعال رکھنا غیر معمولی قوت ارادی والوں کا کام ہے۔ زندہ دل اور زندہ دماغ شخصیت نے اپنی ایک روایت قائم کی۔ افسوس! صد افسوس کہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

شاید میں نے اپنی غزل کا یہ شعر مرحوم کے لئے ہی کہا ہے

وہ نہ ہوگا تو کیا کمی ہوگی
بس ادھوری سی زندگی ہوگی

جلیل باذید پوری ____ بمبئی

• انیس بھائی کے انتقال کی خبر سے دل کو شدید جھٹکا لگا مگر کیا کیا جائے۔ بقول اختر الایمان ؎

بہے جارہی ہے کشتیِ عمر رواں آہستہ آہستہ
خواب و خیال ہوتا جارہا ہے یہ جہاں آہستہ آہستہ

بڑے نیک سیدھے سادے اور یاروں کے یار تھے جب بھی بمبئی آتے مجھے خط لکھتے "اسٹیشن پر آجاؤ" اور آشیانہ میں قیام فرماتے۔ کبھی ایک وقت کی نماز قضاء نہیں کی اور نہ سفر میں انہوں نے روزہ چھوڑا۔ ان کی یادیں برسوں رلاتی رہیں گی اور ادبی دنیا سونی سونی نظر آئے گی وہ بیک وقت شاعر صحافی اور ادیب بھی تھے۔

اسلم کولسری ____ لاہور

• 1995ء میں، میں دوحہ میں ان سے پہلی بار ملا، افسوس کہ پہلی ملاقات ہی آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ اس کے باوجود، یوں لگا جیسے ان سے برسوں سے ملاقات ہے بلکہ بچپن کے دوست بھی اتنے خوشگوار کب ہوں گے جتنے وہ تھے۔ میں اس ملاقات کے بعد، ہمیشہ ان کی یاد کی گرفت میں رہا اور دوسری ملاقات کے لئے بے تاب، مگر قدرت کو ایسا منظور نہ تھا۔ رب کریم انہیں غریق رحمت کرے۔ (آمین)

تابی انصاری ____ کانپور

• حاجی انیس دہلوی کی رحلت سے آپ سب کا نقصان تو ہوا ہی، اس کے ساتھ اردو زبان و ادب سے ان کی دیرینہ وابستگی کی وجہ سے اردو کاز کو بھی نقصان پہنچا۔

آپ لوگ ضروری خطوں کا بھی جواب نہیں دیتے، جس سے بے حد الجھن اور پریشانی ہوتی ہے۔ براہ کرم اس کا جواب ضرور اور فوراً دیجئے۔ شکریہ۔

عشرت قادری ____ بھوپال

• اخبارات میں حاجی صاحب کی رحلت کی خبر پڑھ کر از حد ملال ہوا۔ دہلی میں ان کا وجود ایک شجر سایہ دار کی طرح تھا۔ جو باہر سے آنے والے شاعروں، ادیبوں اور ثقافت سے وابستہ لوگوں کو جھلستی ہوئی دھوپ سے اپنی نرم اور خوشگوار ٹھنڈک سے نوازتا تھا۔ ان کے مزاج کی لطافت، اخلاص کی پاکیزگی اور ہر کسی سے ٹوٹ کر ملنے کی روش اور من موہنی اداؤں نے جہان ادب کو اپنا گرویدہ اور فریفتہ بنا رکھا تھا۔ ان کے کردار کی یہی تمام خصوصیات تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ "فلمی ستارے" اور "باجی" کا دفتر کسی بھی مہمان کی میزبانی میں سراپا خلوص اور عجز و انکسار بنا رہتا تھا۔ ان کی رواداری اور وضعداری اب کہاں نصیب ہوگی۔

مجھے اس رائے کے اظہار میں کوئی باک نہیں ہے کہ حاجی صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ایک عظیم ادارہ تھے، جنہوں نے زبردست محنت، مشقت اور جاں فشانی سے آخر عمر تک اردو زبان و ادب اور ہماری تہذیبی وراثت کی ترقی، فروغ اور ترویج میں عہد ساز خدمات انجام دیں جنہیں حقیقت پسند مورخ بھی فراموش نہیں کر سکے گا۔

نفیس بانو شمع ____ نئی دہلی

• یہ سچ ہے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کے بعد ہم ہر جانے والے کو رفتہ رفتہ بھول جاتے ہیں۔ مگر...... کچھ لوگ، کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو کر بھی ہمارے درمیان رہتی ہیں۔ مرحوم کا شمار بھی انہی لوگوں میں

صحافتی چراغ تلے ان کا نام کئی حوالوں سے روشن رہے گا۔ ماہنامہ "فلمی ستارے" "باجی" اور "ایوان ادب" کے علاوہ ان کی تحریریں، شاعری، ناول اور خواجہ احمد عباس کی فلم "پردیسی" میں درباری کے کردار سے لے کر ریوتی سرن شرما کے ریڈیائی ڈرامہ "زندگی کیا ہے" کے مرکزی کردار تک متعدد اسٹیج ڈراموں میں فنی صلاحیت کا

مظاہرہ۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ایسے باہنر شخص کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ وہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ فنکار کبھی مرتا نہیں۔

نعیم انصاری ___________ ناگپور

• آپ کے والد محترم جناب انیس دہلوی صاحب کی رندگیں رحلت سے مجھے دلی صدمہ پہنچا ہے۔

حاجی صاحب ایک ہمہ جہت اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے انہوں نے بہت کم عرصے میں اپنی شاعری سے ایک بڑے حلقے کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ وہ بہت صاف ستھرے کردار اور نیک عادات کے حامل تھے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

محمد توفیق خان ___________ سرونج

• کیا کہیں کیا نہ کہیں سب باتیں ایک رسم کے طور پر کہی جاتی ہیں۔ جانے والا چلا گیا اور ایسے وقت گیا جب ان کی سخت ضرورت تھی۔ بچپن کی ملاقات کئی برس بعد دوبارہ نصیب ہوئی تھی ہر ماہ مجھے ضرور کارڈ لکھتے رہے۔ سیٹی کو بات سمجھانا ہوتا تو میرے ہی ذریعہ سمجھاتے۔ پہلے حملہ کے بعد جب ہاسپٹل سے آئے تو خود قلمی کارڈ مجھے لکھتے رہے اس بار دوبارہ حملہ کی صورت میں یعنی کلکتہ کی واپسی کے بعد آخری خط ان کا مجھے ملا تھا۔

زندگی میں فرماتے تھے کہ میں نے سب کام بچوں کو سکھادیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کے چلائے ہوئے کام کو اسی طرح انجام دیتے رہو گے۔

نظر کانپوری ___________ وارانسی

• محترم حاجی انیس دہلوی اردو ادب کے اہم ترین سرپرست تھے اردو زبان کو عام آدمی تک پہنچانے اور ہندی اردو کو ساتھ ساتھ آگے بڑھانے میں مرحوم حاجی انیس دہلوی صاحب کی سرحت اور خدمت کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ قومی یکجہتی ان کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی طرح ہی ان کے الفاظ میں عطا ہوتی ہے۔ ان کا جذبہ انسان کے ذریعے اللہ سے عشق اور محبت کا تھا۔

وہ شعر و ادب کی دنیا کے بادشاہ تھے اور مشاعروں کے سرپرست تھے۔ میرے شعر و سخن کے سفر میں میری رہنمائی اور سرپرستی کرتے ہوئے مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ اپنے بنارس اور مغل سرائے کے دورے کے وقت میرے پاس رکتے تھے اور غزل کی باریکیوں کے بارے میں بتاتے تھے۔

آج وہ ہمارے بیچ نہیں ہیں۔ مجھے ان کی کمی ہمیشہ محسوس ہوگی۔ ہم اور ہمارے گھر کے سب لوگ آپ کے اس غم میں شریک ہیں۔ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کو جنت عطا کرے۔ (آمین)

ایوب اثر ___________ شاہجہاں پور

• اخبار میں ایک جاں سوز خبر دیکھی کہ موجودہ عہد کا ایک معروف مدیر، جہاندیدہ صحافی، منفرد لب و لہجے کا شاعر حاجی انیس دہلوی بھی آخر ش داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

خلیل تنویر ___________ اودے پور

• اس خبر سے از حد رنج ہوا کہ محترمی جناب انیس دہلوی صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔

انہوں نے اردو مخالف ماحول میں جس خود اعتمادی کے ساتھ اردو رسالے "قلمی ستارے" "باجی" اور "ایوان ادب" جاری رکھے انہیں بھلایا نہیں جاسکتا۔ قلمی رسالوں میں جہاں "روبی" اور "شمع" بند ہو گئے تھے وہاں "قلمی ستارے" برابر شائع ہو رہا تھا۔

امید ہے "ایوان ادب" کا ایک خصوصی شمارہ حاجی انیس دہلوی کی اردو خدمات پر شائع کریں گے۔

رضوان احمد ___________ پٹنہ

• حاجی صاحب کے انتقال کی اچانک خبر بے حد اداس کر گئی۔ آپ جانتے ہی ہیں ان سے کیسا قلبی لگاؤ تھا بے حد صدمہ ہوا۔

پریم پال اشک ___________ نئی دہلی

• انہیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ عمل کے پیکر اور اخلاص و محبت کے اور دلی کی تہذیبی اور سماجی زندگی کے اس ترجمان کی وفات پر کسے افسوس نہ ہوگا۔ آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرا اپنا کوئی عزیز مجھ سے ہاتھ چھڑا کر رب العالمین کی گود میں جا پہنچا ہے۔

ڈاکٹر عزیز اندوری ___________ اندور

• محترم حاجی انیس دہلوی اس جہان میں نہیں رہے خبر پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ ہائے! کیا باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے مرحوم۔

میرے کرم فرما۔ میرے مونس۔ ایسا محسوس

ہوتا ہے میرے سر سے رفاقت کا ہاتھ اٹھ گیا۔

گوہر شیخ پوروی ______ بنارس کینٹ

• کل اچانک ایک بڑے حادثے کی خبر ملی۔ حاجی صاحب کے انتقال پر ملال کی روح فرسا خبر سے جو غم ہوا وہ احاطۂ تحریر میں نہیں لا سکتا۔

ایم. مصطفےٰ خان ______ کلکتہ

• ہمت عزم کا جواں سال بے مثال نمونہ تھے اردو نواز ادبی محفلوں کی زینت ان سے قائم تھی گذشتہ سے پیوستہ رابطہ کا ایک ایسا سلسلہ قائم کیا ہے جو ان کی یادوں کو ہمیشہ زندہ رکھے گا آنے والی نسلیں ان کی ادبی صلاحیت کا احترام کریں گی اور زمانہ عقیدت کا پھول نچھاور کرتا رہے گا۔

ڈاکٹر اے۔ ایم۔ ذ تشی گلزار ______ نوئیڈا

• میں حاجی انیس دہلوی کو 1952ء سے جانتا تھا۔ وہ سیاسی، سماجی اور ادبی و صحافتی میدان میں 30 برس سے مسلسل اور مفید خدمات انجام دے رہے تھے۔ بہت معمولی آغاز سے رفتہ رفتہ اپنی محنت، لگن، تعلقات اور حسن اخلاق سے جگہ جگہ کام کرتے ہوئے خود دبستان میں گلستان بن گئے۔ "شمع" سے "فلمی ستارے" تک کا سفر آزمائشوں سے بھرپور تھا وہ پامردی سے حالات کا مقابلہ کر کے ان کو مساعد بناتے چلے گئے اور آخر ایک مدیر، طابع، ناشر، کمپیوٹر کے ماہر اور اپنے چھاپہ خانے کے مالک ہوئے۔ کئی رسالے نکالے۔ مختلف محاذ پر نام پیدا کیا غیر ممالک میں اردو اداروں کیلئے ہندوستان میں رابطہ سازی کرتے رہے۔ اللہ ان کو معاف فرمائے ان کی مغفرت فرمائے انہیں درجات دارین نصیب اور کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو۔ اور ان کی آل اولاد کی توفیقات میں ہر طرح اضافہ ہو اور وہ حاجی انیس کا نام روشن کریں اور اردو کی بے لوث خدمات اور ادبی و تہذیبی ورثہ کو مزید آگے بڑھائیں اور اہل علم کی قدر کرتے رہیں۔

ملک نیوز ایجنسی ______ دہلی

• جناب انیس دہلوی صاحب کی اچانک موت کی خبر سے آگاہ کیا گیا تھا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ موت برحق ہے۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔ جو بھی اس دنیا میں آیا ہے اسے واپس لوٹنا ہے۔ ان کی موت سے ہمیں سخت صدمہ پہنچا ہے۔ ہم آپ کے اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے درجات میں بلندی عطا فرمائے۔ (آمین)

ضمیر یوسف ______ ہوڑہ

• بارگاہ خداوندی میں دعا گو ہوں کہ وہ حضرت حاجی انیس دہلوی صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کی قبر پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ (آمین)

ماہنامہ "باجی" "فلمی ستارے" اور "ایوان ادب" حاجی صاحب کی یادگاریں ہیں۔

جلیس نجیب آبادی ______ نجیب آباد

• حاجی انیس دہلوی صاحب کے سانحہ ارتحال کی خبر تمام ادبی حلقوں کیلئے ایک عظیم رنج و غم کا کوہ گراں ہے، اللہ رسائل کو سرسبز و شاداب رکھے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین!

ڈاکٹر یوسف گوہر ______ شاہجہاں پوری

• دنیائے صحافت میں بہت بڑی کمی محسوس کی جائے گی۔ وہ بڑے دور اندیش اور مخلص انسان تھے۔ اردو کیلئے ایک مجاہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہر اردو دان سے ان کی دوستی تھی۔ ان کے انتقال پر ہر آدمی کی آنکھ نم ہو گئی ہو گی۔ خدا انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عنایت فرمائے۔ (آمین)

ڈاکٹر معصوم شرقی ______ کلکتہ

• انیس دہلوی کے انتقال کی خبر انتہائی اندوہناک ہے۔ خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

والدین خواہ کتنے ہی بوڑھے کیوں نہ ہو جائیں لیکن ان کا سایہ سر پر رہے تو آدمی کو ڈھارس رہتی ہے، دل کو سکون ملتا ہے ان سے پیار ملتا ہے، دعائیں اور ہدایتیں ملتی ہیں۔ آپ کے اس المناک حادثہ کو میں نے کس طرح محسوس کیا ہے، میری نم ناک آنکھیں اس کی گواہ ہیں۔

شکیل اعظمی ______ سورت

• آخر جس کا ڈر تھا وہی ہوا۔ ان کے انتقال کی خبر کی جب سرخی دیکھی تو آنکھ بھر گئی اور دل ہل گیا۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ ان کی زندہ دلی دوستوں میں مشہور ہے۔ انہوں نے اردو کیلئے جو کیا ہے۔ انشااللہ یاد رکھا جائے گا۔ اسپتال جانے سے پہلے انہوں نے مجھے اپنے نعتیہ مجموعے کی کمپوز شدہ فائل دکھائی تھی۔ سرورق بھی دکھایا تھا۔ افسوس کہ یہ کام ان کی حیات

میں شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ لیکن پہلی فرصت میں یہ مجموعہ منظر عام پر آنا چاہیے۔

اختر شاہجہاں پوری ______ شاہجہاں پور

• مرحوم میرے کرم فرماؤں میں تھے بڑی محبت سے خط لکھتے تھے۔ خدا انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین۔ مرحوم دہلی کے سینئر صحافی تھے اردو کی ترقی کیلئے زندگی بھر کوشاں رہے۔

محمد اطہر مسعود خاں ______ رامپور

• قبلہ انیس صاحب کا کل انتقال ہوگیا کل سے اسی تذبذب اور سکتہ میں ہوں کہ اس خبر پر کیسے یقین کروں ان کے ساتھ ان کے پاس گزرا ہوا ہر لمحہ یادگار ہے۔ ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو جو اپنی حد تک میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ حاجی انیس صاحب سب سے زیادہ مجھ سے قریب ہیں۔ سب سے زیادہ مجھ سے محبت رکھتے ہیں۔ "ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے"

انہوں نے بہت کام کیا ہے۔ وہ ہر ایک کے کام آتے تھے، میں انہیں کیا نام دوں، وہ میرے والد کی طرح مشفق تھے۔ وہ دوست تھے۔ ہمدرد تھے۔ غم گسار تھے۔ بہترین مشیر تھے۔ ہر گام پر ہر کام میں بہترین رائے دیتے تھے۔ بقول احمد فراز کے "ان کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے"۔

قمر جہاں ______ ناگپور

• حقیقت تو یہ ہے کہ اس حادثہ کو قبول کرنے کو دل تیار ہی نہیں ہوا۔ واقعی علم دوست ہونے کے علاوہ وہ کس قدر زندہ دل انسان تھے بس میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ اس غم کے تاثرات بیان کرنے کی قلم میں سکت نہیں۔ یقیناً ان کا نام اردو زبان و ادب کی خدمت کیلئے تب تک باقی رہے گا جب تک سورج، چاند باقی ہے۔ (آمین)

شہناز فاطمہ رشید ______ ٹونک

• ابو کے انتقال کی خبر نے دل دہلا کر رکھ دیا۔ دل اس قدر رویا کہ بیان سے باہر ہے۔ مجھے لگا کہ آج پھر میرے سر سے ایک باپ کا سایہ اٹھ گیا میں ابو کو ہی سب کچھ مانتی تھی۔ ان ہی کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر سماج میں بڑی جدوجہد اور ابو کی کرم فرمائی سے مجھے ایک مقام ملا تھا۔ ابو کی سرپرستی میں رہ کر بے فکر تھی۔ جو بھی پریشانی یا تکلیفات پیش آتی تھیں ابو کو لکھتی تھی۔ آج بالکل تنہا ہو کر رہ گئی ہوں۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔ (آمین)

صلاح الدین نیر ______ حیدر آباد

• نامور صحافی اپنے کرم فرما انیس دہلوی صاحب کے سانحہ ارتحال کی خبر پڑھ کر بے حد رنجم ہوا۔ انیس دہلوی نے ایک صحافی کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک شاعر کی حیثیت سے بھی زبان و ادب کی غیر معمولی خدمت کی ہے۔ بے حد شریف وضع دار اور معتبر انسان تھے۔ خدا انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

سید اختر الاسلام ______ میرٹھ

• بیسویں صدی کے جاں بلب لمحات میں بہنے والے آنسوؤں کا ایک قطرہ آنکھوں میں رہ گیا تھا وہ اس صدی کے آخری دن آنکھ سے حاجی انیس دہلوی کے انتقال کی خبر سن کر بہہ گیا۔ آنکھیں اب ساکت و صامت ہیں کیا دیکھیں کس طرح نئی صدی کا استقبال کریں۔

ریحانہ عاطف الٰہی خیر آبادی ______ خیر آباد

• اللہ سے ہاتھ پھیلا کر دعا کر رہی تھی کہ حاجی صاحب کو رب ذوالجلال شفایاب کردے، مگر اللہ نے اس بار انہیں اپنے گھر بلالیا اور حاجی صاحب کے تمام مداحوں کو آنسوؤں کے حوالے کردیا مرحوم بڑے ہی جفاکش انسان تھے اردو زبان کے سچے خدمت گذار، سچے ہمنوا، بہترین صحافی، سلجھے ہوئے ادیب، وقت و حالات کے تیور پہچان کر شعر کہتے تھے دنیا کے تمام موضوعات ان کی شاعری میں جھلکتے تھے۔ ہائے اللہ اب کہاں ملیں گے ایسے صاحب دل اور صاحب بصیرت و بصارت انسان۔

جلیل ساز ______ ناگپور

• اخبار میں پڑھ کر کلیجہ منہ کو آگیا کہ ہم سب کے مخلص و محترم ساتھی برادرم الحاج انیس دہلوی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا! اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ضیاء جعفر ______ بنگلور

• حاجی انیس دہلوی صاحب کے انتقال کا سانحہ پڑھ کر آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، انیس دہلوی صاحب میرے لئے بھی پدرانہ محبت رکھتے تھے۔ نہ جانے کتنوں

کو انہوں نے ادبی دنیا سے روشناس کرایا ہے، وہ اردو کے لئے دن رات محنت کرتے تھے، بیماری کی حالت میں بھی وہ اردو کی ترقی کیلئے کوشاں رہے، خدا انہیں جنت مرحمت کرے۔ (آمین)

سطوت زہرا سطوت ____________ دہلی

• افسوس صد افسوس کہ اردو کا ایک سرپرست چلا گیا۔ پروردگار ان کو جنت نصیب کرے۔ کہاں ملتے ہیں ایسے ادب نواز لوگ۔ ان کے جانے سے ایک عظیم نقصان ہوا اردو کا اور اردو ادب کا۔

محمد ایوب واقف ____________ ممبئی

• محترم انیس دہلوی صاحب کے انتقال کی خبر جب سے سنی ہے دل پریشان ہے اردو زبان نے اپنا ایک جاں نثار اور بہی خواہ کھو دیا ہے۔ اردو کے ایسے خدمات گار بہت کم رہ گئے ہیں۔

سید عامر علی ____________ دہلی

• اسلامیہ مڈل اسکول پہاڑی بھوجلہ دہلی کی ایک تعزیتی نشست میں مندرجہ ذیل قرارداد پاس ہوئی۔

جناب انیس دہلوی صاحب کی وفات نہ صرف اردو ادب کا بہت بڑا نقصان ہے بلکہ ہم ایک بڑی ہندوستانی شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے ہندوستان بھر میں ہی نہیں دنیا کے متعدد ممالک میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ وہ آج ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی خدمات ہمارے درمیان ہمیشہ موجود رہیں گی جو ہمیں ان کی یاد بھی دلاتی رہیں گی اور ہماری رہنمائی بھی کرتی رہیں گی۔

انجمن ترقی اردو سرونج ____________ سرونج

• انجمن ترقی اردو شاخ سرونج کی جانب سے ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس میں انجمن ترقی اردو سرونج کے صدر محمد توفیق خاں، انتساب کے ایڈیٹر ڈاکٹر سیفی سرونجی کے علاوہ مقامی شاعروں اور ادیبوں نے شرکت فرمائی۔

محمد توفیق خاں نے حاجی صاحب کے انتقال پر دلی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو دنیا ایک بہترین صحافی سے خالی ہو گئی۔ "ایوان ادب" "باجی" اور "فلمی ستارے" جیسے پرچے نہ صرف پابندی سے نکلتے تھے بلکہ ان کی شخصیت اور محبت کے آئینہ دار تھے۔ سرونج میں وہ دو تین بار تشریف لائے تو غریب خانے کو بھی عزت بخشی۔ سیفی سرونجی نے جذباتی انداز میں کہا کہ حاجی صاحب نہ صرف "انتساب" کے سرپرست تھے بلکہ انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنی اولاد کی طرح سمجھا۔ ادارہ انتساب نہ صرف ایک سرپرست سے محروم ہو گیا بلکہ ایک شفیق بزرگ اور ایک بڑی شخصیت سے بچھڑ جانے کا غم تمام اردو دنیا کو ہے۔

نثار احمد فاروقی ____________ نئی دہلی

• مرحوم بہت خوش مزاج، خوش اخلاق، ملنسار انسان تھے انہوں نے سخت محنت کر کے ادبی صحافت میں اپنا مقام بنایا تھا اور آج وہ اردو دنیا کی ایک جانی مانی محترم شخصیت تھے۔

امین بنجارا ____________ جموں

• الحاج انیس دہلوی صاحب کے انتقال پر ملال کی اطلاع دہلی سے ایک دوست نے فون پر دی تو میرے حواس پر بجلی سی گر پڑی۔ ابھی تو انہیں بہت کچھ کرنا تھا۔ اردو زبان، اردو ادباء و شعراء اور نئی نسل کو ان کی فیض رساں شخصیت سے ابھی بہت کچھ حاصل کرنا تھا لیکن مشیت ایزدی!

بہر کیف بارگاہ الٰہی میں یہی دعا ہے کہ مرحوم انیس صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو (آمین)! "جموں و کشمیر اردو اکاڈمی" کی جانب سے انیس صاحب کو "آبروئے ادب ایوارڈ" کیلئے منتخب کیا گیا تھا لیکن افسوس کہ ان کی حیات میں یہ ایوارڈ انہیں پیش نہ کیا جا سکا۔

سیفی سرونجی ____________ سرونج

• حاجی صاحب کے انتقال سے آپ کو اور دیگر اہل خانہ کو جتنا بڑا غم ہوا ہے وہ اپنی جگہ ہے مگر آج مجھے بھی اپنی یتیمی کا احساس شدت سے ہوا ہے میرا تو سب کچھ چلا گیا ہے حاجی صاحب مجھے بھی اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔

کمال جعفری ____________ کلکتہ

• آپ کے والد بزرگوار اور ہمارے محترم دوست حاجی انیس دہلوی 30 دسمبر کو انتقال کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون! اس اندوہناک خبر کے پھیلتے ہی اردو دوستوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے ان کے انتقال کے بعد اردو دنیا کو جو

نقصان عظیم پہنچا ہے اس کی تلافی اب ممکن نہیں ہے۔

عبدالاحد ساز ـــــــــــــــ ممبئی

• حاجی انیس صاحب کے سانحہ وفات کی دل شاق خبر مجھے اس وقت ملی جب میں کوچین گیا ہوا تھا۔ میں نے معاً فون پر اپنے گھر رابطہ کیا تھا تو بیوی نے بتایا کہ روز نامہ انقلاب میں حاجی صاحب کے انتقال کی خبر شائع ہوئی ہے۔ سوچا تھا کہ آپ کو خط اس وقت لکھیں جب دل کسی قدر سنبھل جائے۔

حاجی صاحب کی رحلت آپ ہی کی طرح میرے لئے بھی ایک ذاتی غم ہے اور اردو کے ادبی و سماجی حلقوں کے لئے ایک مشترک رنج تو ہے ہی۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ اس وقت جب کہ میں آپ سے ہم کلام ہوں حاجی صاحب سے ممبئی، دبئی اور دہلی کی ملاقاتوں کا منظر آنکھوں میں جوں کا توں اجاگر ہے۔ وہ ہمیشہ کس شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ ان کی سادہ مزاجی اور انکسار میں ایک عجیب نوع کا وقار تھا۔ وہ ایک وضع داری تھی جو پرانے بزرگوں ہی سے منسوب ہے۔

کچھ عرصہ قبل جب گہری علالت کے بعد حاجی صاحب صحت یاب ہو چلے تھے اور دفتر آنے لگے تھے تو ہمیں بھی اطمینان سا ہونے لگا تھا۔ مگر اللہ کی مشیت لازم و فائق ہے۔ ہاں ہمیں یہ بات باعث تسکیں ہے کہ حاجی صاحب نے ایک بھری پری خاندانی، ادبی اور سماجی زندگی گزاری اور کامیابی کے مراحل طے کئے اور پوری اردو دنیا میں روشناس رہے۔

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی ـــــــــــــــ ٹونک

• حاجی صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر مجھے بے انتہا دکھ ہوا جس کے بیان کے لئے الفاظ نہیں ہیں وہ میرے شفیق کرم فرما تھے جو مجھ سے ہمیشہ کے لئے دور چلے گئے خدا ہمیں اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ حاجی صاحب مرحوم نے مجھے آخری خط 20ر ستمبر 2k کو لکھا تھا جس میں انہوں نے ٹونک کے دیدار کی خواہش کی تھی۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

امجد علی سرور ـــــــــــــــ دوحہ قطر

• دوحہ "گلف ٹائم" (روزنامہ) میں مجلس فروغ اردو ادب کے توسط سے شائع شدہ خبر سے پتہ چلا کہ محترم جناب حاجی انیس دہلوی صاحب اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

کفایت یقین کریں یہ اندوہناک خبر ہر وہ شخص جس کا شعر و ادب سے ذرا بھی رشتہ ہے اس کیلئے وجہ حزن و ملال و افسوس ہے۔ انہوں نے اردو ادب کی خدمت جب کہ اردو تعصب کی شکار رہی جس خلوص و محبت اور والہانہ انداز سے کی ہے اس کی کم مثال ملتی ہے ورنہ اس عہد میں تو ہر کوئی محض نام و نمود اور شہرت کا خواہاں ہے۔ میرے حلقہ ادب اسلامی کے اراکین سے عہدہ داران اور حلقہ احباب یعنی "دبستان اردو" کے ارباب سخن فرید ندوی، افتخار راغب، منصور اعظمی، شوکت علی ناز، ارشاد اعظمی، اشفاق قلق، عزیز رشیدی، عاطر صدیقی اور عزیز نبیل بھی اظہار افسوس کرتے ہیں اور سلام علیکم عرض کرتے ہیں۔

زہرہ مسرور ـــــــــــــــ شاہ گنج

• حاجی انیس دہلوی کی رحلت کی خبر میرے لئے ایک اور سانحہ عظیم ثابت ہوئی ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ میری شریک حیات زہرہ بھی اس دار فانی سے 8ر دسمبر 2000ء (۱۱ر رمضان ۱۴۲۱ھ) رات ساڑھے سات بجے میرے ہی ہاتھوں میں بہ وجہ عارضہ قلب اچانک رحلت فرما گئیں اور میں دیکھتا رہ گیا۔

حاجی انیس دہلوی صاحب نے مجھ میں لکھنے کی ایک بے تکان جوت جگائی تھی۔ اب وہ روشنی ہی میری رہگذر سے معدوم ہو گئی ہے۔ اس تاریکی میں مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا ہے۔ ایک کہانی غیر مطبوعہ ان دنوں کی یاد میں جب میری بیوی زہرہ بھی بقید حیات تھیں اور وہ روشنی بھی جو دنیائے ادب کو خیرہ کر رہی تھی، عقیدت بطور بھجوا رہا ہوں۔ مرحوم ان تمام عارضات کو برداشت کرتے ہوئے بھی جن سے وہ گذر رہے تھے باوجود اس کے میدان ادب و محفلات میں بلا عذر و برابر اپنی کارگذاریوں سے ضیاء بخشی فرماتے رہے۔ اور قرطاس ایض پر اپنی دھاک و موجودگی برقرار رکھی۔

محمد اسلم صفی اللہ بک سیلر ـــــــــــــــ ممبئی

• انیس صاحب کیلئے مرحوم کا لفظ استعمال کرتے ہوئے جو احساسات ہیں وہ تحریر کرنا ممکن ہی نہیں۔

بارگاہ خداوندی میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی مرحوم انیس بھائی کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

شاہد قمر آفریدی ______ علیگڑھ

• والد صاحب حاجی جی کے انتقال کی خبر اخبار میں پڑھ کر دل پر عجیب سی کیفیت گذری کہ بس سب کچھ پھیکا پھیکا سا محسوس ہونے لگا۔ یہ دردناک خبر سن کر دل ٹوٹ سا گیا ہے ایک طویل عرصہ تین دہائیوں سے زائد تعلقات کا سلسلہ ٹوٹ گیا ہے نرالی دنیا سے اب تک جتنے بھی پرچے نکلے ہیں ان سے تعلق رہا۔ مدینہ منورہ کے دوران وحیدہ باجی کا سفر 1990ء کی یادیں نقش ہیں اور وہاں سے "باجی" رسالہ کے اجراء کا تصور دیگر ملاقاتی ہنگامے، مذاق، تلخ و تند شیریں یادیں ذہن سے فراموش نہیں ہو گئیں۔ دبئی کے مشاعرے اور "سلیم جعفری نمبر"۔ صحافی، شاعر، "قدم بہ قدم" زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں یاد انیس اور آواز انیس نہ گونجی ہو۔ ایسی بھاری بھر کم شخصیت زمانہ میں کم ہی ہوتی ہیں۔

محمد رفیق ______ بھوپال

• 31/ دسمبر 2000ء کے مقامی روزنامہ "اردو ایکشن" میں محترم انیس بھائی کے سانحہ ارتحال کی جگر خراش خبر نظر سے گذری، ایسا محسوس ہوا میرا اپنا خود کا عزیز رخصت ہوا، ان کا جنازہ میرے اپنے گھر کے صحن سے اٹھا۔

صبر، صبر، صبر صرف صبر۔ رب کریم ان کے درجات بلند کرے۔ (آمین)

رئیس الدین رئیس ______ علی گڑھ

• قمر تنویر صاحب سے معلوم ہوا حاجی انیس صاحب رحلت فرما گئے تو سکتہ سا ہو گیا کچھ دیر تو یقین ہی نہ آیا مگر میرے بھائی یہ وہ منزل ہے جہاں سے ہر ذی نفس کو گزرنا ہے۔ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ حاجی صاحب کو غریق رحمت کرے اعلیٰ مقام عطا کرے۔ (آمین)

مومن خاں شوق ______ حیدر آباد

• حاجی انیس دہلوی کے سانحہ ارتحال کی خبر روزنامہ "سیاست" میں پڑھ کر انتہائی رنج و ملال ہوا۔ ایک ادبی سرپرست، ادب نواز، پر خلوص، پر وقار، معتبر شاعر و صحافی ہم سے بچھڑ گیا جس کی سرپرستی میں "باجی" "فلمی ستارے" اور "ایوان ادب" دن دونی، رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ اللہ کی مرضی کے آگے کیا کیا جا سکتا ہے سوائے صبر کے اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور ادھورے کام پورے کرنے کے۔

حاجی انیس دہلوی کا کام انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا اور ان کی یاد ہمارے دلوں میں سدا رہے گی۔

زبیر قریشی ______ دہلی

• حاجی انیس دہلوی صاحب اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ نہایت صدمہ اور افسوس ہوا۔ میرے حاجی انیس دہلوی صاحب سے تقریباً 25 سال سے بہترین تعلقات تھے۔ میں ان کو اپنا دوست اور رفیق سمجھتا تھا۔ وہ اردو دنیا کے بے باک صحافی اہل قلم اور شاعری کی دنیا کے بے تاج بادشاہ تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں بے شمار خوبیاں عطا کی تھی وہ نئے لکھنے والوں کیلئے بھی ایک رہبر تھے۔ اور علم و ادب کا جیتا جاگتا خزانہ بھی۔ حاجی انیس دہلوی صاحب کی شخصیت عجیب طرح کی تھی۔ وہ بڑوں میں بڑے اور چھوٹوں میں چھوٹے بچوں کی طرح اپنی شرارت بھری بات چیت سے محفل میں نمایاں نظر آتے تھے۔ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

میں حکومت دلی سے یہ گذارش کرتا ہوں۔ کہ وہ بازار ترکمان گیٹ کا نام "حاجی انیس دہلوی مارگ" رکھ کر ان کے لاکھوں چاہنے والے اردو دوستوں کو ان سب کی جانب سے خراج عقیدت پیش کریں۔

ڈاکٹر مہندر اگروال ______ شیوپوری

• ہم سب کو دلی صدمہ ہوا۔ حاجی صاحب کے انتقال سے۔ ہم نے خصوصاً انڈو پاک لٹریری سوسائٹی نے اپنا مشفق سرپرست کھو دیا ہے۔ ہم سب بارگاہ رب العزت میں دعا کرتے ہیں کہ اللہ پاک مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین!

ہم تمام لوگ یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کے کاموں کو روز افزوں فروغ ہو۔

راز اعظمی ______ گورکھپور

• بابو کفایت صاحب! خدا کرے آپ ہمیشہ بخیر رہیں عرض تحریر یہ ہے کہ اخباروں کے ذریعہ یہ اطلاع ملتے ہی کہ بھائی انیس مرحوم ہو گئے پاؤں کے تلے سے زمین نکل گئی میرے دل میں ایک غم کی لہر دوڑ گئی ہے جو غم سے کبھی خالی نہیں ہو گی آج بھائی انیس کیلئے میرے غریب خانے پر قرآن خوانی بھی ہے خداوند قدوس سے

میں اور اہلیہ دعا گو ہوں کہ مرحوم کو خداوند قدوس اپنے جوار رحمت میں جگہ دے کر جنت الفردوس میں داخل فرمائے۔ آمین! تعزیتی جلسے کی روداد ارسال خدمت ہے ہم لوگ آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

افضل منگلوری ________ روڑکی

• کئی مرتبہ کوشش کی تم تک پہنچوں اور اپنے کرم فرما دعا گو میرے مشیر محترم الحاج انیس دہلوی صاحب کے بارے میں گفتگو کروں تمہارے اور اپنے دلی صدمے کی کچھ بھڑاس نکالوں مگر ہمت ہی نہیں ہوتی۔ بغیر حاجی صاحب کے تمہارے گھر کا تصور ہی ڈسنے لگتا ہے خدا خوب واقف ہے میرے دل میں ان کی کتنی قدر و قیمت تھی وہ بھی جانتے تھے جب بھی گذارش کی رڑکی اور کلیئر تشریف لانے کی فوراً میری گذارش کو عملی جامہ پہنایا ہے تھکے ہارے ہی سہی مگر تشریف لائے اور غریب خانے کو رونق بخشی ہے۔ سوچتا ہوں کہ دل کا کمزور ہوں کس طرح ان کی غیر موجودگی میں تمہارے درمیان ان کے بنائے ہوئے گھر بار میں جاؤں گا ابھی کچھ دنوں قبل علالت کے دوران ہی میرے پاس ان کا مفصل خط آیا تھا جس میں مجھے میرے دبئی اور پاکستان کے مشاعروں میں شرکت کی دلی مبارکباد تحریر کر کے مجھے حوصلہ بخشا تھا بار بار خط پڑھتا ہوں تو دل بھر آتا ہے پروردگار عالم تمہیں ہمت دے اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلنے کی۔ مجھے پوری امید ہے کہ تم ان کی روش پر چل کر ان کا نام روشن کرو گے اور اسی طرح عزت و شہرت اور دنیاوی اور دینوی دولت حاصل کرو گے تم بھی برابر آؤ گے رڑکی اور کلیر شریف ایسی امید ہے تمہاری ذات سے میں تمہارے اور تمہارے متعلقین کے ساتھ ہوں عنقریب یہاں آنے کی زحمت دوں گا محترمہ بھابی کو میرا سلام اور مزاج پرسی کرو۔

ڈاکٹر ریاض خلیقی ________ ملیر کوٹلہ

• قبل ازیں 18 جنوری کو میرے چچا جان مولانا عبدالوہاب خلیقی صاحب تشریف لائے تو ان سے حاجی صاحب کے انتقال کی خبر سنکر ایک دم بجلی سی گر پڑی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف فرما کر جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین! اردو والے دہلی کے بابائے اردو سے محروم ہو گئے۔ حاجی صاحب کے بعد اردو کا جو نقصان ہوا ہے۔ اس کی تلافی ناممکن ہے محترم حاجی صاحب نے اردو کی جو خدمت کی ہے۔ وہ تعریف کی محتاج نہیں ہے۔

شمیم انجم وارثی ________ گرولیا

• حاجی انیس دہلوی صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر اخبارات کے ذریعے مل چکی تھی حاجی صاحب کے اخلاق اور حسن سلوک سے میں بے حد متاثر ہوا کرتا تھا، اس بے پناہ غم کے لمحات میں میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یہ ناقابل تلافی نقصان برداشت کرنے کی قوت دے اور مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)

ترنم ریاض ________ نئی دہلی

• دلی لوٹنے پر معلوم ہوا کہ محترم و معظم شفیق بزرگ، اردو کے ایک ایماندار مجاہد جناب انیس دہلوی انتقال کر گئے۔ اس خلا کی تلافی بے شک تا قیامت ممکن نہیں۔

اللہ پاک انہیں غریق رحمت فرمائے اور آپ سب کو صبر جمیل۔

محمد شاہد پٹھان ________ جے پور

• حاجی انیس صاحب کے انتقال کی خبر سن کر بے حد افسوس ہوا۔ اللہ مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ آمین!

مرحوم سے میری بھی دہلی میں ملاقات ہوئی تھی ایک سیمینار میں رسائل کے حوالے سے وہ مجھ حقیر سے بھی واقف تھے کہنے لگے کہ "میں تو تمہیں کوئی بزرگ شاعر سمجھتا تھا" ان کے یہ الفاظ مجھے اعتماد و اطمینان فراہم کرتے ہیں ان میں چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی قلبی وسعت تھی۔ جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اور آج کل تو اس قدر قحط محسوس ہوتا ہے میں نے مرحوم سے کچھ دیر کی ملاقات میں یہ محسوس کیا کہ وہ بڑے دلچسپ دوست اور خلیق انسان تھے مجھے علم نہیں تھا کہ مرحوم کم سنتے ہیں۔ دوران گفتگو انہوں نے فرمایا "میں کسی کی سنتا نہیں ہوں سناتا ہی سناتا ہوں" مرحوم سے چند منٹوں کی وہ ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

نثار راہی ایڈووکیٹ ________ بھوپال

• حاجی انیس دہلوی صاحب یعنی آپ کے والد محترم کی رحلت کی خبر سن کر میں سخت صدمے میں ہوں۔ اور ایسا پہلی بار ہو رہا ہے کہ صدمے کے باعث میں لکھ نہیں پا رہا ہوں

کیا لکھوں؟ جس تحریر کو حاجی صاحب پڑھ کر خوش نہ ہوں تو ایسی تحریر کے لکھنے میں کیا مزہ؟ پہلے جب بھی وہ دہلی سے باہر چلے جاتے تھے تو میں یہاں بھوپال میں انتظار کرتا رہتا تھا کہ فلاں تاریخ کو وہ دہلی واپس آجائیں گے۔ یعنی وہ دہلی میں اور اپنے کاشانے میں رہتے تھے تو ہمیں اطمینان رہتا تھا۔

اور آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے کہ میں انہیں بے حد عزیز تھا۔ بھوپال آتے تھے تو دو تین لوگوں کو ساتھ لے کر میرے پاس عدالت میں ہی مجھ سے ملنے آتے تھے۔ اتنا با اخلاق، ملنسار اور محبت والا بھلا دیگر کون صحافی ہوگا؟ ان کے وجود سے آپ کے گھر میں، اور پھر اردو ادب کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچی رہتی تھی۔ اور جس شہر کو وہ چلے جاتے تھے تو وہاں کی ادبی دنیا میں ہلچل سی مچ جاتی تھی۔ ادب کے لوگ بہت محبت سے ان سے ملنے ان کی قیام گاہ پر آتے تھے۔

وہ دو تین رسائل کے ذریعہ رہبر کارتر (ترکمان گیٹ) سے ادب کی ایک بہت بڑی شمع روشن کر کے گئے ہیں۔ ان کے سبھی لائق بیٹوں کا فرض ہے کہ وہ اس شمع کو ویسی ہی جلتی رہنے دیں۔ مجھے امید ہے کہ صحافت میں جس قدر دلچسپی وہ رکھتے تھے اب آپ بھی ان کے جانشین کی حیثیت سے اتنی ہی دلچسپی رکھیں گے۔ اور ان کی ڈیسک کو مصروف رکھیں گے۔ اور ان کے ادب کے چمن کو کسی طور بھی اجڑنے نہ دیں گے۔ حاجی صاحب صحافت کے سارے گر آپ کو سکھا چکے ہیں اور آپ کو خود بھی خاصہ تجربہ ہے۔ حاجی صاحب سے تعلق رکھنے والے سبھی قلمکاروں سے آپ رابطہ بنائے رکھیں انشاء اللہ سبھی لوگ حاجی صاحب کی محبت میں آپ کو تعاون دیتے رہیں گے۔ اپنے ادبی پروگراموں سے بھی کو وقت وقت پر مطلع کرتے رہیں اور اپنے گھر سے شائع ہونے والے رسائل کو بھی کبھی کبھی بھیجتے رہیں تاکہ سبھی کو یہ معلوم رہے کہ آپ کے گھر میں اب بھی ادب کی گہما گہمی ہے اور ادب سے متعلق آپ کے جذبات ہنوز گرم ہیں۔

اب ہم سب کو حوصلہ رکھنے اور صبر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ اور صبر کرتے وقت یہ ضرور یاد رکھیں کہ اتنے فاصلے پر رہ کر بھی آپ سب کے غم میں ہم برابر کے شریک ہیں۔

فرخندہ اجمیری ________ اجمیر

• امید ہے اہل خانہ خیریت سے ہوں گے۔ اب تک کچھ۔ کچھ صبر و قرار ضرور میسر ہوا ہوگا۔

وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ حاجی صاحب کی تصویر کے نیچے مرحوم پڑھتے ہوئے بہت شاک لگا۔ تجہیز و تکفین کی تصاویر دیکھ کر بے اختیار دل بھر آیا۔ آپ اور ہم دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے آمین!

رسالہ دیکھ کر یک گونہ اطمینان ہوا کہ باقاعدگی سے آپ اسی معیار سے رسالہ منظر عام پر لائے خدا کرے جو پودا حاجی صاحب نے لگایا تھا اس کو اور مزید تناور درخت کی شکل آپ لوگ دیں پہلے بھی یوں تو آپ لوگوں کی محبت برابر شامل تھی۔ لیکن ایک بزرگ اور قابل قدر ہستی کی سرپرستی حاصل تھی اب وہ شفیق و سرپرست ہاتھ نہیں رہے۔

میرا انٹرویو آپ نے شائع کیا آپ کی بہت بہت شکر گزار ہوں۔ انٹرویو میں زبردست غلطی ہو گئی ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگار کی جگہ شاعرہ لکھا ہے۔ پلیز اگلے شمارے میں اس کو درست کر دیجئے گا۔

جگن ناتھ آزاد ________ جموں

• آپ کے والد محترم اور اپنے عزیز دوست جناب انیس دہلوی کے انتقال پر ملال کی خبر میں نے عمان میں سنی اور جب میں دہلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک دن قبل تعزیت کا جلسہ اردو گھر میں منعقد ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں اس جلسے میں شریک نہ ہو سکا۔ لیکن اس بات پر بے حد شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کو تعزیت کا خط لکھنے میں اتنی دیر کر دی۔

دہلی سے واپس جموں پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ بیوی کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے میں آپ کو جلدی خط نہ لکھ سکا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انیس دہلوی کے انتقال سے مجھے جو صدمہ ہوا ہے وہ الفاظ میں

نہیں آسکتا۔ قریب قریب نصف صدی کی دوستی تھی۔ وہ میرے قدردان بھی تھے، مداح بھی تھے۔ خود بہت اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ آپ کے تو علم میں ہے کہ جب ان کا پہلا مجموعہ کلام شائع ہوا تو میں نے نظم میں اس مجموعے کا استقبال کیا۔ بعد میں ان کی فرمائش پر اس سے متعلق نثر میں ایک مضمون لکھا۔ میں ان کے کمال فن کا قائل تھا۔

اس صدمے کے موقعے پر میں آپ کے اور تمام اہل خاندان کے غم کا اندازہ کر سکتا ہوں لیکن یہ حقیقت آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی کہ جو اس دنیا میں آیا ہے اسے جانا ہے۔ یہ سلسلہ روز اول سے روز ابد تک جاری رہے گا۔ اور یہ بتانے کی بھی میں ضرورت نہیں سمجھتا کیونکہ آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ اب اہل خانہ کی دیکھ بھال آپ کے اور آپ کے بھائیوں کے سپرد ہے۔ اس موقعے پر جہاں میں یہ دعا کرتا ہوں کہ خداوند کریم مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے وہیں اس بات کی بھی دعا کرتا ہوں کہ اپنے خانوادے کی طرف آپ کی ذمہ داریوں میں کوئی کمی نہ آئے۔

ماہ و انجم ______________ مراد آباد

● میرے شفیق و محب صادق محترم حاجی صاحب کی رحلت نے دل کا کیا حال کیا ہے کیسے بیان کروں؟ مجھے تو پورا یقین تھا وہ یہ جھٹکا بھی برداشت کر جائیں گے اور بفضل تعالیٰ پھر کچھ دنوں بعد اردو کی خدمت میں سرگرم ہو جائیں گے مگر اس بار خدا کو یہی منظور تھا۔ رب کریم ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار خاص میں جگہ عطا کرے۔ آمین!

کفایت بھائی صبر کیجیے اور بڑے ہونے کے ناطے عزیز القدر سمیع بھائی اور ناصر بھائی کے ساتھ بہنوں اور خصوصاً والدہ محترمہ کی ہمت بھی بندھائیے۔ خدا آپ سب کو، ہمیں اور پوری اردو دنیا کو صبر دے۔ آمین! حاجی صاحب مرحوم کا انتقال پوری اردو دنیا کا نقصان ہے، فلمی ستارے، باجی اور ایوان ادب کے ذریعہ وہ تو اردو کے تن مردہ میں روح پھونک رہے تھے ایسے دور میں جبکہ اردو صحافت کے بڑے بڑے تناور درختوں کو وقت کی آندھی نے نہیں چھوڑا حاجی صاحب نے نئے چراغ جلا کر اپنے جذبہ خدمت اور آہنی ہمت کو ایک عالم سے منوایا۔ یہ بڑی بات ہے۔

حاجی صاحب قبلہ میرے انتہائی شفیق و مہربان تھے میرے ساتھ ان کا حسن سلوک آپ کے علم میں بھی ہے وہ میری بیٹی کی شادی اور جگر فاؤنڈیشن (مرحوم جس کے رکن خاص تھے) کے مشاعروں میں متعدد بار مراد آباد تشریف لائے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی 96ء میں مجھے دبئی کے مشاعرہ جشن سپاس میں مدعو کرایا، میں ان کی کس کس عنایت کا ذکر کروں بس برابر ایصال و ثواب کر رہا ہوں سردی کی شدت کم ہوتے ہیں دہلی حاضر ہو کر بھی آپ سے ملاقات کروں گا۔ آپ ان کے جلائے ہوئے چراغ روشن رکھنے میں ہر خدمت و تعاون کے لئے ہمہ وقت حاضر ہوں۔

رنج و غم کے ماحول میں بھی آپ مصروف کار ہیں اس سے آپ کے جذبہ عمل اور ہمت کا خوشگوار اندازہ ہوا رب کریم ہر طرح سے آپ کی مدد فرمائے اور خانوادہ انیس کی دونوں عالم میں لاج رکھے۔ آمین!

ساوتری گوسوامی ______________ کلکتہ

● اعجاز صاحب کے E.Mail سے ہمیں انیس بھائی صاحب کی وفات کی خبر ملی یہ افسوس ناک خبر سن کر دلی رنج ہوا اور آنسو رواں ہو گئے۔ میرے لئے یہ غم اتنا شدید اور گہرا ہے کہ اس کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں خدا آپ سب کو اس گہرے صدمے کو برداشت کرنے کی ہمت اور حوصلہ دے۔

ان کے ہاتھوں کا لکھا پہلا اور آخری خط میرے ہاتھوں میں ہے۔ پہلے خط کا پہلا جملہ "آپ کی کہانیاں لاجواب ہوتی ہیں۔" ایک ممتاز ادیب کے ہاتھوں لکھے مجھ جیسی لونی کیلئے یہ بڑی بات تھی۔ پڑھ کر مجھے خود اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اور آج بھلا کس طرح میرے آنسو تھم سکتے ہیں۔ ان کے ہر خط سے اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ انیس بھائی جان نے میرے لئے جو کیا میں بیان نہیں کر سکتی۔ ان کے چلے جانے سے مجھ جیسے ٹوٹا پھوٹا لکھنے والوں کو بڑا عظیم نقصان ہوا ہے۔ کہ اب ہمارے حوصلے بڑھانے والے نہیں رہے۔ ان جیسی شخصیت بہت کم اس دنیا میں آتی ہیں جو چھوٹوں کو آگے بڑھائیں۔

میری پہلی ملاقات ان سے عذرا بجی کے گھر میں ہوئی تھی۔ وہ بھی میرے لئے ایک یادگار بن کر رہ گئی ہے۔ کہنے لگے اگر آپ کے پاس کچھ لکھا ہے تو مجھے دیں۔ میرے بھائی جان کے جانے سے اس دنیا میں ایک خلاء سا ہو گیا ہے جسے کوئی نہیں بھر سکتا رب کائنات سے دعا ہے کہ مرحوم کو جنت میں اعلیٰ مقام اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین ••

کلام
حاجی انیس دہلوی

تارِ نظر کا رابطہ دل سے ہی کٹ گیا
یہ کیا ہوا کہ تیر نشانے سے ہٹ گیا

قدرت خدا کی دیکھیے تلوار سر پہ تھی
لیکن ہر ایک وار اُسی پر پلٹ گیا

آنکھیں تری تجلی کو دیکھیں تو کس طرح
پیکر میں تیرے سارا اُجالا سمٹ گیا

دشمن سے مسکرا کے جو پوچھا ذرا مزاج
پل بھر میں ہی لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا

وہ آئے اور گھر کو مرے ڈھا کے چل دیے
کتنا بڑا یہ کام ذرا میں نمٹ گیا

پھر دیکھنا انیسؔ سیاست کا حالِ زار
دل میں بھرا غبار کسی دن جو چھٹ گیا

جلائیں ہم جسے بس وہ چراغ جلتا ہے
ہمارے آگے ہواؤں کا دم نکلتا ہے

اسے بھروسہ نہیں میری رہنمائی پر
مرا قبیلہ حریفوں کے ساتھ چلتا ہے

وہ راہبر تو نہیں اعتماد کے قابل
ہر ایک موڑ پہ جو راستہ بدلتا ہے

ذرا سی دیر کی مہماں ہے یہ حکومت بھی
امیرِ شب کو بتادو کہ دن نکلتا ہے

اُسی کے حصے میں آتی ہے کامیابی بھی
جو لڑکھڑا کے بھی گرتا نہیں سنبھلتا ہے

محبتوں کو ہماری نگاہ میں رکھ لے
یہ پھول ہیں انہیں پیروں سے کیوں مسلتا ہے

حضور انیسؔ کو کمتر شمار مت کیجیے
کہ اُس کے شعر کا قد آپ سے نکلتا ہے

ہر تیر دشمنوں کا کمانوں تک آگیا
سیلاب دیکھ لیجیے مکانوں تک آگیا

اے اہلِ ہند خود کو بچالو کسی طرح
سانپوں کا زہر اُن کی زبانوں تک آگیا

اے دوستو شکار ہے آسان آج کل
پنچھی خود اُڑ کے اپنے نشانوں تک آگیا

دورِ جدید سارے ذرائع کے باوجود
بربادیوں کے تیرہ دہانوں تک آگیا

یہ عہد ہے ادب کی خرید و فروخت کا
الفاظ کا ہنر بھی دکانوں تک آگیا

ٹی وی، انیسؔ نکلا لٹیرا بہت بڑا
اخلاق کے حسین خزانوں تک آگیا

○

عجیب ڈھب کا مسافر ہے، گھر نہ آئے گا
جو وقت بیت گیا لوٹ کر نہ آئے گا

یہ اقتدار ملا ہے بڑے جتن کر کے
اب اُن کو اپنے سوا کچھ نظر نہ آئے گا

چراغ کیسے جلیں گے اُداس پلکوں پر
جو ڈھل کے اشکوں میں خونِ جگر نہ آئے گا

یہ گمرہی بھی نئے راستے نکالے گی
ہمارے آگے اگر راہبر نہ آئے گا

نہ جانے کیوں مری آنکھیں لگی رہیں در پر
میں جانتا تھا کہ وہ رات بھر نہ آئے گا

یہ سانحہ ہے، کہ سر سے اٹھے گھنے سائے
اب اپنی راہ میں کوئی شجر نہ آئے گا

غموں کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہوئے ہو انیسؔ
تمہارے ہاتھ خوشی کا ثمر نہ آئے گا

○

زخموں کی طرح وقت کے انعام لکھے ہیں
ابتک مرے احساس پہ کچھ نام لکھے ہیں

چہرے کا تاثر تو زمانے کے لئے ہے
پڑھیے مری آنکھوں میں جو پیغام لکھے ہیں

میخانہ ہے اُن کے لئے سیراب ہیں جو لوگ
ہم تشنہ لبوں کے لئے کب جام لکھے ہیں

انعام وفاؤں کا مرے حق میں ہے کیا خوب
جلتے ہوئے اس نے سحر و شام لکھے ہیں

انسان ہی اک چیز ہے جس کی نہیں قیمت
اس دور میں ہر چیز پہ کچھ دام لکھے ہیں

موسیٰ کی طرح ذہنوں پہ نیکی نہیں لکھی
فرعون نے دھرتی پہ بس اہرام لکھے ہیں

اچھا ہے کہ آرام کی مٹی نہ بنایا
قسمت میں انیسؔ اس نے مری کام لکھے ہیں

○

یہ صدی رنج و مصائب کی صدی لگتی ہے
زندگی بھی مجھے زخموں کی گلی لگتی ہے

جھوٹ سننے کا ہر اک شخص ہوا ہے عادی
ہو جو میٹھی بھی تو سچائی بُری لگتی ہے

یہ ضروری نہیں انسان کو مل ہی جائے
ایسی ہر چیز جو آنکھوں کو بھلی لگتی ہے

خط میں تحریر مجھے ملتے ہیں اُس کے آنسو
لفظ چھوتا ہوں تو آنکھوں میں نمی لگتی ہے

میرے پرکھوں کی بھی مٹی ہے اسی مٹی میں
اس لئے خاکِ وطن مجھ کو بھلی لگتی ہے

غسل کرتے ہوئے محبوب سا لگتا ہے یہ چاند
چاندنی رات ستاروں کی ندی لگتی ہے

ہم نے دیکھے ہیں فسادوں میں وہ منظر بھی انیسؔ
اپنے ہی خون میں ہر چیز سنی لگتی ہے

عمران نقوی

کمپیوٹر ایج اور اردو ادب

پچھلے دنوں پاکستان کے معروف اخبار روزنامہ "نوائے وقت" لاہور نے کمپیوٹر ایج اور ادب کے تعلق سے ایک سروے کرایا تھا اس کے لیے سوالوں کے جواب چھ شخصیتوں سے لیے گئے۔ ذیل میں سوالات اور جوابات پر مشتمل سروے "نوائے وقت" کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

1۔ کیا دور حاضر میں تخلیق پانے والا ادب "کمپیوٹر ایج" کا ادب ہے؟

2۔ آنے والے دور میں اردو کی مقبول ترین صنف ادب کون سی ہو گی؟

3۔ فروغ ادب کے حوالے سے الیکٹرانک میڈیا کے کردار سے آپ مطمئن ہیں؟

یہ وہ سوال تھے جو ہم نے "چھ شخصیات، تین سوالات" کے زیر عنوان سروے میں ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر جیلانی کامران، ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا، اے حمید، پروفیسر ڈاکٹر مظفر عباس اور سلمٰی اعوان سے کیے۔ ان سوالوں کے جواب دیتے ہوئے اردو تنقید، شاعری، تحقیق اور فکشن کی ان ممتاز شخصیات نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا۔ اس سروے کی تفصیلات نذر قارئین ہیں۔

(ڈاکٹر وزیر آغا)

ا۔ جس طرح فلم ایج اور ٹیلی ویژن ایج میں پیدا ہونے والے ادب کو ہم فلم ایج کا ادب اور ٹیلی ویژن ایج کا ادب نہیں کہہ سکتے اسی طرح، کمپیوٹر ایج کا ادب کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ فلم، ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر ادب کے فروغ کے لیے محض ذرائع ہیں اور بس۔

۲۔ اس کا حتمی جواب تو کوئی نجومی ہی دے سکتا ہے۔ ادب کا قاری تو اس سلسلے میں امکانات ہی کی بات کرے گا۔ سو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ 21 ویں صدی کی عام جہت کیونکہ اختصار میں جامعیت کی طرف ہے اس لیے غزل، مختصر نظم اور انشائیہ کے فروغ کے زیادہ

امکانات دکھائی دیتے ہیں۔

۳۔ فروغ ادب کے سلسلے میں الیکٹرانک میڈیا کے کردار سے میں مطمئن ہوں مگر ابھی شروعات ہے۔ آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا......

(جیلانی کامران)

۱۔ ہر گز نہیں۔

اس میں جو بات واضح نہیں ہے وہ یہ ہے کہ کمپیوٹر ایج کا انسان کس قسم کا ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی ترجیحات کیا ہوتی ہیں، اور کیا وہ ادب کے قارئین میں سے بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ ان تینوں سوالوں سے ادب کے بارے میں منفی رویے آشکار ہوتے ہیں اور ماڈرن ٹیکنالوجی کی زبان میں موجود ادب کلچر Space کے سکڑنے کی نشاندہی کرتا ہے۔ جب کلچر سپیس سکڑتی ہے تو قارئین کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ موجود اردو ادب روایتی انسان کا ادب ہے۔ پہلی بات یہ کہ کمپیوٹر ہماری ایجاد نہیں ہے۔ ہم نے اسے خریدا ہے۔ ہم کمپیوٹر کو ٹیکنالوجی کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اس لیے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کمپیوٹر کے ساتھ ہمارا ایجاد کیا ہوتا تو ہمارا ذہنی رشتہ ہے یا ہنر مندی کا رشتہ۔ اگر ہم نے کمپیوٹر ایجاد کیا ہوتا تو ہمارا ذہن کمپیوٹر کے Wave Lengt پر ہوتا۔ اس ذہن کی پہچان ہمارے لیے بہت دشوار ہے۔ یہ ذہن آپ کو مغربی یورپ خاص طور پر امریکہ میں ملے گا۔ ہم کمپیوٹر کے شعور سے کئی منزلیں پیچھے ہیں۔

۲۔ اس سوال کا نہایت آسان جواب یہ ہے کہ ہمارے جو شاعر اور ادیب سمندر پار سفر کرتے ہیں اور وہاں ادب کی نمائندگی کرتے ہیں اس کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ مستقبل کی مقبول ترین صنف ادب صرف غزل ہوگی۔

۳۔ ہر گز نہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کے پالیسی ساز ادب کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں اور نہ الیکٹرانک میڈیا کے کردار کو ایسا رخ فراہم کرنا چاہتے ہیں جس سے ناظرین کی ذہنی تربیت ہو سکے۔ اس موضوع پر پالیسی سازِ افراد کا سنجیدگی سے غور کرنا مناسب ہے۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا)

1۔ "لمحہ موجودہ کا اردو ادب" سے مراد اگر وہ ادب ہے جو پچھلے پندرہ بیس برس سے لکھا جا رہا ہے (کیونکہ ہمارے ہاں کمپیوٹر ایج بہت تھوڑی ہے) تو کسی زبان کے ادب کی اتنی مختصر

عمر کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا ممکن نہیں ہے۔اس سوال پر غور کیا جائے تو بے شمار مزید سوال پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کمپیوٹر ایج کا ادب دوسرے ادوار کے ادب سے مختلف ہونا چاہئے یا نہیں؟ کیا کمپیوٹر ایج ماضی کے ادب کو یکسر رد کر دے گی یا اعلیٰ درجے کا ادب ہمیشہ زندہ رہے گا۔ خواہ کسی بھی "ایج" میں تخلیق ہوا ہو؟ ادب کا براہ راست کمپیوٹر ایج سے کیا تعلق بنتا ہے؟ ادب کے پھیلاؤ میں کمپیوٹر کا کیا حصہ ہے؟ اس پھیلاؤ کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ سوال بر قرار رہے گا کہ تشکیل و تخلیق ادب میں کمپیوٹر کوئی کردار ادا کرے گا یا نہیں؟ اور وہ کتنا مؤثر ہو گا؟

ظاہر ہے یہ بڑے پیچیدہ سوالات ہیں اور ان کے قطعی جوابات دیئے ممکن نہیں۔اس سلسلے میں قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔ غالباً مستقبل کا اردو ادب کمپیوٹر ایج سے بہت جلدی تبدیل نہیں ہو گا۔جو ملک کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں بہت آگے ہیں ان میں بھی روایت سے مکمل گریز نظر نہیں آتا۔انسان بدل رہا ہے لیکن مکمل طور پر نہیں بدلا اور غالباً اس کے کئی جذبات زندہ رہیں گے،اگر خوشی،رنج،غصہ،محبت،نفرت اور اس قسم کے جذبے زندہ رہیں گے تو کمپیوٹر ایج کے باوجود ادب کی تخلیق مستقبل میں ماضی سے یکسر مختلف نہیں ہو گی۔

میرے نزدیک یہ سوال کہ موجودہ اردو ادب کمپیوٹر ایج کا ہے یا کمپیوٹر ایج کے مطابق ہونا چاہئے...... ایک غیر اہم سوال ہے۔

ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ کمپیوٹر ایج کے متوازی اس کی تخلیق کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر عہد میں بہت سا فضول ذخیرہ ادب کے نام پر تحریر کیا جاتا ہے،وہ مر جاتا ہے لیکن اعلیٰ چیزیں زندہ رہ جاتی ہیں۔ وقت یہی سلوک موجودہ اردو ادب کے ساتھ کرے گا۔اس لیے وہ کمپیوٹر ایج کے مطابق ہو یا نہ ہو،زندہ رہنے کی صلاحیت کا حامل ہو گا تو زندہ رہ جائے گا ورنہ مر جائے گا،خواہ کمپیوٹر ایج کی سپرٹ کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

2۔ میں مستقبل کے بارے میں قیافہ شناسی کا زیادہ قائل نہیں ہوں۔ادب کے سلسلے میں اصل اہمیت ماضی کی ہے یا لمحہ حاضر کی۔ مستقبل کی قیاس آرائی اہل نجوم کا کام ہے۔ بہر حال ماضی میں سب سے مقبول صنف شاعری "غزل" رہی ہے یا داستان۔ داستان تو ایک صدی پہلے باقاعدہ سامعین کے منتخب حلقے میں سنائی جاتی رہی اور داستان گو کی جو

اہمیت تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ پھر ناول، افسانہ، اور اب سفر نامہ مقبول اصناف ادب ہیں لیکن یہ پیش گوئی کرنا خطرے سے خالی نہیں کہ آئندہ کیا ہوگا؟ بعض اصناف اچانک مقبول ہو جاتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی صنف کی مقبولیت اچانک کم ہو جاتی ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی غیر مقبول صنف کا احیاء ہو جاتا ہے اور قارئین کی توجہ دوبارہ ادھر مبذول ہو جاتی ہے۔ اب یہ کہنا کہ مستقبل میں کیا ہوگا ایک قیاس آرائی سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ہاں غزل کی مقبولیت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اصناف آتی جاتی رہیں گی لیکن غزل ہمارے اجتماعی مزاج میں اس قدر رچی بسی ہے کہ مستقبل میں بھی اس کی مقبولیت برقرار رہے گی۔

3۔ الیکٹرانک میڈیا، ہمارے ہاں ریڈیو اور ٹی وی کو قرار دیا جاتا ہے جبکہ ترقی یافتہ ملکوں میں کمپیوٹر کو الیکٹرانک میڈیا کہا جاتا ہے۔ اگر ہم پاکستان میں مروج تعریف کے مطابق الیکٹرانک میڈیا سے ریڈیو اور ٹی وی ہی مراد لیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اب ان دونوں "ذرائع اظہار" کی زیادہ اہمیت ادب کے حوالے سے برقرار نہیں رہی۔ ریڈیو کسی زمانے میں بہترین لکھنے والوں کا مرکز ہوتا تھا۔ پھر زوال شروع ہوا۔ ٹی وی کی آمد نے اس کی طرف پڑھے لکھے لوگوں کی توجہ کم کر دی چنانچہ اس کا کردار خود بخود محدود ہو کر رہ گیا چنانچہ فروغ ادب سے ریڈیو کا رسمی سا تعلق رہ گیا اور بس۔

ٹی وی پر کسی زمانے میں ادبی پروگراموں کو نسبتاً زیادہ وقت دیا جاتا تھا پھر وہ کم سے کم تر ہوتا گیا۔ اس کے بہت سے اسباب ہوں گے لیکن فی الوقت عملاً خاص ادبی پروگرام نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو نصف شب کے قریب جب لوگ سو چکے ہوتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ٹی وی والوں کی کیا مجبوریاں ہیں؟ ممکن ہے وہ کہیں کہ ادبی پروگرام کوئی نہیں دیکھتا۔ یہ بات درست ہو سکتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مقبول پروگراموں کے ساتھ ساتھ میڈیا کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ لوگوں کے ذوق کو بہتر بنانے کے لیے پروگرام پیش کرے تاکہ ادب سے تہذیب سیکھی جائے۔ انسان دوستی اور احترام آدمیت کا درس حاصل کیا جائے۔ تاجر، سائنس دان، ڈاکٹر، انجینئر...... سب کو "ادب" سے انسانیت کا درس لینے کی ضرورت ہے۔ ہماری سوسائٹی میں جو خرابیاں ہیں، ادب کسی حد تک ان کا ازالہ کر سکتا ہے۔ پالیسی سازوں کو اس بات پر غور کرنا چاہئے اور ماضی و حال کے اعلیٰ ادب پر مبنی پروگرام تیار کرنے چاہئیں۔

(اے حمید)

1۔ ادب خلا میں تخلیق نہیں پاتا ہے۔ جب زمانہ بدلتا ہے تو ادب بھی اپنا پیراہن بدلتا ہے یہ ایک فطری سی بات ہے۔ یہ حقیقت ہے اب کمپیوٹر کا دور ہے۔ زندگی میں بڑی تیزی اور تندی آگئی ہے۔ گہما گہمی بڑھ گئی ہے۔ ٹیکنالوجی کی کرامات میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ اب آدمی لمحوں میں اپنی آواز اور تصویر کے ساتھ ہزاروں میل دور ایک دوسرے آدمی سے ہم کلام ہوتا ہے۔ وقت سکڑ گیا ہے اور فاصلہ سمٹ گیا ہے۔ مروجہ تمثیل کے مطابق دنیا ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے۔ کمپیوٹر ایج کے اثرات، اردو ادب پر بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ اس لیے کمپیوٹر کی دنیا اب خواب کی نہیں، حقیقت کی دنیا ہے اور ادب حقیقت کا عکاس ہوتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ادب کی اہمیت اور افادیت کا دارومدار ہی اس بات پر ہے کہ وہ کس حد تک اپنے زمانے کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، ادب میں موضوعات کا تنوع بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ اب تو سائنس فکشن میں بہت لکھا جارہا ہے، نظم اور نثر میں مختلف حوالوں سے بالواسطہ انداز میں کمپیوٹر ایج کے انسانی مسائل پر بات ہو رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں ہمارا اردو ادب کمپیوٹر ایج کے تقاضوں کو حسب توفیق پورا کر رہا ہے۔

2۔ کہانی ہر دور میں ایک مقبول ترین صنف ادب رہی ہے اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ کہانی ہی آنے والے دور کی مقبول ترین صنف ادب ہو گی۔ زمانہ خواہ کتنا ہی ترقی کر جائے۔ انسان کی دلچسپی کہانی سے ختم نہیں ہو سکتی۔ کہانی انسان کے تاریخی شعور کا حصہ ہے۔

3۔ ادب کے فروغ میں، الیکٹرانک میڈیا کا کردار بے پناہ ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ادب کی عوامی سطح پر رسائی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ایک ناول تو ظاہر ہے، بہت کم لوگوں تک پہنچتا ہے۔ لیکن جب اس ناول کی ڈرامائی تشکیل ہوتی ہے تو پھر وہ بہت زیادہ لوگوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اب تو اچھے ادیب خود ڈرامہ نگاری کی طرف آرہے ہیں۔ اس طرح ڈراموں کا معیار بھی بہتر ہو گیا ہے۔ معیاری اور مقبول ناولوں کی ڈرامائی تشکیل کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ادبی پروگراموں کے ذریعے شاعر اور ادیب کی بات آن واحد میں لاکھوں افراد تک پہنچ جاتی ہے۔ اب تو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر مشاعروں کا رواج ہو گیا ہے۔ یوں الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ادیب کا رابطہ عام آدمی کے ساتھ مستحکم ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے آنے والے دنوں میں ادب کے فروغ میں الیکٹرانک میڈیا کا کردار اور بڑھ جائے گا۔

(پروفیسر ڈاکٹر مظفر عباس)

۱۔ میرے نزدیک سائنس بھی کسی نہ کسی تحریری کاوش کے بعد وجود میں آتی ہے اور تحریری کاوش کسی نہ کسی سطح پر تخیل یا تفکر کی مرہون منت ہوتی ہے۔ انسان کی تخلیقی صلاحیتیں ہمیشہ ایک پس منظر میں جلا پاتی ہیں۔ بڑے سائنسدان پہلے بڑے مفکر ہوتے ہیں۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔ ایک سائنسدان پہلے ادیب ہو یا شاعر، مثلاً عمر خیام جو ریاضی دان ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھا شاعر تھا۔ اگر کمپیوٹر ایج کے سوال سے مراد جدید تقاضوں کا ساتھ دینا ہے تو میرا جواب ہاں میں ہے۔ ہر ادیب اپنے دور کے ساتھ چلتا ہے اور اپنے دور کے فکری رویوں کا رد عمل بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دور کیسا ہے۔ ادب ہر دور کے تقاضوں کے ساتھ چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اردو ادب میں ہائیکو کی ترویج اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب خواہ کسی زبان کا بھی ہو وہ عالمی سطح اور وسعت اپنے اندر سمو سکتا ہے۔ خود ہائیکو کی صنف اس بات کا ثبوت ہے کہ جاپان جیسے ترقی یافتہ اور مشینی زندگی رکھنے والے ملک میں ادبی اقدار فروغ پا سکتی ہیں اور اپنے دور کی ضرورتوں کا ساتھ دے سکتی ہیں۔

۲۔ اس کے بارے میں ادبی پنڈت ہی پیشگوئی کر سکتے ہیں۔ میں تو بطور ادب کے ایک طالب علم کے ہی کہہ سکتا ہوں، اردو ادب کی جو صنف اپنے اندر توانائی اور مستقبل کی ضرورتوں کے مطابق چلنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہی مستقبل کی صنف ہوگی لیکن میری ذاتی خواہش ہے کہ کاش غزل اور فکشن کسی نہ کسی صورت میں اگلی صدیوں میں زندہ رہیں۔

۳۔ ذاتی طور پر میں بہت مطمئن ہوں اور میں سمجھتا کہ موجودہ دور میں ادب کی مقبولیت میں اس میڈیا کا کردار بڑا اہم اور قابل اطمینان ہے۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے پاکستانی شعراء اور ادباء کے بارے میں اتنا کچھ یہاں پر رہنے والے نہیں جانتے جتنا امریکہ اور یورپ میں بیٹھے ہوئے ادب دوست پاکستانی الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے جانتے ہیں۔

(سلمیٰ اعوان)

۱۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو یہ واضح ہونا ضروری ہے کہ کمپیوٹر ایج کا ادب کیا ہے؟ اگر اس سے مراد سائنس فکشن یا مار دھاڑ والے جاسوسی ناولوں سے ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ہم اس معاملے میں خاصے خود کفیل ہیں۔ اب اگر یہ کمپیوٹر ایج کا ادب ہے تو پھر بقیہ ادب

کس کھاتے میں جاتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ دقیانوس ہو گیا ہے۔ لوگوں نے اسے پڑھنا چھوڑ دیا ہے؟ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ ادب کا تعلق براہ راست انسان کے جذبات و احساسات، اس کے ارد گرد ہونے والے واقعات، جس ماحول میں، تہذیب میں وہ سانس لیتا ہے، سے ہے۔ اچھے ادب میں معاشرے کے اطوار کی جھلک لازمی امر ہے۔ مغرب سائنس میں ایڈوانس ہونے اور کمپیوٹر ایج میں زمانوں سے داخل ہونے کے باوجود ڈارون تھیوری آف نیچرل سلیکشن پر ابھی بھی بحث کرتا ہے۔ ادب کا کمپیوٹر ایج سے کیا واسطہ؟ شیکسپیئر ہومر، کیٹس، ملٹن ورلڈز ورتھ کو آج بھی ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ بادشاہوں کے قصے کہانیوں کی کتابیں کیا لوگوں نے پڑھنی چھوڑ دی ہیں؟ ہمارے ہاں دیکھئے مرزا غالب کی شاعری اس کے اپنے زمانے سے زیادہ مقبول ہے۔ آئندہ بھی رہے گی۔ میں سمجھتی ہوں ہر وہ تحریر جس میں انسانی نفسیات کے مختلف یا کسی ایک پہلو پر بھی بھرپور انداز میں کسی بھی دور میں بہترین عکاسی کی گئی ہے اسے ہمیشہ پڑھا جائے گا خواہ انسان کمپیوٹر ایج چھوڑ کر Space age میں بھی کیوں نہ داخل ہو جائے۔

۲۔ میرے خیال میں مزاح ہو گا۔ وجہ بڑی واضح ہے۔ زندگی میں مادیت آنے اور زندگی کی دوڑ میں ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑ جانے کی خواہش نے انسانی زندگی کو مسائل میں الجھا دیا ہے۔ ٹینشن ڈیپریشن میں مبتلا لوگ ہلکے ہونا چاہتے ہیں۔ ہنسنا چاہتے ہیں۔

۳۔ بیڑہ غرق کر دیا۔ ادب کا فینٹیسی جو پڑھنے سے ملتی تھی اب فلم میڈیا نے گلیمر کی صورت میں دے دی ہے۔ سفر نامہ اپنی جاذبیت کھوتا جا رہا ہے کہ دنیا گلوبل ویلج کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ بٹن دبائیں دنیا کے پوشیدہ ترین حصے مجسم ہو کر اپنے پورے تہذیبی ورثے کے ساتھ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔ تاہم ایک بات ہے کتاب کی اہمیت بہر حال رہے گی۔

احمد صغیر صدیقی

طرز، اسلوب اور لہجہ

حال ہی میں، مجروح سلطان پوری پر ایک مضمون پڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ لکھا گیا تھا "وہ صاحب طرز بھی تھے اور صاحب اسلوب بھی۔" میں اس جگہ رک گیا اور سوچنے لگا کیا "طرز" اور "اسلوب" دو جداگانہ معنی رکھتے ہیں؟ کیا کسی کا "صاحب طرز" ہونا وہی معنی نہیں دیتا جیسے ہم کہیں کہ وہ "صاحب اسلوب" ہے؟ یہ جملہ صاف بتا رہا تھا کہ مضمون نگار کے ذہن میں یہ دونوں باتیں ایک نہیں ہیں۔ وہ "طرز" کو کوئی اور صفت سمجھتے ہیں اور "اسلوب" کو اور صفت۔

اپنا تجسس رفع کرنے کے لیے میں نے لغت دیکھی۔ وہاں "طرز" کے معانی لکھے تھے: طریقہ، رنگ، ڈھنگ، شکل، وضع، خصلت، خو۔

اسلوب کے معنی تھے: طریقہ، طرز، ڈھنگ، وضع۔

آپ نے دیکھا کہ بہ اعتبار لغت، دونوں الفاظ تقریباً ہم معنی ہیں۔ میں نے غور کرنا شروع کیا تو کچھ ایسی باتیں سامنے آئیں جن کی بنیاد پر کم از کم شاعری کے حوالے سے ان دونوں الفاظ کے استعمال کا جداگانہ مفہوم لینا ہی مناسب محسوس ہوا۔ میں اس سوچ میں تھا کہ ایک اور بات نظر آئی۔ یہ تھی "لہجے" کی بات۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی ذہن میں ابھرا، کیا جب ہم کسی شاعر کی شاعری میں لہجے کی بات کرتے ہیں تو دراصل یہ اس کے طرز کلام یا اسلوب نگارش کی بات نہیں ہوتی؟ میں نے لغت میں "لہجہ" کے معانی دیکھے۔

یہ تھے: الفاظ کی آواز، زبان، طرز کلام، انداز گفتگو، لے، سر۔

آپ دیکھیں، لہجے کے ایک معنی "طرز کلام" اور "انداز گفتگو" کے بھی ہیں۔ یعنی لہجے کو بھی "طرز" اور "اسلوب" کا متبادل قرار دیا جا سکتا ہے۔ لغوی اعتبار سے یہ تینوں الفاظ بڑی حد تک ہم معنی سہی مگر میں سمجھتا ہوں کہ کسی کی شاعری کے حوالے سے جب یہ الفاظ

استعمال ہوں گے تو ہر جگہ ان کے معانی ایک دوسرے سے الگ ہی ہوں گے۔

وضاحت کے طور پر یوں سمجھئے کہ "لہجہ" شیریں بھی ہو سکتا ہے اور تلخ بھی۔ کرخت بھی ہو سکتا ہے، بوجھل بھی۔ دھیما بھی ہو سکتا ہے اور بلند بھی۔ اب "طرز" کی طرف پلٹتے ہیں۔ "طرز" شاعری میں "کلاسیکی" بھی ہو سکتی ہے، نیم کلاسیکی بھی۔ جدید بھی ہو سکتی ہے اور سادی اور پیچیدہ بھی۔ مگر جب "اسلوب" کی بات ہوتی ہے تو یہ ایک اور بات ہوتی ہے۔ یہ طرز اور لہجے دونوں کے آمیزے سے بنتا ہے اور اس کی تشکیل شاعر کے لفظیاتی نظام کے تابع ہوتی ہے۔ منفرد اسلوب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شاعر کے پاس کوئی منفرد یا نیا ذہنی سانچہ ہے۔ وہ جب کسی بھی خیال کو تحریر کا روپ دیتا ہے تو وہ کچھ ایسے الفاظ اور کچھ ایسے انداز بیان کو اپناتا ہے کہ اس کی تحریر اس کی لکھی ہوئی عبارت، دوسروں کی تحریر سے اس قدر جدا ہو جاتی ہے کہ خیال فوراً اسی کی سمت جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ فوراً پہچان میں آجاتی ہے کہ یہ شعر فلاں کا ہوگا۔ یہ عبارت فلاں کی لکھی ہوئی لگتی ہے۔

اس جگہ ایک لطیفہ یاد آرہا ہے جو چند مشہور شعراء کے لہجے، طرز یا اسلوب سے متعلق ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک لطیفہ ہے مگر آپ اس میں دیکھیں گے کہ جن باتوں کا اس جگہ ذکر ہو رہا ہے۔ وہ کتنی عمدگی سے اس میں نمایاں کی گئی ہیں۔ موضوع اس میں "رائتہ" ہے اور یہ بتانے کے لیے کہ اس پر اگر فیضؔ صاحب کوئی مصرع لکھتے تو وہ کس شکل کا ہوتا۔ لطیفہ گو لکھتا ہے۔

فیضؔ صاحب کہتے۔

رائتہ نرم غذا ہے مرے ہمدم مرے دوست

فراقؔ صاحب کہتے۔

ٹپک رہا ہے ان آنکھوں سے رائتہ کم کم

اقبالؔ لکھتے۔

حیف شاہین رائتہ پینے لگا

اختر شیرانی لکھتے۔

رائتہ جو رخ سلمیٰ پہ بکھر جاتا ہے

اگر آپ نے مذکورہ بالا شعراء کا کلام پڑھ رکھا ہے تو آپ کو یہ مصرعے ہر شاعر کے

مخصوص انداز نگارش کی منہ بولتی تصویر محسوس ہوں گے۔ فیضؔ کے لہجے کی مخملی فضا اور دھیما پن اس مصرعے (رائتہ نرم غذا ہے مرے ہمدم مرے دوست) میں مکمل طور سے موجود ہے۔ اس میں لفظیات کا وہی نظام نظر آرہا ہے جو فیضؔ نے بنا رکھا تھا۔ اس میں طرز کا وہ نیم کلاسیکی رخ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے جس سے فیضؔ کی شاعری عبارت ہے۔ کچھ یہی باتیں آپ کو ان مصرعوں میں دکھائی دے سکتی ہیں جو ان شاعروں میں پائی جاتی تھیں جن کے لیے یہ مصرعے تراشے گئے ہیں۔

اس ضمن میں، میرا اپنا خیال یہ ہے کہ کوئی شاعر یا ادیب، اپنا لہجہ، اپنی طرز یا اپنا اسلوب بناتا نہیں، یہ دراصل In-Born ہوتا ہے۔ قدرت کی طرف سے ملا ہوا، بالکل ہمارے حلق سے نکلنے والی آواز کی طرح۔ اسے ہم بناتے نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اسے سنوار سکتے ہیں اور بس۔ کوئی شخص تادیر یا مستقلاً کسی اور شخص کے لہجے کی نقالی نہیں کر سکتا۔ بالآخر وہ اسی طرف پلٹتا ہے جو اس کا اپنا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ کہا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا کہ ہر شاعر، ہر ادیب کا اپنا ایک مخصوص لہجہ، ایک مخصوص طرز اور ایک مخصوص اسلوب ہونا ضروری ہے۔ گویا سبھی "صاحب طرز" یا "صاحب اسلوب" ہوتے ہیں۔ تاہم "صاحب اسلوب" یا "صاحب طرز" صرف اس ادیب یا شاعر کو کہتے ہیں جس کے ہاں لہجے، طرز اور اسلوب کی ایک ایسی "دل نواز انفرادیت" ہوتی ہے جو تحریر میں ڈھل کر پڑھنے والوں کو فوراً احساس دلاتی ہے کہ وہ اس وقت جو تحریر پڑھ رہے ہیں، وہ کس کی ہے۔

یہاں یہ بھی لکھنا چاہوں گا کہ تحریر میں لہجے، طرز اور اسلوب کی باتیں انھیں لوگوں کے لیے کوئی با معنی حیثیت رکھتی ہیں جنھوں نے پہلے سے انھیں کافی پڑھ رکھا ہو۔ یہ معاملہ وہی ہے آوازوں جیسا۔ جب تک کسی کو مختلف افراد کی آوازوں سے آشنائی نہ ہو اس کے لیے کوئی آواز کوئی خاص معنی نہیں رکھتی۔ دراصل تقابلی جائزے کے بغیر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی آواز کس کی ہے اور یہ کسی قسم کی قابل اعتنا انفرادیت کی حامل ہے یا نہیں۔

●●

ڈاکٹر شرف النہار

کنہیا لال کپور بحیثیت طنز و مزاح نگار

کنہیا لال کپور ۲۷؍جون، ۱۹۱۰ء کو قصبہ چک ۴۹۸ ضلع لائیل پور، (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ آباواجداد کا پیشہ دوکانداری تھا لیکن ذات کے اعتبار سے کھتری تھے۔ والد کے دائرہ احباب میں عموماً مسلم بلوچ تھے چنانچہ کنہیا لعل کپور نے بھی مسلم ماحول کا اثر قبول کیا۔ گاؤں کے پرائمری اسکول میں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اپنے استاد محمد عیسیٰ خاں سے اصولِ زندگی اور انسانیت کا پہلا سبق پڑھا۔ بی۔اے تک تمام درجات میں فرسٹ ڈویژن اور سیکنڈ پوزیشن حاصل کی۔ خصوصاً انگریزی اور سنسکرت میں پوری پنجاب یونیورسٹی میں اول رہے اور میڈیلز بھی حاصل کیے۔ ۱۹۳۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم. اے سیکنڈ کلاس کیا، جہاں اپنے استاد احمد شاہ بخاری (پطرس) کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور آخر کار ان ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے طنز و مزاح کی روایت کو عروج بخشا۔

کنہیا لعل کپور کی ادبی زندگی کا آغاز ہندو ہاسٹل سے ہوا جہاں وہ کرشن چندر کے پڑوسی تھے۔ کرشن چندر نے ان کے اندازِ گفتگو اور بحث و مباحثہ کی عادت سے متاثر ہو کر مشورہ دیا کہ ''تم فطرتاً طنز نگار ہو، اگر یہی تمام فضول نکتہ چینیاں احاطہ تحریر میں لے آؤ تو تم اچھے طنز نگار کہلاؤ گے۔'' اس تحریک نے کنہیا لعل کپور کو طنز نگار بنا دیا۔ لطف یہ کہ طنز نگاری کی ابتدائی تحریر کا نشانہ بھی کرشن چندر کا مشہور افسانہ ''یرقان'' بنا اور یرقان کی پیروڈی ''خفقان'' کی شکل میں منظرِ عام پر آئی جس کو اس کے حلقۂ احباب اور خود کرشن چندر نے بہت پسند کیا مگر افسوس کسی نامعلوم وجہ پر اس کو تلف کرنا پڑا تھا۔

حصولِ تعلیم کے بعد کنہیا لعل کپور پہلے ڈی۔اے۔وی کالج لاہور میں انگریزی مضمون پڑھانے پر مقرر ہوئے لیکن تقسیم ہند کے بعد انھوں نے لاہور جیسے بارونق شہر کو خیرباد کہہ کر موگا، ضلع فیروزپور میں استاد کا ہی کارِ منصبی ایسا سنبھالا کہ تازندگی وہیں کے ہو

پتہ : نیو سرسید نگر، علی گڑھ

کر رہ گئے۔ اگرچہ لاہور کی رنگینیاں، مجلسی ہنگامے، ادبی محفلیں، وہاں کی حسین یادیں زندگی بھر ان کا پیچھا کرتی رہیں، کیونکہ اس وقت موگا ایک نیم ریگستانی قصبہ تھا جہاں ریت کے انبار کے سوا کوئی دوسری چیز قابل دید نہ تھی۔ ایسی جگہ میں ادبی ماحول کی خواہش کرنا عبث تھا، اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ موگا کی مستقل سکونت نے کنہیا لعل کپور کی فنی صلاحیتوں کو اس طرح پروان نہیں چڑھنے دیا جس طرح وہ کسی بڑے شہر میں پروان پڑھ سکتی تھیں۔ چنانچہ اسی سبب وہ تھیکرے کے اس قول کے قائل نظر آتے ہیں کہ "گہری قنوطیت سے ہی گہرا طنز پیدا ہوتا ہے۔" لہٰذا اپنے دور کے ابتر حالات اور ماحول کے غائر مطالعہ نے کنہیا لعل کپور کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ "بھارت کو مزاح کی نہیں طنز کی ضرورت ہے۔"

کنہیا لعل کپور نے اس زمانے میں شہرت حاصل کی جب ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ نوجوان ادیب اپنی تخلیقات کے ذریعے سامراجیت سے نفرت، آزادی کی خواہش اور ہر قسم کے ظلم واستحصال کے خلاف انقلاب پیدا کر رہے تھے اور ادب کے ذریعے وہ بیک وقت اصلاح اور انقلاب کا بڑا ہی پر اثر پیغام دے رہے تھے۔ چنانچہ کنہیا لعل کپور کی فنی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے یہی کارنامہ اپنی طنز نگاری کے ذریعہ انجام دیا اور سماجی ناہمواری، اخلاقی گراوٹ کے ساتھ ساتھ ایسے افراد اور جماعتوں کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا جو اپنے اغراض ومقاصد کے لیے دبے کچلے طبقے کا استحصال کرنے میں ملوث تھیں۔

کنہیا لعل کپور کی ادبی صلاحیتوں کا اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا پہلا ہی مضمون ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا اور یہ مضمون تھا "غالب جدید شعراء کی ایک مجلس میں۔" ۱۹۴۲ء میں شائع ہونے والے اس مضمون کو حلقہ ارباب ذوق میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بہت کم ادیب ایسے ہوتے ہیں جن کی پہلی ہی تحریر ان کی شناخت بن جاتی ہے۔ اس معاملے میں کنہیا لعل کپور بڑے خوش قسمت ثابت ہوئے۔

ادب اس وقت عظیم ہوتا ہے جب وہ بصیرت بھی دے اور اعلا مقصد کا حامل بھی ہو۔ کنہیا لعل کپور کے فن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں بظاہر تفریح معلوم ہوتا ہے مگر اس میں ایک گہری معنویت پوشیدہ ہوتی ہے۔ غالب کو اردو کا بعض اوقات سب سے بڑا شاعر اس لیے بھی سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ خود اپنا مضحکہ اڑانے اور اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے، خود اپنا محاسبہ کرنے اور اپنی کمزوریوں پر ہنسنے کی صلاحیت بہت ہی اعلا دماغ کے لوگوں کو حاصل ہوتی ہے یہی ذہنی عظمت فن میں بھی

گہری عظمت پیدا کرتی ہے، کنہیا لعل کپور میں یہ صلاحیت موجود ہے، وہ بھی غالب کی طرح اپنے آپ کو طنز و مزاح کا نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ غالب ایک طرف بڑے انانیت پرست تھے تو دوسری طرف یہ بھی کہتے تھے کہ ان کی تخلیقات میں بڑے ادیبوں کی سی شان نہیں۔ کنہیا لعل کپور "بنانے کا فن" میں یہی انداز اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔

"ادیب بننے کی دھن جو سمائی تھی، عالم خلوت میں ہوائی قلعے بنایا کرتے تھے۔ ایک دن ہمارا نام شیکسپیئر، کالی داس، غالب اور پریم چند کے ساتھ لیا جائے گا۔ لوگ ہمارے مضامین اپنے سینے سے لگائے پھریں گے۔ رہتی دنیا تک ہمارا نام رہے گا وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ ہم نے اللہ کا نام لے کر ادیب بننے کا ارادہ کر لیا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ طنز و مزاح کی صنف کسمپرسی کی حالت میں ہے، ہم نے طنز نگار بننے کا فیصلہ کیا۔"

کنہیا لعل کپور ادب کو افادی ماننے کے باوجود اسے سیاست کے دائرے سے الگ رکھنے کے حق میں تھے۔ اس وقت عام طور سے یہ سمجھا جا رہا تھا کہ تخلیق کو ایک نظریاتی کاٹ بخشنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ادیب ایک سیاسی نظریہ کا حامل ہو۔ بصورت دیگر اس کی تحریروں میں ایک نظریاتی کھوکھلا پن پیدا ہو جائے گا۔ کنہیا لعل کپور کا ادبی کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس ادبی سیاسی رویہ کی نفی کی مگر اپنی تحریروں کو گہرائی بخشنے کی خاطر انھوں نے ایک فلسفیانہ انداز اختیار کیا۔ تخلیق کا کمال یہ بھی ہوتا ہے کہ روز مرہ کی معمولی چیزیں بھی ادیب کا خام مواد ہونے کے باوجود ایک اچھوتا سا انداز اختیار کر لیں۔ یہی وہ انداز ہوتا ہے جو ادبی مواد کو بیک وقت عمومیت بھی بخشتا ہے اور خصوصیت بھی عطا کر دیتا ہے۔ کنہیا لعل کپور کے فن میں ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ روز مرہ کی باتوں اور بالکل سامنے کی چیزوں کو اسی طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری ان کے بارے میں دیر تک سوچتے رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے جراحی کے عمل سے موسوم کیا ہے، اسی کے ساتھ وہ کنہیا لعل کپور کی فنی خصوصیت کو ایک فطری نفاست کا حامل بھی قرار دیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ لونجائنس نے شاعری کی سب سے بڑی صفت آدمی کی ہوش و حواس اڑا دینے والی صفت کو قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو کنہیا لعل کپور کی تخلیقات میں یہ صفت بھی نظر آتی ہے۔ انھیں کے لفظوں میں:

"کپور کا طنز ایک سرجن کے عمل جراحی کی طرح ہے۔ وہ ادب اور زندگی کی ناہمواریوں اور غیر ضروری جذباتیت کے مظاہر کو دیکھتے ہیں اور اپنے

نشتر سے ان ناسوروں کو آہستگی سے چھیڑ دیتے ہیں۔ اس طور سے کہ فاسد مادہ بہہ جاتا ہے، اور زخم مندمل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ان کے عمل جراحی میں ایک فطری نفاست اور تیزی ہے اور وہ عموماً مریض کو اس درجہ مبہوت کرنے کے بعد اپنے عملِ جراحی کا آغاز کرتے ہیں کہ مریض کو نشتر کی جراحت تک محسوس نہیں ہوتی۔"

اردو ادب میں ہجویات، طنز و مزاح، قدیمی اور نمایاں مثالوں کے روپ میں موجود ہیں مگر طنز و مزاح کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ کسی معاشرے کے افراد اپنے دور کی ان خامیوں کی طرف متوجہ ہوں جو ان کی صلاحیتوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہوں۔ طنز و مزاح نگار ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے قاری کو کوئی درس دینے کی بجائے اسے اس طرح اصلاح کی طرف راغب کرتا ہے کہ قاری کو یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ فنکار اپنی تخلیق کے ذریعہ کوئی غرض پوری کر رہا ہے۔ اس طرح طنز و مزاح کے اعلا نمونے صرف کمزوریوں، خامیوں اور برائیوں کو نمایاں کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ احساس کے تاروں کو چھیڑتے ہوئے قاری کے ذہن میں غور و فکر کی ایسی قندیلیں روشن کرتے ہیں جو بیک وقت روشنی بھی بخشتی ہیں اور رجھاتی بھی ہیں۔ کنہیا لعل کپور میں یہ فنی صلاحیت نظر آتی ہے کہ وہ اپنی بات بڑی خوبی کے ساتھ قاری کے ذہن میں منتقل کر سکتے ہیں۔ ترسیل کے لیے کنہیا لعل کپور کبھی موضوع، کبھی کسی واقعہ اور کبھی کسی کردار کے ذریعہ ایسی فضا تخلیق کرتے ہیں کہ قاری کا ذہن اسی نکتہ پر مرکوز ہو جاتا ہے جس کی تفصیل مصنف کا مقصد ہوتی ہے۔

طنز و مزاح دراصل ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں، وہی سکہ ٹکسالی ہوتا ہے جس کے دونوں رخ ایک دوسرے سے ہم آہنگی رکھتے ہوں۔ کنہیا لعل کپور میں یہ فنی بصیرت موجود تھی کہ صرف طنز ان کے فن کو یک رخہ کر دے گا۔ چنانچہ وہ اپنی تخلیقات میں مزاح کی چاشنی کی بھی بڑی خوبی کے ساتھ آمیزش کرتے ہیں یہ چاشنی ان کی جس تخلیق میں موجود ہو وہ ایک ایسی لذت بخشتی ہے جسے قاری دیر تک فراموش نہیں کر پاتا۔ "لالہ صحرائی" کنہیا لعل کپور کی اس فنی خصوصیت کی اچھی مثال ہے۔

"ڈبے میں سوار ہونا روایتی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ مگر ڈبے میں سوار ہونے کے بعد پتہ چلا کہ تقریباً نصف ڈبہ مجھ پر سوار ہے۔ دو بزرگ گود میں بیٹھے ہوئے تھے، ایک لونڈا میرے کندھے پر اور ایک حضرت اس سوچ میں تھے کہ میرے سر پر ٹرنک رکھ کر اسی پر

بیٹھ جائیں۔"

کنہیا لعل کپور نے ہندوستان کے سیاست دانوں، عوام کی رہنمائی کے دعویداروں اور رفاہ عامہ کے ٹھیکیداروں کی ذہنیت، ان کے جارحانہ رویہ اور عوام دشمن افعال کو اپنی مختلف تخلیقات کا موضوع بنایا۔ ان موضوعات پر کنہیا لعل کپور کے کچھ مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے" "ایک عام ہندوستانی کی ذہنیت" "آزادی کی قسم" "نیا شکنجہ" "چوپٹ راجہ" "دیسی فرنگی کا دربار" وغیرہ وغیرہ۔ ان کے اندازِ بیان کی خصوصیت یہ ہے کہ یکساں موضوعات پر لکھے گئے ان کے مضامین میں تکرار اور یکسانیت نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کنہیا لعل کپور نے اپنی ان تخلیقات میں زبان کے حسن وبیان کی دلکشی کے جوہر دکھائے ہیں۔ بظاہر ان تخلیقات کے موضوعات کچھ غیر ادبی سے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان مضامین بھی طنز و مزاح کے اعلا جوہر موجود ہیں۔ غلام احمد فرقت کاکوروی خود اپنے زمانے کے ایک مشہور مزاح نگار تھے۔ لکھنؤ کے قریب واقع مشہور موضع کاکوری ان کا وطن تھا۔ یوں اردو زبان کی ساری لطافتوں اور نزاکتوں سے وہ بخوبی واقف تھے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ان جیسا مزاح نگار اور زباں داں بھی کنہیا لعل کپور کی تخلیقی صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کرتا نظر آتا ہے۔ اردو ادب ہی نہیں انگریزی اور اس کے واسطے سے یورپ کی دوسری زبانوں میں طنز و مزاح پر فرقت کاکوروی کی اچھی نظر تھی۔ انھوں نے کنہیا لعل کپور کے فن کا اردو کے کچھ ممتاز طنز نگاروں سے موازنہ کرتے ہوئے انھیں فرانسیسی ادیب والٹیر کے مقابل ٹھہرایا ہے۔ فرقت کاکوروی کے نقطۂ نظر کے مطابق زندہ دلی، شگفتگی، مشاہدے اور فکر کی وسعت کنہیا لعل کپور کے فن کی نمایاں خوبیاں ہیں۔

طنز و مزاح بظاہر ایک بے رحم کام انجام دیتا ہے۔ وہ زخموں کو کریدتا ہے، وہ زخموں کو کریدتا ہے، بدہیئتی کو خواہ وہ ذہنی ہو یا اخلاقی بے نقاب کرتا ہے اور طنز و مزاح نگار کا قلم ایک طرح سے کھال ادھیڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن اعلا ادب کی سب سے بڑی خوبی انسانی ہمدردی ہوتی ہے۔ کنہیا لعل کپور کی تخلیقات میں طنز و مزاح کی ساری خصوصیتوں کے باوجود عام انسانی ہمدردی کا جذبہ موجزن ہے۔ ان کی ہمدردیاں کسی خاص طبقے سے وابستہ نہیں، وہ ہر طبقہ اور ہر فرد کے تئیں ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اس لیے انھیں بڑی آسانی کے ساتھ انسان دوست قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ انسان دوستی ایک ایسی قدر ہے جس کے سبب ان کی تخلیقات کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک امتیازی مقام حاصل رہے گا۔ ●●

ڈاکٹر جمیلہ عرشی

"ماہیا اور فلمی نغمہ نگار"

ماہیا اردو میں کوئی نوزائیدہ اور نووارد صنف سخن نہیں ہے۔ بلاشبہ اس کے ڈانڈے پنجابی زبان سے جڑے ہوئے ہیں اور یہ خطۂ پنجاب کی عوامی شاعری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ پانچ دریاؤں کے پانی نے اسے پروان چڑھایا ہے اور پنجابی فضاؤں کا رس اس میں گھلا ملا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی لوک صنف سخن کی کوئی مکتوبی شکل نہیں ہوتی اور نہ ہی لوک صنف کے خالق منصۂ شہود پر آتے ہیں۔ گیت اور دوہے کی طرح ماہیا کی روایت بھی بہت پرانی ہے۔

حافظ پروفیسر محمود خان شیرانی کی "پنجاب میں اُردو" کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اردو اور پنجابی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس طرح ماہیا کو نوزائیدہ صنف سخن کہنا سراسر غلط ہے۔ لوک گیتوں کی طرح اس کی تاریخ مرتب کرنا بھی ناممکنات میں سے ہے۔ اُردو میں بھی اس کی جڑیں کافی گہری ہیں۔

چراغ حسن حسرت کے ماہیے موجودہ ماہیا کے نبض شناسوں کی نظر میں کھرے نہ اتریں، مگر انھوں نے ایک غیر مکتوبی صنف سخن کو مکتوبی شکل عطا کر دی تھی۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ کسی بھی لوک صنف کی دُھنیں مخصوص ہوتی ہیں۔ اس کی ہیئت اور فارم مستقل نہیں ہوتی۔ آج ہمت رائے شرما کو ماہیا کے بنیاد گزاروں میں شمار کیا جا رہا ہے اور حیدر قریشی ان دنوں اس کے سرخیل بنے ہوئے ہیں۔ اول الذکر کے سر ہم فلم خاموشی کے ذریعہ ماہیے کے متعارف کرانے کا سہرا باندھ سکتے ہیں اور موخر الذکر کو اس کی بازیافت پر آحسنت و مرحبا کہہ سکتے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فلموں کے توسط سے ماہیوں نے جلا پائی ہے، اور فلمی

پتہ : شعبۂ اردو و فارسی، راجستھان یونیورسٹی، جے پور
1/109.J.P.colony Sector No.1, Amanishah Road,shastri Nagar Jaipur-302016

نغمہ نگاروں نے اپنے گیتوں کی شکل میں انھیں قبولیت کی سند دلوائی ہے۔ ماہیا بنیادی طور پر گائے جانے والی لوک شاعری ہے۔ سر زمین پنجاب سے تعلق رکھنے والے نغمہ نگاروں کے توسط سے ماہیا سطح صحرا سے پردہ سیمیں پر منتقل ہو کر جاندار ہو گیا۔ یہاں ان چند فلمی گیت کاروں کا ذکر بے محل نہ ہوگا جنھوں نے بالواسطہ گیت نما ماہیے یا ماہیے نما گیت لکھ کر اس صنف کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

ہمت رائے شرما ہمت رائے شرما فلم اور ادب کی معروف شخصیت ہیں۔ موصوف نے ۱۹۳۶ء میں اردو ماہیے لکھے۔ فلم خاموشی میں پنجابی ماہیا اوزان کے مطابق اپنے ماہیوں کو پیش کیا۔ فلمی گیت کی حیثیت سے یہ ماہیے کافی مقبول ہوئے۔

ہمت رائے شرما ۲۳ر نومبر ۱۹۱۹ء کو نارووالی ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ علمی خاندان کے ممتاز فرد ہیں۔ اردو فارسی، ہندی، انگریزی، پنجابی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی، زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ افسانہ نگار، طنز و مزاح نگار کے علاوہ فلم آرٹ ڈائریکٹر، نغمہ نگار اسکرین پلے رائٹر، پبلسٹی ڈزائنر کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی۔ فلموں میں اداکاری بھی کر چکے ہیں۔ فلم خاموشی میں ماہیا نگاری کا کارنامہ نہ صرف ۱۲ سال کی عمر میں انجام دے دیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں انھیں ماہیا گیت کے وسیلے سے پسند کیا گیا۔

اُردو ماہیا کے بانی اور فلم خاموشی کے نغمہ نگار ہمت رائے شرما کے چند اردو ماہیے پیش خدمت ہیں یہ اردو ماہیے ۱۹۳۶ء میں لکھے گئے تھے اور ان کی ریکارڈنگ ۱۹۳۷ء۔ ۱۹۳۸ء میں ہوئی اور ان ماہیوں کو فلم خاموشی میں فلمایا گیا اور یہ فلم ۱۹۳۹ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔

اک بار تو مل ساجن
آکر دیکھ ذرا
ٹوٹا ہوا دل ساجن

کچھ کہہ کر پائیں ہم
دور کہیں جا کر
اک دنیا بسائیں

سہمی ہوئی آہوں نے
سب کچھ کہہ ڈالا
خاموش نگاہوں نے

یہ طرز بیاں سمجھو
کیف میں ڈوبی ہوئی
آنکھوں کی زباں سمجھو

قتیل شفائی قتیل شفائی ہری پور ہزارہ (سرحد) پاکستان میں پیدا ہوئے جہاں دیگر عوامی شعری اصناف کے ساتھ ساتھ ماہیے بھی مقبول خاص و عام ہیں۔ پنجاب اور اس کے قرب و جوار کی سب سے مقبول صنف ماہیا ہی ہے۔ قتیل صاحب نے ابتدائی دور میں کثرت سے ماہیے لکھے لیکن وہ سب ضائع ہوگئے۔ ہری پور ا ہزارہ کی زبان ہند کو ہے جو نہ تو پشتو ہے اور نہ پنجابی ہے لیکن ہند کو کا مزاج پنجابی سے ملتا جلتا ہے لیکن قتیل صاحب نے ہند کو کے بجائے اردو میں لکھا۔ قتیل شفائی کثیر الجہات شاعر ہیں، اور فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے عالمی سطح پر اپنی علاحدہ شناخت بنا چکے ہیں۔

قتیل شفائی نے پاکستانی فلم حسرت کے لیے ۱۹۵۳۔۱۹۵۲ء میں اردو ماہیے لکھے۔ فلم حسرت ۱۹۵۳ء میں ریلیز ہوئی۔ فلم حسرت کے ماہیے اس قدر مقبول ہوئے کہ آج بھی پرانے لوگ گنگناتے رہتے ہیں۔

ہمت رائے شرما نے ۱۹۳۶ء میں اردو ماہیے لکھے اور تقریباً ۱۷۔۱۸ سال بعد قتیل شفائی نے اس غنائیہ کو فلم حسرت کے لیے انتخاب کیا۔ قتیل شفائی پاکستان کے اولین اردو ماہیا نگار ہیں۔ فلم حسرت (پاکستان) کے چند اردو ماہیے ملاحظہ فرمائیں!

باغوں میں بہار آئی
مہکی ہوئی رُت میں
دل لیتا ہے انگڑائی

بھیگا ہوا موسم ہے
ساتھ میرے تو ہے
اب کس کا مجھے غم ہے

ارمانوں کا میلہ ہے
ساتھ مجھے لے لے
تیرا حسن اکیلا ہے

ہم ساتھ نبھائیں گے
آندھیاں چلتی رہیں
ہم شمع جلائیں گے

قمرؔ جلال آبادی قمر صاحب کا تعلق بھی سر زمین پنجاب سے ہے۔ایک لمبے عرصے سے ممبئی فلم انڈسٹری سے وابستہ ہیں۔ آپ فلمی نغمہ نگاری میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔

قمرؔ جلال آبادی ایک کہنہ مشق اور زود گو شاعر ہیں لہٰذا آپ نے اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کے لیے مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کی ۱۹۰۶ء میں آپ نے اردو ماہیے بھی لکھے جنھیں فلم پھاگن میں فلمایا گیا۔ یہ فلم ۱۹۵۷ء میں ریلیز ہوئی، اوران ماہیوں کو مرحوم محمد رفیع اور آشا بھونسلے نے گایا تھا۔ فلم پھاگن کے اردو ماہیوں کی مقبولیت آج بھی برقرار ہے۔

فلم پھاگن کے اردو ماہیے ملاحظہ فرمائیں۔

تم روٹھ کے مت جانا
مجھ سے کیا شکوہ
دیوانہ ہے دیوانہ

میں لاکھ ہوں بیگانہ
پھر یہ تڑپ کیسی
اتنا تو بتا جانا

نغمہ نگار ہمت رائے شرما کے بعد ہندوستانی فلمی نغمہ نگار قمرؔ جلال آبادی نے ۱۹۔۲۰ سال بعد فلم پھاگن کے لیے اردو ماہیے لکھے۔ہندوستانی نغمہ نگار کی حیثیت سے قمر صاحب دوسرے فلمی ماہیا نگار ہیں اور انڈو پاک میں قمرؔ جلال آبادی کی حیثیت تیسرے اردو ماہیا نگار کی ہے۔

ساحر لدھیانوی ساحر لدھیانوی کا تعلق بھی سرزمین پنجاب سے تھا۔ ایک عرصہ آزادی اور تقسیم وطن کے بعد وہ چند دن دہلی میں رہے بعد ازاں ممبئی آگئے اور ہندوستانی فلموں کے لیے کامیاب نغمے لکھتے رہے۔ فلم "نیا دور" کے لیے آپ نے اردو ماہیے لکھے جنھیں مرحوم محمد رفیع صاحب نے گایا تھا۔ ساحر صاحب کے ماہیے بہت مقبول ہوئے ہیں۔ فلم نیا دور کا ایک ماہیا یہ ہے۔

دل لے کے دغا دیں گے

یار ہیں مطلب کے

یہ دیں گے تو کیا دیں گے

یہ چاروں اردو ماہیا نگار فلمی شعرا بذاتِ خود قد آور شخصیت کے حامل ہیں اور انھوں نے دنیائے شعری میں قابل قدر اضافے کیے ہیں۔ ان کی ادبی حیثیت بے چوں و چرا، مسلمہ و مصدقہ ہے۔ مگر اس لحاظ سے بھی ان کی عظمت و وقعت مزید بلند و ارفع ہو جاتی ہے کہ انھوں نے ماہیوں کو فلمی نغموں کا روپ دے کر عام لوگوں سے روشناس کر لیا اور ماہیوں کی نغمگی شیرینی اور حلاوت و لطافت کو گھر گھر پہنچایا۔ انھوں نے ع "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" سے بے نیاز رہ کر یہ خدمت انجام دی تھی مگر یہ ماہیا نگاری کی شاہراہ پر پیش رووں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے نام ماہیا نگاری کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ جلی حروف میں لکھے جائیں گے۔

مذکورہ چاروں فلمی نگاروں کے ماہیوں کی مقبولیت کے بعد دوسرے فلمی نغمہ نگاروں نے بھی اس غنائیہ صنف سخن پر توجہ دی جس کے پیشِ نظر اُف یہ محبت، کانٹا اور رپتی پتنی اور وہ فلموں میں بھی اردو ماہیوں کو فلمایا گیا ہے۔

فلم "اُف یہ محبت" کے لیے نغمہ نگار وپن ہانڈا نے اردو ماہیے لکھے۔ مثال کے طور پر ان کا ایک فلمی اردو ماہیا پیش کر رہی ہوں۔

مری چھت پر آیا کرو

ٹیچر بن کر تم

مجھے پیار سکھایا کرو

فلمی نغمہ نگار نذیر قیصر نے فلم "کانٹا" کے لیے اردو ماہیے لکھے۔ بطور مثال ایک ماہیا ملاحظہ فرمائیں۔

آنچل میں ستارے ہیں
جب سے تمہیں دیکھا
اس دن سے تمہارے ہیں

فلم ''بی پنٹی اور وہ'' کا بھی ایک فلم اردو، ماہیا پیش خدمت ہے:۔

لڑکی سائیکل والی
دے گئی رستے میں
اک پیار بھری گالی

۱۹۳۶ء سے اب تک سات فلموں میں اردو ماہیوں کا استقبال ہو چکا ہے جن کی مقبولیت آج بھی برقرار ہے، اور ساتوں فلمی نغمہ نگاروں نے ماہیے کے درمیانی مصرع میں ایک سبب کم یا آدھا رکن کم رکھا ہے تاکہ گائے جانے والی شاعری اردو ماہیا کا حسن اور آہنگ مجروح نہ ہو۔ ماہیا کے یہ اوزان پنجابی لوک ماہیا کے اوزان کے عین مطابق ہیں۔

فلمی نغمہ نگاروں کے علاوہ اردو شعراکی بڑی تعداد ان دنوں ماہیے لکھ رہی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق برصغیر اور دیگر ممالک میں دو سو سے زائد اردو ماہیا نگار ہیں۔

●●

ردا نبی بٹ

اردو ادب میں عورت کا کردار

عورت ہمیشہ سے ہر زبان و ادب میں لکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ موضوع رہی ہے۔ کوئی بھی قصہ اس کی غیر موجودگی کے باعث کامیاب نہیں ہوتا۔ آدم سے لے کر ابلیس تک، روز اول سے لے کر آج تک اور قیامت تک ہر قصے میں عورت کا ذکر ملے گا اور یہی نام تصویر کائنات میں رنگ بھرتا رہے گا۔

عورت کے وجود کی اہمیت اپنی جگہ خود بھی ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ پیدائش، بچپن، جوانی، شادی، تعلیم سے لے کر حقوق کے مسائل تک ہر دور میں عورت کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مردوں کے معاشرے میں مردوں کی حاکمیت اور جاگیردارانہ ماحول اور متشدد مذہبی رجحانات نے عورت کو اس کے جائز حقوق سے بھی محروم رکھا تھا۔ سماجی سطح پر عورت کو صرف افزائش نسل اور مردوں کی تسکین کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔

آہستہ آہستہ جب تعلیم عام ہوئی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی ماحول میں تبدیلی آئی، نیا شعور بیدار ہوا تو عورتوں کے بارے میں لوگوں کی رائے میں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد مشنری اداروں نے عورتوں کی تعلیم پر بھرپور توجہ دی جس کی وجہ سے برصغیر میں عورتوں کی بیداری کی لہر کا آغاز ہوا۔ متعدد ہندو اور مسلم اداروں نے بھی عورتوں کی تعلیم پر زور دینا شروع کیا۔ متعدد اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں جنہوں نے عورتوں کو درپیش مسائل کے حل کے بارے میں بہت کام کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر میں سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ اسی دور میں برصغیر سیاسی ہیجان کی لپیٹ میں آیا۔ اس سیاسی دور میں عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ میدان عمل میں کود پڑیں، اگرچہ ان کی تعداد بہت کم تھی مگر اس کے باوجود انھوں نے آنے والی خواتین کے لیے ایک راستہ کھول دیا۔ ادبی سطح پر بہت سی خواتین ابتدائی دور میں جب

مضامین افسانے یا کہانیاں لکھتی تھیں تو اپنا نام تک تبدیل کر لیتی تھیں مگر آہستہ آہستہ یہ حجاب ختم ہوا اور اصلاحی ادب کے حوالے سے متعدد خواتین نے بہت سے خوبصورت اور اصلاحی ناول لکھے۔ ان میں محمدی بیگم، ایڈیٹر "تہذیب نسواں" کے تین ناول "صفیہ بیگم" "آج کل" اور "شریف بیٹی" نادر جہاں بیگم کا "فسانہ طاہرہ" مسز عباس طیب جی کا "شوکت آرا" رشید النساء کا "اصلاح النساء" جیسے افسانوں اور ناولوں میں خواتین اور ان کو درپیش نئے معاشرتی مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا تھا۔ اسی دور میں ایک نہایت بلند آہنگ والا نام نذر سجاد صاحبہ کا تھا جنہوں نے پہلی مرتبہ زور دار آواز میں مذہب اور سماج کے نام نہاد ٹھیکیداروں کے خلاف اپنا قلم حرکت میں لایا اور بہت لکھا۔ انھوں نے چھ ناول لکھے جو اس دور کی خواتین میں بے حد مقبول ہوئے۔ ان اعلیٰ اور متوسط طبقے کی خواتین کو درپیش تہذیبی معاشرتی افکار و اقدار اور مسائل پر خوبصورت بحث کی گئی ہے۔ ان ناولوں میں "ثریا" "جاں باز" "آہ مظلوماں" اور "نجمہ" بہت مشہور ہوئے۔

تحریک آزادی سے قبل ان خواتین میں سے اکثریت لکھنے والوں کی تحریروں پر ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری کے اصلاحی رنگ کا بڑا اثر تھا تاہم انھوں نے خواتین میں خود شناسی اور خود اعتمادی پیدا کی اور ان کے ذہنی اور جذباتی رویوں کی بہت خوبصورتی سے نشاندہی بھی کی۔ یہ دور اردو ادب میں خواتین کی آمد کا ابتدائی دور تھا۔ ایک ڈری اور سہمی ہوئی عورت کی آمد کا، جو اس سے قبل معاشرے میں پیدائش سے لے کر موت تک قدم قدم پر مرد کے سہارے کی محتاج رہی تھی۔ اسے چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے بھی اس جاگیردارانہ نظام میں زندگی بسر کرنی تھی جس میں اس کی رضامندی یا مرضی کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور نہ ہی اس سلسلہ میں اس کی رائے لی جاتی تھی۔ اس کی اپنی کوئی پسند یا ناپسند نہیں تھی۔ وہ بچپن میں باپ کی انگلی تھامے ڈری ہوئی، دبکی ہوئی باہر نکلتی، جوانی میں بھائیوں کی تند و تیز نظریں اسے سہما دیتیں، شادی ہوئی تو شوہر کا دامن تھام لیتی اور بے زبان جانور کی طرح اس کے اشاروں پر چلتی۔

الغرض اس طرح کے ماحول میں، جب اس بے زبان کی کوئی زبان نہیں تھی، تعلیم کی روشنی میں ان چند ایک باحوصلہ اور پرعزم خواتین نے قلم کا سہارا لے کر عورتوں کی حالت سدھارنے کے لیے اپنا پہلا قدم اٹھایا اور زمانہ کی طعن و تشنیع سہہ کر بھی ہتھیار نہ ڈالا اور بالآخر پھر ان کی سنی گئی بقول شاعر "ہم سفر ملتے گئے کارواں بنتا گیا۔"

ان باہمت خواتین کی محنت رنگ لائی اور اردو ادب میں جب ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی تو پھر ایسی خواتین سامنے آئیں جن کا نام اردو ادب کے ماتھے پر افشاں بن کر چمکا اور ان کی تحریروں کا تذکرہ کیے بنا کوئی ادبی سرگزشت مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ ان کا قلم پوری طاقت سے خواتین کے حقوق کے لیے تلوار بن کر بے نیام ہوا اور آج اردو ادب میں خواتین کی جو چہل پہل نظر آتی ہے سب انھیں کی قربانیوں کا ثمر ہے۔

آزادی سے قبل کے اس دور میں ترقی پسند تحریک کا آغاز خواتین کے حق میں نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ تعلیم یافتہ خواتین کی ایک بڑی تعداد نے اس تحریک کے زیر اثر قلم کی زبان سے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی اور میدان عمل میں آکر کام کیا۔ یہ ایک ہیجان خیز دور تھا۔ رات کے اندھیرے سے نکل کر ایک دم سورج کی روشنی میں آنے سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، چنانچہ بہت سی خواتین نے بہت سے حدود و قیود کو بھی پھلانگنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکیں۔ مگر اکثر خواتین لکھاریوں نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنے حقوق کے لیے کام کیا اور کامیاب رہیں۔ جدید تعلیم سے آراستہ پڑھی لکھی خواتین نے جب قلم سنبھالا تو معاشرہ کی اصلاح کے ساتھ ساتھ انھوں نے خواتین کے جذباتی، معاشرتی مسائل پر بھی لکھا اور عورت کے کردار کو ایک نیا ولولہ انگیز کردار بنا دیا۔

رضیہ سجاد ترقی پسند تحریک کے ممتاز رہنما سجاد ظہیر کی اہلیہ تھی اور ممتاز ماہر تعلیم رضا حسین کی بیٹی۔ ان کے ناولوں میں عورتوں کی آزادی پر نہایت زور ملتا ہے۔ ان کے ناولوں میں مردوں اور عورتوں کی مخلوط محفلیں، مخلوط تعلیم، بے تکلف ماحول میں مرد و زن کا میل ملاپ، جدید اطوار و انداز زندگی، علوم و فنون، جمالیاتی عنصر، مذہب و سیاست پر بحث ان کے ہاں ملتا ہے۔ رضیہ سجاد پہلی خاتون ناول نگار ہیں جن کی تحریروں میں اشتراکیت یعنی سوشلزم کے نظریات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں ایک نئے سماج کی تشکیل کا بھرپور جذبہ ملتا ہے۔ متحدہ ہندوستان کی آزادی اور اس دور میں پیش آنے والے سیاسی سماجی واقعات پر تنقید، تبصرہ اور بحث بھی ان کے ناولوں کا خاصہ ہے۔ ان کے ناول میں عورت ایک نئی قوت، عزم اور حوصلے کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ ان کے ناولوں میں "اللہ میگھ دے" "سر شام" "سمن" اور "کانٹے" اہم مقام رکھتے ہیں۔

اسی دور میں ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کے علیحدہ وطن کی تحریک بھی

سامنے آتی ہے تو ناول کے موضوعات میں نئے موضوع کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس دور میں قرۃ العین حیدر کے ناول اپنے سیاسی اور سماجی موضوعات کے اعتبار سے ایک شدید جذباتی تاثر رکھتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں تاریخ، فلسفہ، تہذیب، معاشرت، سیاست، معاشیات، نفسیات، تصورات، افکار اور اقدار مشرق اور مغرب کی کشمکش سب کچھ ہی تو ہے جس نے اسے اردو ادب کے روشن ستارے کا درجہ دیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا شمار اردو ناول کی ان چند خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو ادب کے خواتین کے ادب کو نئی نئی راہوں سے روشناس کروایا۔ ان مجتہدین میں قرۃ العین حیدر کے علاوہ عصمت چغتائی اور حجاب امتیاز علی نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ''آگ کا دریا'' ''میرے بھی صنم خانے'' ''چاندنی بیگم'' ''کارِ جہاں دراز ہے'' ''سفینۂ غمِ دل'' ''آخرِ شب کے ہمسفر'' اور ''گردشِ رنگِ چمن'' وسیع پس منظر اور تکنیکی اعتبار سے لازوال شہرت رکھتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ساتھ ہی عصمت چغتائی اس دور کی عظیم ناول نگاروں میں شمار ہوتی ہیں جن کو بے پناہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور آج تک ان کا سحر قائم ہے کیونکہ کوئی اور فنکار خاتون اس مقام تک نہیں پہنچ سکی، جو معیار اور ادبی لحاظ سے ان کو حاصل ہے۔ عصمت کو ایک خصوصیت یہ بھی حاصل ہے کہ وہ اردو ادب کی واحد خاتون فنکار ہیں جنھوں نے عورتوں کے نجی مسائل اور ان کو درپیش جنسی تفریق اور جرائم پر کھل کر لکھنا اور بند معاشرے کے گھٹن زدہ ماحول میں صنفِ نازک کے احتجاج کا دریچہ وا کیا۔

ان پر بے باکی کے الزامات بھی لگے۔ فحاشی کے الزام میں انھیں عدالتوں میں بھی گھسیٹا گیا۔ ان کو شدید مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے نچلے طبقے کی عورتوں، بدنام گلیوں کی کسبیوں سے لے کر اعلیٰ طبقے کی بگڑی ہوئی رئیس زادیوں تک کے مسائل کو موضوع بنایا۔ میڈم سے لے کر بیگم تک، شبو سے لے کر امرا تک، پسنے والی، کڑھنے والی جلنے والی اور جلانے والی عورتیں نہایت بے باکی سے عصمت چغتائی کے قلم سے ہمارے معاشرے کا زندہ جاوید کردار بن کر ہمارے سامنے آتی ہیں اور ہمارے ظاہر و باطن کی خباثت ہمارے سامنے لاکر پھینک دیتی ہیں۔ جھونپڑی سے لے کر کمرے تک فلیٹ سے لے کر بنگلے تک کوئی خفیہ گوشہ عصمت کی نگاہ سے محفوظ نہیں رہتا۔ عورتوں کا المیہ ہو یا طربیہ کوئی بھی مسئلہ چھپا نہیں رہتا۔ عصمت نے زندہ انسانوں کو موضوعِ بحث بنایا اور ان کے حالات و

واقعات پیش کیے۔ بے باکی، حقیقت نگاری اور کردار نگاری اس کا خاص فن ہے۔ عورتوں اور مردوں کی فطرت، نفسیات، جذبات کی کردار کشی اس کا فنکارانہ کمال ہے۔ ان کے ناولوں میں ''معصومہ''، ''ضدی''، ''ٹیڑھی لکیر''، ''سودائی'' ''عجیب آدمی''، ''دل کی دنیا''، ''جنگلی کبوتر''، ''اک قطرہ خون'' مقبول عام ہیں۔ اسی دوران برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کے بعد ناول نگار خواتین نے تقسیم اور فسادات کو بھی موضوع بنایا۔ اس دور میں ہونے والی جذباتی الجھنوں اور محبتوں کی موت نے نفسیاتی طور پر خواتین کو بہت پریشان کیا اور انھوں نے اس جذباتی الجھاؤ کو نہایت مہارت سے سامنے لایا۔ قرۃ العین حیدر کے آگ کا دریا کے علاوہ اردو ادب کا ایک نہایت اہم ناول ''ایوانِ غزل'' ہے جو جیلانی بانو کی قلم کا شاہکار ہے۔ اس ناول میں حیدر آباد کی ریاست کی شکست و ریخت، جاگیر دارانہ ماحول اور نظام شاہی تہذیب کے زوال کا بھرپور تجزیہ ہے۔ جیلانی بانو کے ناولوں میں عورت اپنے فطری ماحول اور فطری جذبات و کردار کے ساتھ سامنے آتی ہے اور اس کے مسائل اور دکھ سکھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جیلانی بانو کے ناول معاشرتی زندگی کی بہترین عکاسی کرتے ہیں اور ان کا سادہ دل کو چھو جانے والا اسلوب بیان الفاظ کی کاری گری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اسی انداز کی کہانیاں واجدہ تبسم نے بھی لکھی ہیں۔ جن میں خاص طور پر نواحی ماحول میں عورت کے جنسی استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔

●●

غزلیں

اگر ہے تم پہ بھی لازم غضب کیے جانا
مرا بھی فرض نہیں ہے ادب کیے جانا

تمہارا حسنِ سماعت نہ خود کشی کر لے
مری نواؤں کو محروم لب کیے جانا

مری دہائی نے تو موت کی سزا سن لی
زمانے بھر سے تم انصاف اب کیے جانا

وہ آسمان کا فن کار آدمی بھیجے
تم اس زمین پہ تخلیق رب کیے جانا

دیا نہ جائے تو حق چھیننا بھی جائز ہے
صداقتوں کی ہتک ہے طلب کیے جانا

مظفرؔ اپنی عقیدت کے بس کا روگ نہیں
فدائے شب کیلئے وصف شب کیے جانا

مظفرؔ وارثی
25۔ ستلج بلاک،
علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

متاعِ دردِ محبت کو رائیگاں نہ کہو
تم اپنی بات کرو میری داستاں نہ کہو

مہک اٹھا ہوں زمانے کی آگ میں جل کر
مری حیات کو خوشبو کہو دھواں نہ کہو

عجب نہیں کہ تمہارا وہ دوست بن جائے
حریف جاں کو بھی اپنے حریف جاں نہ کہو

جو چاہتے ہو کہ پیروں تلے زمین رہے
تو اپنے قد کی بلندی کو آسماں نہ کہو

کہاں سے دو گے جو ساحل کسی نے مانگ لیا
بھنور کو ناؤ، ہواؤں کو بادباں نہ کہو

کرو نہ اتنی بھی دلجوئیاں کہ دل مر جائے
چراغ بھی جو نہیں اس کو کہکشاں نہ کہو

مرے قدم مری حد نظر سے آگے ہیں
میں کارواں ہوں مجھے گرد کارواں نہ کہو

دکھاؤ دل نہ مظفرؔ کسی بھی موسم کا
زبان خشک سے پت جھڑ کو بھی خزاں نہ کہو

غزلیں

تمہارے عشق میں کس کس طرح خراب ہوئے
رہا نہ عالم ہجراں، نہ وصل یاب ہوئے

عجب سزا ہے کہ میرے دعاؤں والے حروف
نہ مسترد ہوئے اب تک نہ مستجاب ہوئے

ذہانتیں تھیں تری یا اناڑی پن اپنا
سوال وصل سے پہلے ہی لاجواب ہوئے

حقیقت اتنی ہے اس کے مرے تعلق کی
کسی کے دکھ تھے، مرے نام انتساب ہوئے

جسے سمجھتے تھے صحرا وہ اک سمندر تھا
کھلا وہ شخص تو ہم کیسے آب آب ہوئے

نہ آیا ڈھنگ ہمیں کوئی عشق کا حیدرؔ
نہ دل کے زخموں کے ہم سے کبھی حساب ہوئے

حیدر قریشی (جرمنی)

سیاہ راتوں کے جسم روشن کیا کریں گے یہ طے ہوا تھا
بچھڑ کے بھی ایک دوسرے سے ملا کریں گے یہ طے ہوا تھا

غموں کی آندھی مہکتے جسموں کو روند ڈالے کبھی تو مل کر
اداس چہروں پہ مسکراہٹ لکھا کریں گے یہ طے ہوا تھا

تمام شب اپنے جسموں پہ چاہتوں کے گلاب چن کر
تمام دن کی لکھی تھکن کو پڑھا کریں گے یہ طے ہوا تھا

جدائیوں کی اجاڑ شب میں جہاں کہیں بھی پڑاؤ ہوگا
وہیں سے اک دوسرے کے حق میں دعا کریں گے یہ طے ہوا تھا

سجا کریں گے دریچہ جاں میں جب کبھی خوشبوؤں کے موسم
رفاقتوں کے گلاب ہر شب کھلا کریں گے یہ طے ہوا تھا

ولیؔ بجنوری

عذاب دید میں آنکھیں لہو لہو کر کے
میں شرمسار ہوا تیری جستجو کر کے

کھنڈر کی تہہ سے بریدہ بدن سروں کے سوا
ملا نہ کچھ بھی خزانوں کی آرزو کر کے

سنا ہے شہر میں زخمی دلوں کا میلہ ہے
چلیں گے ہم بھی مگر پیرہن رفو کر کے

مسافت شب ہجراں کے بعد بھید کھلا!
ہوا دکھی ہے، چراغوں کی آبرو کر کے

زمیں کی پیاس اسی لہو کو چاٹ گئی
وہ خوش ہوا سمندر کو آبجو کر کے

یہ کس نے ہم سے لہو کا خراج پھر مانگا؟
ابھی تو سوئے تھے مقتل کو سرخرو کر کے

جلوس اہل وفا کس کے در پر پہنچا ہے؟
نشان طوق وفا زینت گلو کر کے

اجاڑ رت کو گلابی بنائے رکھتی ہے
ہماری آنکھ تری دید سے وضو کر کے

کوئی تو حبس وفا سے پوچھتا ہے محسنؔ
ملا ہے کیا اسے کلیوں کو بے نمو کر کے

محسنؔ نقوی

○

سفر میں دور تک سائے نہیں ہیں
مگر ہم پھر بھی گھبرائے نہیں ہیں

یہ کچے بیر جو کھائے نہیں ہیں
پرندے لوٹ کر آئے نہیں ہیں

یہ کس کی بات کرتے ہو میاں تم
مقابل ہم ابھی آئے نہیں ہیں

یہ اپنے بوجھ سے ٹوٹی پڑی ہے
ہوا نے ہاتھ پھیلائے نہیں ہیں

چلو روشنؔ اسی جانب چلیں اب
جہاں پر جذب، نغمے نہیں ہیں

سعید روشنؔ

صفات

غزلیں

غیر ممکن ہے کہیں کوئی علامت مل جائے
شہر میں تجھ سا کسی کا قد و قامت مل جائے

گفتگو کرنے لگیں مجھ سے ابھی سناٹے
کاش لفظوں کو مرے کوئی کرامت مل جائے

بندگی اور اطاعت تو تبھی ممکن ہو
شہر آشوب میں سر کوئی سلامت مل جائے

زندگی ڈھونڈنے نکلوں میں کسی روز تجھے
اور رستے میں کہیں مجھ کو قیامت مل جائے

وہ کہ ظالم ہی سہی ہم اسے کر دیں گے معاف
اس کی آنکھوں میں اگر اشک ندامت مل جائے

کیوں نہ اس سر کے مقدر پہ ہنسیں ہم جو رئیسؔ
تاج مانگے تو اسے سنگِ ملامت مل جائے

رئیس الدین رئیسؔ
10/1725۔ دہلی گیٹ،
علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱

ڈس رہا ہے آدمی کو آدمی
دور سے تجھ کو سلام اے زندگی!

اس سے پوچھو کربِ جاں کیا چیز ہے
جس کو رونے دے نہ اس کی بیکسی

شب کا سناٹا بہت کچھ کہہ گیا
جب کسی غم نے مجھے آواز دی

سیکھ لے کچھ وقت سے عیاریاں
مار ڈالے گی تجھے سادہ دلی

پھر خرد نے ذہن پر ڈالی کمند
المدد! اے شورشِ دیوانگی

لکھ کے شاعر خود کو نادم ہوں بہت
عیب بن کر رہ گئی ہے شاعری

اب خدا جانے کدھر جائے پتنگ
ڈور تو مخمورؔ! ہاتھوں سے چلی

مخمورؔ جمالی سنبھلی
محلہ کھگو سرائے، نزد مدینہ مسجد
سنبھل، ضلع مراد آباد (یوپی)

غزلیں

بات اگلی سی اب کہاں میری — رہ گئیں ہیں کہانیاں میری
بزم اغیار بزم خوباں میں — داستاں ہے کہاں کہاں میری
محو آئینہ محو آرائش — بات ایسے میں ہو کہاں میری
صرف اک لغزش محبت کی — ہو گئیں سو کہانیاں میری
بند ہوگی نہیں زبان خلق — بند کر سکتے ہو زباں میری
غنچہ وخاروگل میں فرق نہ کر — مان لے اتنی باغباں میری
وہ بھی بے قابو دل بھی بے قابو — بے بسی لائی ہے کہاں میری
نئی امیدیں پیدا کرتی ہیں — روز کی ناامیدیاں میری
جرم ہے آج میری حق گوئی — عیب ہیں حق پرستیاں میری
خوں سے سینچا ہے غنچہ و گل کو — یاد کرے گا گلستاں میری
میرے اشعار اور مرا کردار — یہ رہیں گی نشانیاں میری
قدریں اب گر گئیں زمانے کی — ان میں گنجائش اب کہاں میری
اب وہ آنکھیں نہیں ملاتے ہیں — جو ملاتے تھے ہاں میں ہاں میری

چاہے گرداب چاہے طوفاں ہو
موجؔ کشتی ہے اب رواں میری

راجندر بہادر موجؔ
موج مارگ، فتح گڈھ۔209601

غزلیں

○

دھوپ، بارش میں چھتریوں والی
ہے غزل اپنی موسموں والی

"باپ" میرا تھا،ناریل جیسا
"ماں" مجسم محبتوں والی

ذہن آزاد اک پرندہ ہے
پھر بھی پرواز سرحدوں والی؟

کیسے بھولیں، وہ "گیس" والی رات
صبح جس کی تھی مرگھٹوں والی

تیری عادت میں خود نمائی ہے
میری فطرت قلندروں والی

کیف[1] صاحب کے نام کردی ہے
آج کی شام بادلوں والی

تم نے تنویرؔ گھر کے ہوتے ہوئے
زندگی جی ہے ہوٹلوں والی

شفق تنویرؔ
مکان نمبر 8۔ ریتی والی گلی، نوبہار سبزی
منڈی روڈ، بھوپال۔ 462001 (ایم پی)

○

دل کا قرار نور نظر کا کہیں جسے
ایسا نہیں ملا ہمیں اپنا کہیں جسے

یہ آتش شباب ہے یہ شعلۂ شباب
چہرے کا ہے وہ رنگ تمنا کہیں جسے

سیمیں بدن وہ حسن نشیب و فراز کا
مخمور چاندنی کا سراپا کہیں جسے

مرے تصورات میں رونق اسی سے ہے
دل کا چراغ آنکھ کا تارا کہیں جسے

پنہاں نگاہِ یار میں ہے لطف زندگی
کیف و سرور ساغر و مینا کہیں جسے

بڑھتا رہا نظر کے سہارے میری طرف
وہ التفات دست زلیخا کہیں جسے

اس کے لبوں پر موج تبسم ہے وہ سحرؔ
کشمیر کی شمیم کا جھونکا کہیں جسے

پروفیسر فرید قریشی سحرؔ اکبر آبادی
904, S.Catalina Ave. No.18
Los Angeles, C.A-90006(U.S.A)

---

[1] کیف بھوپالی

غزلیں

○

بے رنگ اجالوں کی پزیرائی سی کیوں ہے
اس دھوپ میں سائے کی صف آرائی سی کیوں ہے

بے آب زمینوں پہ فلک بھی نہیں ٹوٹا
دریاؤں پہ گھنگھور گھٹا چھائی سی کیوں ہے

امواج سبک رو سے نہیں بیر تو، لوگو
دریا میں تلاطم کی یہ انگڑائی سی کیوں ہے

ہر پھول کے چہرے پہ تفکر کا ہے غازہ
گلزار پہ صحرا کی فضا چھائی سی کیوں ہے

نوشادؔ! سفر کا تو ارادہ بھی نہیں تھا
منزل مرے قدموں میں سمٹ آئی سی کیوں ہے

ڈاکٹر نوشادؔ احمد کریمی
گنج نمبر۔۱، بتیا۔۸۴۵۴۳۸ (بہار)

○

منظر میں نہیں تھا، پس منظر میں نہیں تھا
مجھ جیسا تنہا کوئی لشکر میں نہیں تھا

اک بھیڑ میں رہ کر بھی رہا قطع تعلق
تا حد نظر کوئی بھی محشر میں نہیں تھا

کیوں مجھ پہ نظر پڑتے ہی بڑھنے لگا اس سمت
پہلے کبھی یہ جذبہ سمندر میں نہیں تھا

دنیا کی سیاحت ہو کہ عقبیٰ کی مسافت
وہ کون سا عالم مرے ساغر میں نہیں تھا

مرکوز جہاں ہوتی نظر تشنہ لباں کی
وہ جام ابھی دست ہنرور میں نہیں تھا

وہ دور سے پہچان لیا کرتے تھے مجھ کو
یہ ذوق نظر میرے ہی دلبر میں نہیں تھا

کل میں ہی تھا پھیلا ہوا چوتھائی صدی پر
ہاں نام مرا ذکر سخن ور میں نہیں تھا

اس بات پہ قاتل اسے سمجھا گیا اے شانؔ
موجود وہ کیوں قتل کی شب گھر میں نہیں تھا

شانؔ بھارتی
سہ ماہی "رنگ" دھنباد۔ 828121

غزلیں

○

یہ سوچتا ہوں کہ دنیا سے ہٹ کے کام کروں
ہوا چلے تو چراغوں کا اہتمام کروں

دعائیں پاؤں، بزرگوں کا احترام کروں
ملے جہاں بھی اجالا اسے سلام کروں

سرورِ شوق کی حاجت نہ بیخودی کی طلب
میں بادہ خوار نہیں جو تلاشِ جام کروں

کبھی دماغ کی مانوں کبھی سنوں دل کی
مرے رفیق ہیں دونوں کا احترام کروں

سنا یہی ہے کہ رکھتی ہیں کان دیواریں
اکیلے پن میں بھی میں سوچ کر کلام کروں

تمام شہر انا کے حصار میں گم ہے
میں کس سے ہاتھ ملاؤں کسے سلام کروں

ذرا سی بات کو کیوں طول دے رہے ہو ظہیرؔ
اگر کہو تو یہ قصہ یہیں تمام کروں

حسن ظہیرؔ
91- جنسی چرچ روڈ، جہانگیر آباد
بھوپال-462008(ایم پی)

○

شہرِ وفا میں کوئی شناسا نہیں رہا
اپنا جسے کہیں کوئی ایسا نہیں رہا

کیسے میں حرف حرف لکھوں غم کا سلسلہ
کاغذ ہی میری عمر کا سادہ نہیں رہا

اک آئنہ جو دیکھتا رہتا تھا رات دن
اس آئنہ میں عکس ہی اپنا نہیں رہا

ٹوٹے ہوئے وہ گھر جہاں دنیا تھی پیار کی
ایسے گھروں کو کوئی بھی رستہ نہیں رہا

راہیؔ وفا کے ہم نے جو پودے لگائے تھے
ان پر خلوص کا کوئی پتا نہیں رہا

سوہن راہیؔ
لندن

غزلیں

○

نیکی کا کچھ خیال نہ ڈر کوئی پاپ سے
بنتی نہیں ہے آج تو بیٹے کی باپ سے

خوشیاں مرے قریب سے گذریں نہ آج تک
اب تو یہ دل لرزتا ہے ڈھولک کی تھاپ سے

چاروں طرف ہی نور کی بارش سی ہوگئی
خوشبو مہک اٹھی ہے دلوں کے ملاپ سے

تیرے علاوہ دوسرا ممکن نہیں کوئی
پہچانتا ہوں میں تجھے قدموں کی چاپ سے

جس دن سے میں گناہوں کی دلدل میں پھنس گیا
نفرت سی ہوگئی ہے مجھے اپنے آپ سے

سیفیؔ سرونجی
سرونج (ایم پی)

○

اپنی تحریر کے آئینے میں جب تو آئے
تجھ کو محسوس کروں اور تری خوشبو آئے

جب کبھی ہجر کی راتوں میں ہوا ہوں مایوس
حوصلہ دینے تری یاد کے جگنو آئے

ایسا موسم بھی تجھے دیکھ کے گزرا دل پر
لب پہ ہلکی سی ہنسی آنکھ میں آنسو آئے

کاش! ٹوٹے کبھی پت جھڑ کی جوانی کا غرور!
فصل گل باندھ کے پیروں میں گھنگرو آئے

ہم جہاں دیکھ بھی سکتے نہیں مڑ کر تجھ کو
دست احساس وہاں جا کے تجھے چھو آئے

جب کبھی خود کو سمندر میں اتارا ہے شمیمؔ
نا امیدی کے مرے ہاتھ میں بازو آئے

شمیمؔ انجم وارثی
ایم ڈی روڈ، گارولیا۔ اتر 24 پرگنہ
(ویسٹ بنگال)

غزل

چھاؤں کی چاہت میں ملتا ہے مجھے گھر دھوپ کا
فرش پر جس کے بچھا رہتا ہے بستر دھوپ کا

چل رہے ہیں دل میں ٹھنڈی چھاؤں کی خواہش لئے
سر پہ ہے لٹکا ہوا سفاک خنجر دھوپ کا

زندگی اس کے لئے شبنم کا دلکش روپ ہے
جس کی آنکھوں نے نہیں دیکھا ہے منظر دھوپ کا

ایک بوڑھا پیڑ تھا آنگن میں وہ بھی کٹ گیا
ہر ستم سہنا پڑے گا اب ستمگر دھوپ کا

خشک دھرتی پر گھٹا بن کر برس جاؤں اگر
شرم سے کٹ جائے گا بیدرد شہپر دھوپ کا

آئینہ گر کی لطافت کے ہنر سے ایک دن
خود پگھل کر موم ہو جائے گا پتھر دھوپ کا

پیاس ہونٹوں پر لئے میں چل پڑا جب بھی سعید
سامنے بہتا نظر آیا سمندر دھوپ کا

سعید رحمانی
دیوان بازار، کٹک۔۷۵۳۰۰۱

غزلیں

○

منظر کتنا بدلا، لکھ
گلشن کو اب صحرا لکھ

قریہ قریہ پھرتے ہیں
ہم کو بھی بنجارا لکھ

شہر کے سناٹوں کو چھوڑ
روحوں کا سناٹا لکھ

"ناقد" صاحب کہتے ہیں
میری حسب منشا لکھ

سازش کا اقرار بھی کر
لاشوں کا تخمینہ لکھ

بچوں کو ناداں مت کہہ
مستقبل کے "دانا" لکھ

شاہد ہے تو مقتل کا
جیسا دیکھا ویسا لکھ

محمد شاہد پٹھان
ایس۔ آر۔ ایف۔ ڈیپارٹمنٹ آف اردو
پرشین یونیورسٹی آف راجستھان
جے پور۔302004

○

آئینہ سچا ہے مرے پاس صورت ہی نہیں
کیا کروں ثابت مرا ہونا صداقت ہی نہیں

خواب، خوشبو، رنگ، سورج، خاک، دریا پر سکوت
پیاس کی بہتی ندی میں کوئی قیمت ہی نہیں

تیرگی میں جو چراغ راہ منزل بھی ہے
میری پیشانی پہ وہ نقش عبادت ہی نہیں

میں جہاں جس حال میں ہوں صبر کے سائے میں ہوں
مفلسی کا خوف کیا پاس دولت ہی نہیں

بھوک کا ادراک بھی دے پیاس کا عرفان بھی
کچھ فقیری بھی عطا کر بادشاہت ہی نہیں

میں بھی ان مبہم لکیروں پر اجالے کیا لکھوں
تو مجھے چھو کر بھی دیکھے تجھ کو فرصت ہی نہیں

بارشیں آندھی پہن کر بن گئیں دیوار و در
کیا کروں پرواز قسمت میں کوئی چھت ہی نہیں

نصیر پرواز
L-296، نیو سبھاش نگر،
بھوپال۔462023

غزلیں

○

جب نسیم سحری پھول کھلا آئے گی
نیند تب عشق کے ماروں کو ذرا آئے گی

انقلابات بدل دیں گے زمانے کی روش
بند در ہوں گے نہ آہوں کی صدا آئے گی

اپنے شہر کو مقتل تو بنا رکھا ہے
اب گلستان میں کہاں بوئے وفا آئے گی

موسم گل کئی تڑپا کے گزر جائیں گے
تب کہیں جا کے رہائی کی صدا آئے گی

آپ کو فکر زمانے سے نہیں ہے فرصت
کب ایاز آپ کو جینے کی ادا آئے گی

ایاز قمر ایڈوکیٹ
13۔ قمر ہاؤس
گلی چوکی امام باڑہ، بھوپال (ایم۔پی)

○

کس قدر رنج ہے پیرہن میرا
جم نہ جائے کہیں بدن میرا

جانے کیا راز ہے میرے دل میں
جانے کیوں بند ہے دہن میرا

میری دیوانگی ہی آخر کار
مجھ کو پہنائے گی کفن میرا

مہر و مہ پر کمند ڈالے ہے
اک نئے عزم سے وطن میرا

زندگی کے سلگتے صحرا میں
جل بجھا ہے کہیں چمن میرا

صرف مجھ تک ہی رہ گیا محدود
میری خلوت میں فکر و فن میرا

گردش وقت سن سکی نہ کنولؔ
شعر کوئی میرا، سخن میرا

سدرشن کنولؔ

غزلیں

○

ناخوش گوار شام سے، بستی کا رنگ ہے
اب کے دھوئیں میں خون کی سرخی کا رنگ ہے

اتنے قریب آئے کہ یک رنگ ہو گئے
جو برگِ گل کا ہے، وہی تتلی کا رنگ ہے

کس سے تعلقات محبت بڑھائے جائیں
ہر شخص میں ضمیر فروشی کا رنگ ہے

یہ حال تو نہیں ہے ترقی پذیر حال
رخ پر تو اس کے آج بھی ماضی کا رنگ ہے

سمجھائے اس کو کیسے کوئی جس کے سامنے
تاریکیوں میں کوندتی بجلی کا رنگ ہے

شوخی نہ ہو سکی، اثر انداز آج تک
غالب سخن پہ مکتب دہلی کا رنگ ہے

کوئی بھی نیستی کو نہیں دیکھتا کریمؔ
سب کی نظر کے سامنے ہستی کا رنگ ہے

کریمؔ مودھوی
کتاب خانہ، حسین گنج، مودہا
پوسٹ: راگول-210507
ضلع: ہمیر پور (یو-پی)

○

اہل ساحل کو نہ آئے گا یہ منظر دیکھنا
خشک آنکھوں میں نہاں میرے سمندر دیکھنا

سوختہ دل ہم سہی عادت ہماری ہے مگر
جانکسل حالات کو بھی روح پرور دیکھنا

ہم نے تو رخ ہی بدلتے تم کو دیکھا ہے سدا
مختلف کچھ اب ہوا کے تم بھی تیور دیکھنا

رنگ لائے گا مرا احسن یقیں مہکیں گے اب
پتھروں کے شہر میں گلزار اکثر دیکھنا

سحران آنکھوں کا تمایا تھی وہ نادانی مری
ان کو اپنی آرزوں کا ہی محور دیکھنا

ہے سجا زخموں سے دل مہکے اپنا دامان حیات
یہ کرم خار جفا کا خوب ہم پر دیکھنا

آتے آتے دیکھئے آئے گا سیمآیہ ہنر
آستینِ دوست میں پوشیدہ خنجر دیکھنا

سیمآ جبار
لندن

غزل

ہم کو کچھ یاد نہیں عمر کدھر گزری ہے
لوگ کہتے ہیں کہ یہ خاک بسر گزری ہے

ہم فقیروں کو بھلا ہوش کہاں تھا اتنا
کس طرح شام کٹی کیسے سحر گزری ہے

یاد میں اس کی بناتی رہیں پلکیں موتی
میری ہر رات یونہی وقف گہر گزری ہے

کس طرح مان لوں وہ ساتھ نہیں تھا میرے
اس کی خوشبو میرے ہم راہ سفر گزری ہے

اس کی سفاکیاں بکھری ہوئی دیکھیں ہر سو
جب کبھی وقت کے جنگل سے نظر گزری ہے

جب کبھی شہر کا منصف ہوا غافل اس سے
اک قیامت سی یہاں آٹھ پہر گزری ہے

پیار کا شہر بسانے کی سزا میں سعدی
آج تک عمر مری شہر بدر گزری ہے

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

- نمونے کا پرچہ منگانے کیلئے =/60روپے کا منی آرڈر کریں۔
- ''ایوانِ ادب'' آپ کا اپنا رسالہ ہے۔ اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات سے نوازیے۔ اپنی ادبی سرگرمیوں سے ہمیں باخبر رکھئے۔ ''ایوانِ ادب'' کے صفحات آپ کیلئے حاضر ہیں۔
- سالانہ خریداری قبول فرمایئے اردو کے فروغ میں ہمارا ہاتھ بٹایئے۔
- زر سالانہ روانہ کرتے وقت اپنا مکمل پتہ مع پن کوڈ ضرور لکھئے۔
- جواب طلب امور کیلئے مناسب ڈاک ٹکٹ اور لفافہ ارسال کیجئے۔
- اپنے چیک یا ڈرافٹ پر صرف "AIWAN-E-ADAB" ہی لکھئے۔
- بیرون ہند سے بینک ڈرافٹ، کراس پوسٹل آرڈر یا انٹر نیشنل منی آرڈر ہی قبول کیئے جاتے ہیں۔

ندا فاضلی

شعری بھوپالی

آج سے تقریباً نصف صدی پہلے ایک فلم شوکت حسن رضوی کی ہدایت میں بنی تھی۔ نام تھا "جگنو" اس میں دلیپ کمار کے ساتھ ہیروئین ملکہ ترنم نورجہاں تھیں۔ اس فلم میں ایک غزل نورجہاں کی آواز میں بہت مقبول ہوئی تھی۔

جہاں وہ ہوں وہیں اے چاند لے جا چاندنی اپنی
ہمیں تو شام غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی

غزل فلم میں آنے کے بعد ملک کے ہر گلی کوچے میں گنگنائی جانی نے لگی تھی۔ ہر محفل میں سازو آواز کے ساتھ سنائی جانے لگی تھی۔ محبت ناموں کی زینت بنائی جانے لگی تھی۔ اس غزل کی مقبولیت میں صرف ملکہ ترنم کی آواز کا کمال ہی نہیں تھا، لفظوں کا جمال بھی شامل تھا۔ آواز کو جب اچھے الفاظ مل جاتے ہیں تو نغمہ کو پر لگ جاتے ہیں۔ اس غزل کے شاعر ان دنوں کے نوجوان شاعر شعری بھوپالی تھے۔ شعری صاحب نے یہ غزل بمبئی کے ایک مشاعرہ میں سنائی تھی اور بے حد داد پائی تھی۔ آسان بے تکلف لفظ، رواں مصرعے، نوجوان کی باادب سرمستی نے شوکت حسن رضوی کو بھی متاثر کیا اور انھوں نے اسے اپنی فلم کے لیے اچھے خاصے معاوضہ پر لے لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فلموں میں ہرا یرے غیرے سے گیت نہیں لکھوائے جاتے تھے، اس کے لیے مستند شاعر بلوائے جاتے تھے فلم میں اس غزل کی شہرت کو شعری نے کبھی کوئی اعزاز نہیں سمجھا نہ بعد میں اسے کہیں سنایا۔ جب مشاعروں میں اس کی فرمائش بڑھنے لگی تو انھوں نے اسی زمین میں دوسری غزل کہی اور وہی ہمیشہ سنائی۔ یہ دوسری غزل ان کے دوسرے مجموعے "آتش دل" میں شامل ہے۔ اس کا مطلع ہے۔

چمن کے پھول اپنے، چاند اپنا، چاندنی اپنی
وہ اپنے ہو گئے تو ساری دنیا ہو گئی اپنی

شعری بھوپالی، میر، نظیر اور غالب کے شہر اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ عالم غیب سے وہ عالم وجود میں کب موجود ہوئے اس کے بارے میں دوسروں کی طرح وہ خود بھی لاعلم تھے۔ انھوں نے اس تعلق سے ایک بار لکھا ہے۔

"تاریخ اور سن پیدائش کا صحیح علم نہ ہونا مجھ جیسے متوسط طبقے میں پیدا ہونے والے لوگوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے طبقے میں متمول خاندانوں کی طرح سالگرہ جیسی رسموں کا کوئی رواج نہیں۔ اور نہ ہمارے گھرانوں میں پیدا ہونے والے کسی بچے کے بزرگ اس کے مستقبل سے ایسی امید وابستہ کرتے ہیں کہ سنِ پیدائش کو یاد رکھا جائے۔"

گھر کا نام محمد اصغر خاں تھا۔ اس میں "شعری" کا اضافہ مُلّا رموزی کی دین تھی۔ جن سے انھوں نے ابتداء میں اردو سیکھی تھی۔ یہ وہی مُلّا رموزی تھے جو گلابی اردو اور نکاتی اردو کے موجد خیال کیے جاتے تھے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو، میں ان کا ذکر پطرس، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی اور عظیم بیگ چغتائی کے ساتھ کیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"مُلّا رموزی کے یہاں عام طور پر سیاسی واقعات کی طرف اشارے ہوتے ہیں۔ اور مزاح سے فطری لگاؤ ہونے کی وجہ سے عبارت کافی دلچسپ ہو جاتی ہے۔ وہ سماج کے بے باک تنقید نگار تھے۔"

شعری کے والد محمد اکبر خان اپنے عہد کے مشہور عالم دین اور فاضل ادب ہونے کے ساتھ ایک عامل صوفی بھی تھے۔ اس صوفیانہ وراثت سے شعری صاحب نے تو اپنے کردار اور اشعار کو ہی سجایا، لیکن ان کے بڑے صاحب زادے اختر شعری تیسری نسل میں اس وراثت کے عملی وارث بن گئے۔ کچھ سال پہلے تک بمبئی میں تھے، اور تعویذ گنڈوں، دعاؤں اور پیشین گوئیوں سے عقیدت مندوں کو فیض پہنچا رہے تھے۔ فلمی حلقوں میں بھی ضرورت مند ان کے آگے پیچھے تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا اچانک غائب ہو گئے۔ ان کی گمشدگی کی بابت لوگوں کی اپنی اپنی تاویلیں ہیں۔ ایک حلقہ ایسا بھی ہے جو اسے بھی ان کی کرامت سے تعبیر کرتا ہے۔ اختر شعری، شعری صاحب کے اکلوتے لڑکے تھے۔ لیکن دونوں کا ساتھ رہنا مشکل تھا۔ باپ، جوان بیٹے کی صوفیانہ لاپرواہیوں سے پریشان تھا، اور بیٹا بزرگ باپ کی شاعری سے نالاں تھا۔ اختر کے تئیں شاعری گمراہی کا راستہ ہے جو آدمی کو جہنم کی

طرف لے جاتا ہے۔ اسے اپنے والد سے محبت تھی۔ اس لیے وہ اکیلا جنت میں نہیں جانا چاہتا تھا شعریؔ کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ جس کے لیے شعریؔ صاحب تیار نہیں تھے۔ یہی اختلاف دونوں کے فاصلے کا باعث تھا۔ ایک گھر کی ذمہ داریوں سے مجبور تھا، دوسرا دنیا اور اس کی پرستاریوں سے دور تھا۔

شعریؔ سولہ سال کی کچی عمر میں بوڑھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان کے والد کی بے وقت رحلت نے گھر کا سارا بوجھ ان کے جوان کندھوں پر رکھ دیا تھا۔ اسی عمر میں انھیں تعلیم چھوڑ کر ملازمت کرنی پڑی۔ بھوپال کے ادبی ماحول نے ان میں جو شاعری کا شوق جگایا تھا وہ بھی ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ اس شوق میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب وہ تعلیم طب کے لیے بھوپال سے دہلی گئے۔ دہلی میں اردو مجلس کی ادبی نشستوں کی کافی دھوم تھی۔ بمبئی کے استاد خلیل کی طرح خواجہ شفیع کا دولت خانہ بھی دہلی کے کئی شاعروں کا آشیانہ تھا۔ ہر اتوار کو وہاں باقاعدہ نشست ہوتی تھی۔ جس میں جوشؔ، بیخودؔ، استاد رساؔ، زارؔ دہلوی، دتاتریہ کیفیؔ اور دوسرے نئے پرانے شعراء شریک ہوتے تھے۔ شعریؔ کی شعری زبان کی چمک دمک میں، ان کی اپنی ریاضت اور اساتذہ کے کلام سے گہری قربت کے ساتھ ان نشستوں کی شرکت کا بھی بڑا رول ہے۔ یہیں سے ان کی آواز اور انداز کا اعجاز عوامی مقبولیت سے سرفراز ہوا۔ شعریؔ یوں باقاعدہ کسی کے شاگرد نہیں تھے لیکن غزل میں حسن کے احترام، محبت کی شائستگی، رشتوں کی پاکیزگی اور مجاز و حقیقت کی امتزاجی تابندگی کے لحاظ سے اگر وہ کسی کے قریب محسوس ہوتے ہیں تو وہ جگرؔ مراد آبادی ہیں۔ جگرؔ صاحب بھی اپنے عہد میں جن نئے شاعروں پر زیادہ مہربان تھے ان میں مجروحؔ، خمارؔ، رازؔ اور شکیلؔ کے ساتھ شعریؔ بھوپالی کا بھی ایک نام تھا۔ شعری کی غزل، اپنے انداز میں اسی رنگِ سخن کی آئینہ دار ہے جو جگرؔ مراد آبادی کی شاعری کا معیار ہے۔

یہیں سے ہوتی ہے تمہید ہر فسانے کی
تری نظر ہے کہ تاریخ ہے زمانے کی

ابھی تو ایک ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے

دل کو نگاہ مست سے بہلا کے پی گیا
اک جام ایک جام سے ٹکرا کے پی گیا

جب سے تری نگاہ نے پھیرا ہے دل سے رخ
فرق آگیا ہے گردشِ لیل و نہار میں

نظر سے نظر نے ملاقات کرلی
رہے دونوں خاموش اور بات کرلی

شعری بھوپالی مشاعروں کے مقبول ترین شاعر تھے۔ وہ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ اچھے پرفارمر بھی تھے۔ اس پرفورمینس میں وہ آنکھیں، ہاتھ اور جسم کی حرکتوں سے کام نہیں لیتے تھے آواز کے اتار چڑھاؤ سے جادو جگاتے تھے۔ ان کا ترنم دوسروں سے مختلف ہی نہیں تھا، اس میں گائیکی سے زیادہ لحن کا حسن تھا۔ مصرع کو آواز سے مناسب جگہوں پر توڑ کر اس طرح جوڑتے تھے کہ پورا شعر تصویر بن کر سامعین کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتا تھا۔ شعری صاحب کو میں نے کبھی پورا شعر پڑھتے نہیں سنا۔ وہ عموماً قافیہ تک آکر رک جاتے تھے، ردیف سامعین خود دہراتے تھے۔ وہ اکثر بیٹھ کر سناتے تھے اور بیٹھے ہی بیٹھے مشاعرہ کو جب چاہتے تھے اٹھاتے تھے، جب چاہتے تھے بٹھاتے تھے۔ میں نے پہلی بار انھیں دہلی کے مشاعرہ میں دیکھا تھا۔ چھوٹا قد، گٹھا ہوا جسم، چوڑی دار پاجامے پر کالی شیروانی، شیروانی کی اوپری بائیں جیب میں لال رنگ کا رومال، سر پر اونچی باڑھ کی ٹوپی، جس کی وجہ سے ان کی جسمانی چھوٹائی میں تھوڑی لمبائی کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ ناک نقشہ کھڑا تھا لیکن چہرا جسم کے لحاظ سے مقابلتاً بڑا تھا۔ وہ آج ملیں یا کل، پانچ سال بعد ملیں یا دس سال بعد، ہمیشہ ایک ہی جیسے نظر آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا وہ اپنی شیروانی، ٹوپی اور پان بھرے منہ کے ساتھ ہمیشہ فریزر میں رہتے تھے۔ جب بھی باہر نکلتے تھے سال مہینے بدلتے تھے خود نہیں بدلتے تھے۔ مشاعروں کے بہانے جب بھی جہاں جاتے تھے، بزرگوں کے مزارات کی زیارت ضرور فرماتے تھے۔ شاعری کے علاوہ ہر شاعرانہ لت سے دور تھے۔ ان کے ہوتے ادب میں کئی رجحانات آئے، کئی تحریکیں طلوع ہوئیں، غروب ہوئیں، لیکن غزل سے ان کے لگاؤ اور اس کے کلاسکی سجاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ پہلے کا نام 'صبح غزل' تھا۔ دوسرا 'آتش دل' کے نام سے شائع ہوا۔ پہلے مجموعے میں انھوں نے اپنے شعری نظریہ کے بارے میں لکھا تھا۔

"اصناف ادب میں، میں غزل کو بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں، پچھلے کئی سالوں سے ہمارے شعراء نئے نئے تجربات کر رہے ہیں، اور اسی مدت میں بعض حضرات نے بالاتفاق غزل کی مخالفت بھی کی۔ لیکن غزل کی مقبولیت اور خسرویت کے سامنے نہ ٹھہر سکے، اور انھیں غزل کی تابندگی اور پائندگی کا اعتراف کرنا پڑا۔"

شعری مطالعہ سے زیادہ مشاہدہ کے شاعر تھے۔ انھوں نے زندگی کو عقل کے بجائے اپنے حواس و جذبات سے سمجھنے کی کوشش کی تھی، اور انھیں تجربات سے اپنی غزل کی آرائش کی تھی۔ ان کے شعری کردار وضع دار، بردبار، سرشار اور رشتوں کی اقدار کے ترجمان تھے۔ ان کی محبت کے رنگ جو پہلے عمر کے لحاظ سے شوخ اور چنچل تھے بعد میں تصوف کی آمیزش سے زیادہ گہرے اور تہ دار ہو گئے تھے۔ "آتشِ دل" میں شامل کچھ شعر یوں ہیں......

اے اسیر تصورات بتا
کون اب کس کی بارگاہ میں ہے
برابر خفا ہوں برابر منائیں
نہ وہ باز آئیں نہ ہم باز آئیں
وہ تو ملنے کو مجھ سے مل جائیں
عشق ہی راستہ نہیں دیتا

شعری کی شاعری کا حسن ان کی خود اعتمادی کا آئینہ ہے۔ مشاعروں کی مقبولیت کے باوجود انھوں نے نہ اسے کبھی بازار بنایا، نہ اسے اپنے معیار سے گرایا۔ وہ رسائل میں چھپنے چھپانے کے قائل نہیں تھے۔ صرف نشستوں اور مشاعروں میں شعر سناتے تھے اور شعر آپ ہی آپ دور دراز کے سفر پر نکل جاتے تھے۔ دہلی کے جس مشاعرہ میں انھیں پہلی بار دیکھا تھا، اس کی نظامت کنور مہندر سنگھ سحر کر رہے تھے۔ نظامت میں فحش لطیفے سنانے اور غیر ادبی جملے دہرانے کی روایت انھیں کی عطا ہے۔ مشاعروں میں کم عمر لڑکیوں کی شاعرات کی حیثیت سے شمولیت بھی انھیں کا احسان ہے۔ شعری کو بلاتے وقت انھوں نے یوں تعارف کرایا تھا۔ لیجیے اب شعری صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ وہ بھوپالی ہیں۔ ویسے بھوپال سے جو بھی آتا ہے اسے بھوپالی ہی کہتے ہیں۔ سحر صاحب کے اس جملہ پر ان کے مداحوں نے

قہقہہ بلند کیا۔ شعری صاحب کو ان کا یہ غیر ادبی مذاق اچھا نہیں لگا۔ انھوں نے فوراً جواباً کہا۔ لیکن آپ جہاں سے آئے ہیں، اسے ادب کی پامالی ہی کہتے ہیں۔ اس بار پہلے سے زیادہ بلند قہقہہ لگا۔ قہقہہ کے بعد جب شعری صاحب نے غزل شروع کی تو سامعین اور شعری کے درمیان صرف داد و ستائش تھی۔

جو کچھ دل پر گزرتی ہے وہی کہتا ہوں، اے شعری
زمانے سے جدا ہے شعر اپنا شاعری اپنی

-X-X-

ریاض جیوری

آج سے باون سال پہلے تک گوالیار ایک خود مختار سندھیا ریاست تھی۔ جیواجی راؤ اس کے حکمران تھے۔ اس ریاست کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں پرائمری اسکولوں میں ہر صبح پڑھائی شروع ہونے سے پہلے ایک دعائیہ نظم پڑھی جاتی تھی۔ جس اسکول میں، میں تھا اس میں تیسری جماعت سے آٹھویں جماعت تک کے سارے لڑکے ایک کھلے میدان میں سر جھکائے کھڑے ہوتے تھے۔ تین خوش گلو لڑکے اس نظم کو گاتے تھے۔ اس نظم کا آخری شعر یوں تھا۔

شان و شوکت سندھیا دربار کی قائم رہے
یہ حکومت چاند سورج کی طرح دائم رہے

اس نظم کے شاعر ماسٹر ریاض تھے جو ریاض جیوری کے تخلص سے مشہور تھے۔ وہ ان دنوں شہر سے دور، شہر کے اکلوتے ہائی اسکول میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ پرائمری اسکول، حضورات، میں آٹھویں پاس کر کے میرا داخلہ بھی اسی اسکول میں ہوا تھا۔

گول گورا چہرہ، میانہ قد، بھرا ہوا جسم، چوڑے پائنچوں کا گھٹنے سے اوپر پاجامہ، گرمی میں کسی موٹے کپڑے کا سوتی کوٹ، جاڑے میں اسی کوٹ کے نیچے روئی کی بنڈی اور ہاتھ میں ایک چھتری جو گرمی، سردی، برسات میں، بند ہوتی تھی چلنے میں چھڑی کا کام کرتی تھی۔ کھلتی تھی تو دھوپ اور پانی سے سر کی حفاظت کرتی تھی۔ اتنی دنیا دیکھ چکے تھے کہ اب چلنے

میں سوائے زمین کے کچھ دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کوئی آواز دے کر ٹوکتا تھا تو ایسی نظروں سے دیکھتے تھے جیسے کہیں دوردراز کے علاقے سے آرہے ہوں۔ ٹوکنے والے کے لیے وہ رکتے نہیں تھے، اسے خود ان کے ساتھ ہم قدم ہونا پڑتا تھا۔

ریاض صاحب (پیدائش 1899ء) کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کے والد جیور کے ایک زمین دار خاندان کے فرد تھے۔ نام حسام الدین تھا، شاعری کے لیے آزاد تخلص کا انتخاب کیا تھا۔ تخلص کی رعایت سے زندگی میں بھی ضرورت سے زیادہ آزاد طبع تھے۔ ریاض صاحب کو بچپن سے ہی زندگی نے آنکھیں دکھانا شروع کر دی تھیں۔ وہ جیور چھوڑ کر اٹاوہ آ گئے۔ اٹاوہ میں اسلامیہ ہائی اسکول میں تعلیم شروع کر دی۔ یہاں ان کے ہم جماعتوں میں انھیں کے ہم عمر ایک طالب علم تھے جو ان کے دوست بن گئے تھے۔ ان کا نام ذاکر حسین تھا، جو بعد میں ہندوستانی تاریخ میں صدر مملکت ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام سے جانے گئے۔

اسلامیہ ہائی اسکول، اٹاوہ، میں ذاکر حسین اپنی مقرری اور ریاض صاحب اپنی شاعری سے طلباء میں نمایاں تھے۔ وقت کے ساتھ ریاض انصاری کی شاعری اسکول ٹیچری تک آکر ٹھہر گئی اور ذاکر حسین کی مقرری سیاست کی عظمت بن کر نکھر گئی۔ دونوں کے حالات میں بھی کافی فرق تھا۔ ریاض صاحب غم روزگار کے مارے تھے۔ ذاکر صاحب اچھے گھرانے کے ستارے تھے۔ انھیں کا شعر ہے۔

حیات غمگیں کی تلخیوں کو اسی طرح خوشگوار کر لوں
خوشی نہیں سازگار مجھ کو، تو غم کو ہی سازگار کر لوں

ریاض صاحب نے بڑے سلیقے سے اپنے غموں کو سازگار کیا۔ وہ غموں سے ہارے نہیں غموں کو مسلسل ہرا کر زندگی کرتے رہے۔ تعلیمی سلسلہ غم روزگار سے منقطع ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ ملازمت میں رہتے ہوئے انھوں نے پہلے بی. اے کیا، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں، پھر فارسی میں ایم. اے کیا۔ لیکن ان ڈگریوں کے باوجود پرائمری اسکول سے ہائی اسکول کی مدرسی تک ہی پہنچ پائے، آگے نہیں بڑھ پائے۔

ایک دفعہ ذاکر صاحب گوالیار آئے تھے۔ ان کے وہاں مختصر قیام کے دوران، ان سے ملنے والوں کی جو سرکاری فہرست تھی، ان میں قاضی ریاض کا نام بھی تھا۔ اس فہرست میں ایک اجنبی نام کا اضافہ ذاکر صاحب نے اپنی قلم سے فرمایا تھا۔ ریاض صاحب ان سے ملے۔

ذاکر صاحب نے ان سے جب پوچھا۔ "قاضی صاحب آپ اتنی ڈگریوں کے ساتھ ابھی تک اسکول کے ٹیچر ہیں۔ آپ فرمایئے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" ذاکر صاحب حکومت ہندوستان کے ایک اہم رکن تھے۔ ان کے ایک اشارے سے ریاض صاحب کی ڈگریوں پر وقت کی جو دھول پڑی ہوئی تھی، وہ صاف شفاف ہو کر کسی بڑے ادارہ کی زینت بن سکتی تھیں، لیکن ریاض صاحب نے ان کی کرم فرمائی کے جواب میں مختصراً اتنا ہی کہا۔

"میرے لیے آپ صرف اتنا کر دیجئے کہ اردو زبان جو آزادی کے بعد سیاست کے نرغے میں ہے اس کی حفاظت فرمائیں۔ میری خواہش ہے میری زندگی تک یہ خوبصورت زبان وراثت کے طور پر نئی نسل کو ملے۔"

پتہ نہیں ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان کے درد کا ازالہ کیا یا نہیں، لیکن ریاض اپنے محدود وسائل اور دائرہ میں اس کا علاج ضرور کرتے رہے۔ وہ صبح سے شام تک ایک گھر سے دوسرے گھر تک بھٹکتے رہتے۔ طالب علموں کی رہنمائی فرماتے رہتے، بچوں کو اردو پڑھانے کے لیے والدین کو سمجھاتے رہتے، ادبی محفلیں سجاتے رہتے، دوسروں کو شاعر بناتے رہتے، لہک لہک کر اپنے اشعار سناتے رہتے۔

عمل میں اب یہ فریادیں بدل جائیں تو اچھا ہے
یہ آہیں جہد کے سانچے میں ڈھل جائیں تو اچھا ہے

ریاض صاحب نوح ناروی کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ شعر ترنم میں سناتے تھے، اور پہلے مصرعہ سے ہی ہنگامہ مچاتے تھے۔ آواز اچھی تھی۔ ترنم میں آج کل کی طرح گائیکی یا فلمی دھنوں کی آمیزش نہیں تھی۔ ان کا ترنم تسبیح کے دانوں جیسی چھوٹی چھوٹی گولائیاں بناتا ہوا مصرع کو اختتام تک پہنچاتا تھا۔ پورا مصرع اس طرح ایک سانس میں ادا کیا جاتا تھا۔ دوسرے مصرع میں پہلے لفظ سے ہی اونچے سروں میں رکتی بڑھتی گولائیاں قافیہ پر آکر ٹھہر جاتی تھی، ردیف بولتی ہوئی ہوتی تھی، اسے ساری محفل دہراتی تھی۔ جب داد سے محفل پر شور ہوتی تھی تو وہ چاروں طرف گھوم گھوم کر سلام کرتے رہتے تھے اور جب شور تھمتا تھا تو پھر سے پورے شعر میں سے صرف قافیہ اور ردیف کو ترنم سے دوبارہ سناتے تھے اور دوسرا شعر اسی سانس میں اٹھاتے تھے۔

ہر مشاعرہ میں شروع میں نوح صاحب کے دو تین شعر تبرکاً ضرور پڑھتے تھے۔

نوحؔ صاحب کے شعروں کی سادگی، برجستگی اور فارسی تراکیب سے آزاد شعری زبان سے ساری محفل جھوم اٹھتی تھی۔ جب اس طرح ماحول بن جاتا تھا تو ماسٹر ریاضؔ کا کلام بھی سامعین کو گرماتا تھا۔ امیر و داغؔ کے شاگردوں کا ایک وصف اپنے استادوں کے رنگ کلام کی تقلید بھی تھا۔ ہر شاگرد اپنے کلام کو استاد کے کلام سے ہم رنگ کرنے کو شاعری کا معیار سمجھتا تھا۔ داغؔ اور امیرؔ کی روایت جو تین چار شعری نسلوں سے گزر کے، اولاد حسین توبہ، سکھ دیو پرشاد بسمل، دعاؤ بائیوی، ریاض جیوری اور امید فاضلی تک پہنچی تھی، ان میں سب ہی اپنے اپنے مزاج کے مطابق، پیروئ اُستاد کرتے نظر آتے ہیں، یہ اور بات ہے یہ پیروی کلام کے خارجی روپ کی ہوتی ہے، الفاظ کے پیچھے جو شخصیت کار فرما ہوتی ہے، وہ اس تقلیدی رویہ میں شامل نہیں ہو پاتی۔ لیکن ادب میں اس روایت نے زبان و بیان کی خوش سلیقگی، سیدھے رواں مصرعوں کی خوش آہنگی، قافیہ اور ردیف کے جڑاؤ کی شائستگی کو ضرور زندہ رکھا ہے، جن سے آج کے ہکلاتے ہوئے لہجے اور لفظوں کے غیر غنائی جھٹکے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ریاض صاحب کے اس قسم کے شعر ہیں۔

لطف نہیں، سکوں نہیں، چین نہیں، خوشی نہیں
یہ بھی ہے کوئی زندگی یہ کوئی زندگی نہیں

مانا کہ جور حد سے سوا کیجیے گا آپ
جب یہ بھی کر چکیں گے تو کیا کیجیے گا آپ

شبِ ماہ میں گھر سے نکلو نہ باہر اوپر سے سویرے اکیلے دُکیلے
کہیں ہو نہ جائیں تصدق ستارے، کہیں چاند رخ کی بلائیں نہ لے لے

ادھر خوف انھیں اپنی رسوائیوں کا، ادھر ڈر ہمیں اپنی بدنامیوں کا
پڑے یاد کرتے ہیں اک دوسرے کو اُدھر وہ اکیلے ادھر ہم اکیلے

اس رنگ کی شاعری کے ساتھ بعد میں ان کے کلام میں بدلتے ہوئے سماج اور سیاست کے رسم و رواج بھی در آئے تھے لیکن یہ ان کے یہاں شعوری تبدیلیوں کی طرح تھیں، ان کی شعری طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔ انھوں نے خود بھی کہا ہے:

ہر چند اب بدل گئی طرزِ غزل ریاضؔ
میں اپنے ذوق و رنگِ طبیعت کو کیا کروں

داغ اور امیر کی غزل کی محبوبہ بازارِ حسن کی زینت تھی۔ حیدر آباد میں تو داغ کی محفل آرائی کے لیے بہ یک وقت کئی طوائفیں ملازم تھیں۔ ان کے شاگرد اور ان کے شاگردوں کے شاگرد بھی اس روایت کے تحت غزل کے لیے بازارِ حسن کی سیر و سیاحت کو جائز سمجھتے تھے۔ ریاض صاحب بھی جب اٹاوہ سے منتقل ہو کر گوالیار کے کسی قصبہ میں برسرِ روزگار تھے، تو گھر میں بیوی کے ہوتے ہوئے، کسی حسن بالائے بام کے شکار تھے۔ ان کے مخالفین نے ان کی اس جسارت کی شکایت حکومت تک پہنچادی۔ اسکول کے استاد کی یہ حرکت قابلِ ملامت سمجھی گئی۔ جب یہ شکایت ملازمت کے لیے خطرہ بن گئی تو ماسٹر ریاض نے اپنے کسی ڈاکٹر دوست سے سرٹیفکیٹ لے کر پیش کر دیا۔ اس سرٹیفکیٹ میں تصدیق کی گئی تھی کہ وہ طبی لحاظ سے معذور ہیں اور عورت اور مرد کے رشتے سے قدرتی طور پر دور ہیں۔ یہ جھوٹا سرٹیفکیٹ، جو نوکری کو بچانے کے لیے بنوایا گیا تھا ماسٹر ریاض نے اسے سچ بنا کر زندگی بھر نبھایا۔ مہاتما بدھ نے صاحبِ اولاد ہونے کے بعد سچائی کی خاطر سنیاس لیا تھا، انھوں نے بے اولاد ہو کر ملازمت کی خاطر بن باس لیا تھا۔ اولاد کی اس جبریہ محرومی نے شہر کے سارے بچوں کو ان کی اولاد بنا دیا تھا۔ اسکول میں غریب طالب علموں کی فیس سے لے کر ان کی کاپی، پنسل اور کپڑوں کے اخراجات ان کی محدود تنخواہ سے پورے ہوتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کی رشتہ داریاں یونہی جاری رہیں۔

ان کا گھر جو ایک سادے سے ورانڈے اور کمرہ پر مشتمل تھا، رات دن پڑھنے لکھنے والے لڑکے لڑکیوں سے بھرا رہتا تھا۔ ریاض صاحب کی بیگم ذرا اونچا سنتی تھیں۔ ان کی صحبت میں ریاض کو بھی اونچی آواز میں بات کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ان کی اس عادت سے باہر بیٹھے ہوئے مہمانوں کو، ان کے کہے بغیر، گھر کے اندر کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا اور وہ اکثر ریاض صاحب کے باہر آنے سے پہلے بنا چائے پیئے رخصت ہو جاتے تھے۔ ان کا راشن، دودھ اور چائے کی پتی کا بڑا حصہ ان لڑکے لڑکیوں پر خرچ ہوتا تھا جو ان سے بنا کسی معاوضہ کے پڑھنے آتے تھے۔ ان کی خاطر مدارت میں ریاض صاحب کی اہلیہ بھی ہر وقت مصروف نظر آتی تھیں۔ ان کی شفقتیں مٹھائی یا بالائی بن کر مجھے اکثر لبھاتی تھیں۔ ریاض صاحب شاعر ہونے کے ساتھ علم الحساب کے بھی ماہر تھے۔ انھیں پانچ ہزار تک کے پہاڑے یاد تھے۔ کوئی بھی پہاڑہ جیسے 3174 یا 1334 یا اور کوئی پوچھ لیجیے وہ برقی مشین کی

طرح فور اُفر فرساتے تھے۔

9 جولائی 1974ء کے روز، یہ خوش گلو شاعر، اُردو کا پرستار، طلباء کے خیر خواہ، اپنے پرائے سب کا ہم درد، ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ وہ چلے گئے لیکن ان کے گھر کے سامنے کی چھوٹی سی مسجد، اس کے برابر کھڑا جامن کا پیڑ، ورانڈے میں پڑا بڑا سا لکڑی کا تخت اور شہر کے بہت سے طالب علموں کے ساتھ وہ اب بھی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور مسکراتے ہوئے سمجھاتے ہیں۔

جنگ ظلمت سے رہے گی میرے نور فکر کی
میں چلا جاؤں گا لیکن روشنی رہ جائے گی

-X-X-

شفا گوالیاری

شفا صاحب کا دواخانہ بھوپال میں، اتوارے کے مشہور چوراہے کے دائیں جانب ایک چھوٹی سی دوکان میں تھا۔ اس کے آگے کچھ فاصلے پر گرلس کالج تھا۔ صبح سے شام تک لڑکیاں سامنے سے گزرتی تھیں اور ادھیڑ عمر کی شاعری میں نکھرتی تھیں۔

جبیں پہ بکھرے ہیں کچھ ستارے حسین رخ پر نکھار سا ہے
نہیں وجود بہار لیکن تمام عالم بہار سا ہے (اسد بھوپالی)

تیرا چہرہ صبح کا تارا لگتا ہے
صبح کا تارا کتنا پیارا لگتا ہے (کیف بھوپالی)

یوں تو اُن کی بزم میں جانے کو دنیا جائے ہے
اک مجھی کو دیکھ کر ماتھے پہ بل آجائے ہے (شفا گوالیاری)

اس سڑک کے کنارے دواخانے میں شفا صاحب ڈاکٹر، کمپاؤنڈر اور مالک سبھی کچھ تھے۔ اُن کے اس کلنک میں مریض کم آتے تھے، نئے پرانے شاعر اپنا کلام زیادہ سناتے تھے۔ اگر کسی کی غزل خوانی کے درمیان کوئی مریض آ بھی جاتا تھا تو اس سے اشارے سے غزل کے ختم ہونے کا انتظار کرنے کو کہا جاتا تھا۔

یہاں اکثر ادیب و شاعر چائے پینے، پان کھانے اور گپ شپ لڑانے بھی آتے تھے۔
ایک بار کیف بھوپالی اپنی ترنگ میں ادھر آ نکلے تھے۔ شفا صاحب کا نیا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا تھا۔ کیف کو دیکھ کر انھوں نے فوراً اپنی میز کی دراز سے اس مجموعے کی ایک کاپی نکال کر انھیں پیش کی۔ اس میں ان کی ایک تصویر تھی جس میں وہ اپنی بند مٹھی بائیں گال پر لگائے مسکرا رہے تھے۔ شفا نے جب کیف سے اس پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی تو وہ فوراً راضی ہو گئے، اور جیب سے قلم نکال کر لکھنا شروع کر دیا۔ ان کا پہلا جملہ تھا۔
"شفا صاحب کے شعری مجموعے میں ان کی خوبصورت تصویر کو دیکھ کر مجھے ایک فلمی گیت یاد آتا ہے۔ "ننھے منے بچے تیری مٹھی میں کیا ہے۔" ان کا تحریر کردہ اس شریر جملے کو پڑھ کر پاس بیٹھے ہوئے سارے احباب بلند آواز میں ہنسنے لگے۔ شفا اس مذاق پر جھلا کر کہہ رہے تھے۔ ان کا تخاطب کیف تھا۔ محترم، اس مٹھی میں بہت کچھ ہے۔ سیماب اکبر آبادی کی فارغ الاصلاح کی سند ہے۔ پچاس پچپن سال کی شعری مشاقی ہے، سیکڑوں ادبی رسائل میں کلام کی اشاعت ہے، بے شمار کامیاب مشاعروں کی صدارت ہے، پانچ سو سے زیادہ شاگردوں کی تربیت ہے۔ آپ گھر جا کر، بھوپالی اور غیر بھوپالی کے تعصب سے آزاد کر اس مٹھی کو کھولیے اور موتی رولیے۔
ماحول کافی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ کیف خاموشی سے اٹھ کر چل دیے اور شفا انتظار کرتے مریضوں کا معائنہ کرنے لگے۔ وہ مریضوں کے نسخے بھی لکھتے جا رہے تھے اور اپنے شاگردوں سے گفتگو بھی فرما رہے تھے۔
"یہ مجھ سے جلتے ہیں، اس لیے کہ میں گوالیار سے لٹ پٹ کے یہاں کیوں بسا ہوں۔ یہ مجھ سے ناراض ہیں اس لیے کہ میں بہت سوں سے اچھا کہتا ہوں، یہ مجھ سے حسد رکھتے ہیں اس لیے کہ میری شاعری کے مداح ملک کے مستند اشخاص ہیں۔ ان کے لیے میں صرف اتنا ہی کہوں گا۔

بات جب ہے شاہکار زندگی بن کر رہے
آدمی جوہر شناسِ آدمی بن کر رہے

شفا صاحب سے ایسی چھیڑ خانیاں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ ان کی شہرت طلبی اور ضرورت سے زیادہ خود ستائشی تھی۔ شمع ادب لکھنؤ کے شفا نمبر میں انھوں نے جو

مختصر سوانحی خاکہ لکھا تھا اس میں اپنے بارے میں ان کی رائے کچھ ایسی ہی ہے۔ وہ کلام کے تعلق سے بہت جذباتی تھے۔ ان کی دوستی، دشمنی اسی سطح پر قائم ہوتی تھیں۔ ان کی گفتگو کا موضوع ہمیشہ شفا گوالیاری ہی ہوتا تھا۔ دوسروں سے اپنے بارے میں لکھوانا، ہر چھوٹے بڑے رسالے میں کلام چھپوانا، مشاعروں میں اپنے تن و توش سے دوگنی بلند آواز میں کلام سنانا، دوسروں کی شاعری کے عیوب گنوانا اور نئے نئے شاگرد بنانا ان کے شب و روز کے معمولات تھے۔ شفا صاحب کے بیشتر شاگرد اپنے تخلص کے ساتھ "شفائی" لگاتے تھے۔ ایک عرصہ تک مشہور شاعر قتیل شفائی کو بھی لوگ انھیں کے شاگردوں میں شمار کرنے کی بھول کرتے تھے۔ جب قتیل کو اس بھول کا علم ہوا تو انھوں نے ایک رسالہ میں اس کی پرزور تردید کی۔ شفا نے اس تردید کو پڑھ کر کہا تھا۔ یہ سچ ہے وہ میرے شاگرد نہیں ہیں، لیکن ان کے کلام کو دیکھ کر یہ ضرور محسوس ہوتا ہے، انھیں کسی استاد کی ضرورت ہے، اچھا ہوا انھوں نے خود صفائی پیش کردی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو میں خود اس کا اعلان کرنے والا تھا۔ کیوں کہ فن شناس حضرات ان کے تخلص میں 'شفائی' کے جزء ہونے سے میری استادی پر شک کر رہے تھے۔

شفا اپنے دور کے مشہور شاعر تھے۔ ان کا شمار علامہ سیماب اکبر آبادی کے ممتاز شاگردوں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے 1924ء میں شاعری شروع کی، اور 1940ء میں حلقہ سیماب کے رکن بنے۔ لیکن اپنی ریاضت اور ذہانت سے پانچ سال کی مختصر سی مدت میں ہی فارغ الاصلاح ٹھہرائے گئے۔ اُن کے شاگردوں کی کثیر تعداد کو سراہتے ہوئے تلوک چند محروم نے لکھا ہے۔

"شفا صاحب نے فن کی باریکیوں کو آئندہ نسلوں تک محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ ہی کارنامہ آئندہ زمانوں تک ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ علامہ سیماب کے چراغ سے انھوں نے اپنا چراغ جلایا ہے، ان کے شاگردوں نے ان کی روشنی سے اپنا راستہ سجایا ہے۔"

سیماب اکبر آبادی نے ان کے بارے میں اپنی سند میں لکھا تھا۔ "شفا گوالیاری میرے عزیز شاگرد ہیں۔ فن شاعری میں ان کی محنت اور ذہانت نے انھیں بہت جلد معتبر بنا دیا ہے۔ ان کا کلام خوب ہے اور عیوب سے پاک ہے۔" دعا ڈبائیوی کی ان کے بارے میں رائے تھی "شہرت و ناموری کے لحاظ سے، گوالیار کا کوئی نیا یا پرانا شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

شفا صاحب بہت زود گو شاعر تھے۔ انھوں نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کی حیات میں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے تھے۔ ان میں آیاتِ شفا، نبضِ حیات، شاخ زیتون اور پرچم اردو اپنے زمانے میں خاصی مشہور کتابیں تھیں۔ پرچم اردو کئی صفحات پر مشتمل ایک طویل نظم ہے جس میں نام بہ نام ان ادیبوں اور شاعروں کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا جن کی کاوشوں نے اردو زبان کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

شفا صاحب ترقی پسند تحریک میں تو شامل نہیں تھے، لیکن اپنے استاد بھائی نازش پرتاپ گڑھی اور اعجاز صدیقی کی طرح ان کی شاعری پر بھی اُن تبدیلیوں کے اثرات نمایاں تھے جن سے کسی نہ کسی سطح پر یہ تحریک ہم رشتہ تھی۔ سیماب کا شعری مزاج، داغ کے برعکس سماجی و تہذیبی تھا۔ انھوں نے اپنے شعری رویہ کے بارے میں خود ایک جگہ تحریر کیا ہے۔

"اوائلِ مشقِ سخن تک مجھے قدیم تغزل سے دلچسپی تھی، لیکن زمانے کے ساتھ علم و معلومات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا، رنگ قدیم سے لگاؤ کم ہوتا گیا۔ اب شاعری میں فلسفہ، حقائق و معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت اور اس کے متعلقات ہوں۔" سیماب کی طرح سیماب کے شاگردوں نے بھی ادب میں مقصدیت کو اپنی منزل بنایا تھا۔ شفائی شاعری کا مجموعی مزاج بھی افادی و سماجی ہے۔ ان کے یہاں افادیت، شعریت کی قیمت پر اظہار کو سماجی اور اصلاحی کردار عطا کرتی ہے۔ اس میں جذبہ واحساس کی کمی کو لفظوں کے برمحل استعمال، برجستگی کے جمال، اور فنی کمال سے پورا کیا گیا ہے۔ وہ علامات و استعارات کی پیچیدہ بیانی پر راست روانی کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کی غزل ہو یا نظم، تخلیق و قاری کے راست رشتے کا آئینہ دار ہے۔

کوئی پھولوں سے سیکھے سر فرازِ زندگی ہونا
وہیں سے پھر مہکتے ہیں جہاں سے خاک ہوتے ہیں

گھسا ہر در پہ سر تو نے نہ پہچانا مقام اپنا
ارے بدبخت کرتا سب سے پہلے احترام اپنا

چمن کچھ اور بھی ہیں دشت و در کچھ اور بھی ہیں
رہِ جنون میں نقوشِ سفر کچھ اور بھی ہیں

مریضِ غم پہ توجہ کا شکریہ لیکن
فراضِ تنگہ چارہ گر کچھ اور بھی ہیں
نہ روک موجِ تبسم کو تیری محفل میں
فسردہ لب، تپیدہ جگر کچھ اور بھی ہیں

شفاؔ نے کلاسیکی شائستگی میں عصری سنجیدگی کی شمولیت کو اپنا معیار بنایا تھا، اور اس میں ادب اور مشاعروں میں اپنا کمال دکھایا تھا۔ وہ باہوش شاعر تھے۔ وہ دل سے زیادہ عقل کے فن کار تھے۔ انھیں اپنی شاعری سے اتنا پیار تھا کہ دوسروں کے کلام پر ان کی نظر مشکل سے پڑتی تھی۔ ان کی اس نرگسیت کا لوگ باگ مذاق بھی اڑاتے تھے لیکن وہ اپنی سرشت سے مجبور تھے۔ وہ جب تک جاگتے تھے شعر سازی میں محو رہتے تھے۔ وہ چاہے کوئی بھی کام کر رہے ہوں، مریضوں کو دیکھ رہے ہوں یا شاگردوں کا کلام سن رہے ہوں، ان کا اپنا کوئی شعر، رباعی، قطعہ یا نظم ان کے ذہن میں تعمیر ہو رہی ہوتی تھی۔ وہ مسلسل اور پابندی سے ہر روز کچھ نہ کچھ لکھنے والے شاعر تھے۔ ان کا سرمایہ جو ان کی کتابوں میں دستیاب ہے، اس سے کہیں زیادہ طباعت سے محروم ہے۔ شفاؔ کے والد یوپی میں فرخ آباد کے مشہور حکیم تھے۔ وہ اپنے والد حکیم سید اوج علی کے ساتھ بچپن میں ہی سندھیا ریاست میں آئے تھے اور پھر یہیں اپنے ایک قریبی رشتہ دار کے ساتھ رہنے لگے۔ عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم مفتی شہر کے دینی مدرسہ میں حاصل کی، اس کے بعد سرکاری اسکول میں داخلہ لیا، لیکن حالات نے میٹرک سے آگے نہیں پڑھنے دیا۔ مجبوراً کمپاؤنڈری کا سرٹیفکیٹ پاس کر کے ایک سرکاری ہسپتال میں ملازم ہو گئے۔ والد کی حکمت یونانی تھی، بیٹے کی طبابت انگلستانی تھی۔ میرے بچپن کی یادوں میں شفاؔ صاحب دو دوائیوں کے کردوپ میں محفوظ ہیں۔ ایک کا نام کوفین تھا جو بڑے سے کانچ کے جار میں بھرا ہوتا تھا اور دوسری سفید رنگ کے پاؤڈر کی صورت میں تھی جس کا نام اب میں بھول چکا ہوں۔ ہاں اتنا ضرور یاد ہے، کہ ان کے پاس میں جب بھی جس مریض کو لے کر بھیجا جاتا تھا، انھیں دو دوائیوں کو لے واپس آتا تھا۔ یہ دوائیاں ضرورت سے زیادہ کڑوی ہوتی تھیں، شاید اسی تلخی سے ڈر کر مرض بدن چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ جب وہ سن 1947ء میں گوالیار چھوڑ کر بھوپال میں پناہ گزیں ہوئے تب بھی ان کے علاج کا یہی طریقہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا، پہلے وہ خود میٹھے تھے ان کی دوائیاں کڑوی تھیں،

لیکن اب دوائیوں کے ساتھ وہ خود بھی کڑوے ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ بھوپال کے مقامی شعراء کا وہ رویہ تھا جسے وہ حاسدانہ سازشوں کا نام دیتے تھے۔ یہاں ایک طرف وہ اور ان کے شاگرد تھے اور دوسری طرف ان کے مقابلہ میں پورا بھوپال تھا۔ لیکن تاحیات وہ حاسدوں سے ٹکراتے رہے، شہرتیں کماتے رہے، مسلسل شعر گوئی سے حریفوں کو نیچا دکھاتے رہے اور انھیں کے ساتھ دو بیویوں اور کئی بچوں کی رات دن کی الجھنوں کو بھی سلجھاتے رہے۔

ہمارا پوچھنا کیا ہم وہ جاں باز محبت ہیں
ہماری موت میں بھی اک ادائے زندگی ہوگی

بیج میں سمٹے شجر سے

میں نے کب چاہا بتاؤ
بیج میں سمٹے شجر سے
پھول توڑوں
حظ اٹھاؤں
یا کبھی
اس کے پھلوں سے
لذت کام و دہن
حاصل کروں
یا اس کے سائے میں
کبھی سستاؤں دم بھر

صرف یہ خواہش ہے میری
آب و گل میں بیج ڈالوں
اور پھر
اس کو
شجر بنتے ہوئے دیکھوں

پروفیسر صادق
A.G.1/47C-وکاس پوری
نئی دہلی-110018

روح کے اور بھی بندھن ہیں

جاتی رات
اور آتے دن کے
وسط میں! جاناں!
بس اک پلک کا لمحہ ہے
اس بھیانک لمحے میں
اکثر مجھ کو بھولی بھٹکی
روح اک ملنے آتی ہے
آنکھ میری گھبراتی ہے
روح لیکن مسکاتی ہے
جس لمحے میں آگے بڑھ کر
اس کو چھونے لگتا ہوں
بس اس پلک کے لمحے میں
وہ غائب ہو جاتی ہے
دھیرے سے کہہ جاتی ہے
روح کے اور بھی بندھن ہیں

سرفراز تبسم

التجا

اب نہ چہرے پہ اجالا
نہ گریباں میں سحر
آنکھیں خاموش بتوں کے مانند
یاس بادل کی طرح چھائی ہوئی
راہیں گھبرائی ہوئی!

⌘

ایک اک آنکھ نے پڑھ لی
وہ عبارت یارو
جو مرے چہرے پہ قسام ازل نے لکھی
اس عبارت کا ہر اک لفظ بنا ہے کاسہ
میں سوالی نظر آنے لگا
سر تا بہ قدم!!

⌘

آنکھیں خاموش
بتوں کی مانند
چاہتا ہوں کہ برس جائیں یہ آنکھیں
کھل کر
جسم تازہ ہو تو شاید ہو شگوفے کی نمو
جبر کی دھوپ میں بھی
ہنس پڑیں خوابوں کے کنول
میرے چہروں پہ جو لکھی ہے عبارت
اس کے
ایک اک لفظ کے چہرے پہ اجالا ہو
گریباں میں سحر!

⌘

التجا کرتا ہوں
اس قادر مطلق کے حضور
گنبد شب میں مہ و نجم سجائے جس نے
شہر دل میں نہ سہی چاند ستارے لیکن
اس کی دیواروں کے حصے میں دریچہ دے دے
لالہ و گل کی ضرورت نہیں اس گلشن کو
تو اگر دے تو کوئی پھول سا چہرہ دے دے
جسم بخشے ہیں تمناؤں کو جب پتھر کے
دست امید میں ساغر نہ دے
تیشہ دے دے!!

ڈاکٹر علی عباس امید
ولبھ بھون، بھوپال۔ 462004

"آس"

میرے ہاتھ کی لکیروں میں
اک نام بسا ہے ایسا بھی
جو دور نسبت ہی بہت ہے
اور آنکھ سے او جھل رہتا ہے
لیکن یہ میں جانتا ہوں
وہ آنکھ سے او جھل ہو تو ہو
وہ دل کے پاس ہی رہتا ہے
وہ میرے اندر رہتا ہے
میں اس میں زندہ رہتا ہوں
میں جب بھی پیار سے ہنستا ہوں
وہ پیار سے مجھ میں ہنستا ہے
میں جب بھی دکھ سے روتا ہوں
وہ میرے آنسو پونچھتا ہے
ہم دونوں ہی کچھ پاگل ہیں
اک دوجے کے کچھ خواب لئے
ہم آگے بڑھتے رہتے ہیں
اک دوجے کی آس لئے
ہم دیکھو اب تک زندہ ہیں

ایم. آئی. ساجد
Postfach 1249, D-79782
Lauchringen (Germany)

"صبح شام رات"

رات
بہت سنگین تھی
لیکن
صبح نے بھی
میرے بدن پر
درد کا پتھر مارا
شام بھی شاید
حملہ کرے گی

"ناامیدی"

اب
کس موسم سے
آس رکھوں میں
موسم گل تو
آتا ہے
زخم نیا دے جاتا ہے

"حویلی"

خاموشی میں
ڈوبی ہوئی ہے
منظر اونگھ رہے ہیں
جام و صراحی
میز پہ خالی پڑے ہوئے ہیں
تاریکی ہی تاریکی ہے
کوئی نہیں قندیل بھی
روشن کرنے والا

قربان آتش کھیتار محلہ، آرا ۔ ۸۰۲۳۰۱

سمندر کا راستہ

جھیل
جہاں سے میں لوٹا تھا
صدی پہلے
وہاں واپس پہنچنا چاہتا ہوں
جھیل
میں جانتا ہوں
تم سمندر نہیں ہو
میں کولمبس نہیں ہوں
مجھے تمہارے سوا
کوئی اور راستہ نہیں معلوم
دنیا کے گھمسان میں کھویا رہا ہوں
اب
اچھا نہیں لگتا کچھ بھی
صدی کے بعد لوٹا ہوں
میں
اپنی ذات میں واپس لوٹنا چاہتا ہوں
جھیل
تم میری مدد کرو
بتاؤ نا
سمندر کا راستہ
کس طرف کو جاتا ہے

تیری سنگت

زلفوں کی خوشبو
اندر تک
اتر رہی ہے
ہوائیں
سرسرا رہی ہیں
ہڈیوں میں کوئی
راگ بج رہا ہے
یہ
طبلہ
خاموش ہے بہت
ساون کی پھواروں کی تھاپ تیز ہے
تم آؤ
میرے سنگیت کو
سنگت دینے کے لئے

شہاب اختر
کلکتہ کلاتھ اسٹور، کیڑاپٹی،
جھریا، دھنباد۔ 828111

اقبال انصاری

اس کا درد

"ہاں گلریز بھائی...... لایئے آپ کی کہانی مکمل کرتے ہیں۔" قاسم نے کہا اور میز سے ڈائری اور قلم اٹھالیا۔

گلریز نے کہا۔ "پڑھو، آخری جملہ کیا لکھا تھا۔"

قاسم نے ڈائری کھولی، اور اوراق پلٹے، پھر ایک صفحہ پر نگاہ جما کر پڑھنا شروع کیا۔

"کلاڈیا نے کہا...... ہندوستانی ملک کی یہ تاریخ کم پہلودار اور کم تہہ دار نہیں ہے۔"

گلریز بولا۔ "لکھو...... ابتدا سے جمالیاتی تصورات کا سفر جاری رہا ہے......"

گلریز بولتا رہا اور قاسم لکھتا رہا۔

گلریز ادیب تھا۔ کہانیاں تخلیق کرتا تھا، پھر انہیں ڈکٹیٹ کر دیتا تھا۔ کوئی بھی...... اس کے والد اس کی والدہ، اس کی چھوٹی بہن سائرہ، اس کا بہنوئی قاسم...... جو بھی موجود ہوتا ڈکٹیشن لے لیتا۔

گلریز کا دایاں ہاتھ کہنی سے درمیانی انگلی تک صرف آٹھ انچ کا تھا اور خشک تھا۔ پورا پنجہ، خاص کر انگلیاں زیادہ پتلی خشک اور میڑھی تھیں۔ ہاتھ کی پشت پر پتلی پتلی ہڈیوں پر جو کھال تھی وہ بھی معمول سے بہت زیادہ باریک تھی۔ اتنی باریک کہ ہڈیوں کی سفیدی کو بڑی وضاحت سے عیاں کرتی رہتی تھی۔ اس ہاتھ سے وہ چھوٹا موٹا اور ہلکا پھلکا کام تو کر لیتا تھا، لیکن لکھ نہیں سکتا تھا...... انگلیاں قلم کو گرفت میں لینے کے لائق ہی نہیں تھیں۔ بایاں ہاتھ پوری طرح سے نارمل تھا، مگر باوجود انتہائی کوشش کے وہ کبھی بائیں ہاتھ سے لکھ نہیں سکا، اس لیے لکھائی کے واسطے کسی دوسرے کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔

دو ہی بھائی بہن تھے۔ گلریز کی عمر تیس برس تھی۔ معمولی صورت شکل اور غیر

پتہ : الف 176۔پانڈو نگر، دہلی۔ 110091

معمولی ذہن کا مالک تھا۔ کہانیاں ملک کے اچھے پرچوں میں شائع ہوتی تھیں۔ اس کی کہانیوں کی کافی ڈیمانڈ تھی۔ مگر وہ تمام رسائل کی فرمائش پوری نہیں کرپاتا تھا۔ اس کے پاس میٹر تو بہت تھا، ڈھیروں کہانیاں بھی ذہن میں جنم لیتی رہتی تھیں، لیکن کاغذ پر اتر کم پاتی تھیں۔ جب کوئی وقت دے دیتا تھا تو کہانی کاغذ پر اتر آتی تھی۔ ورنہ دل مار کر رہ جاتا تھا۔ یہ اس کا درد تھا، اور اپنے درد کا اظہار وہ کبھی نہیں کرتا تھا۔

کہانیاں لکھنا اس کا شوق تھا۔ پیشہ تدریس تھا۔ ایک مقامی کالج میں کیمسٹری پڑھاتا تھا۔ کیمسٹری میں ہی ڈاکٹریٹ لی تھی۔ والد ایک سینئر سیکنڈری اسکول میں پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے، اور پڑوس کے ریٹائرڈ ماسٹر رام رتن کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ سائرہ چوبیس برس کی تھی۔ وہ بھی گلریز کی طرح معمولی صورت شکل کی تھی۔ مگر اچھی لگتی تھی۔ بڑا کھلا کھلا سا چہرہ تھا، جلد نہ بہت گندمی رنگ کی تھی نہ سانولی۔ پچھلے برس قاسم سے شادی ہوگئی تھی اور اب قاسم کے ساتھ اس کے دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی تھی۔

قاسم سیدھا سادہ ستائیس اٹھائیس برس کا، اوسط قد اور اوسط جسم، نوکیلی ستواں ناک اور بڑی بڑی کالی آنکھوں والا جوان تھا۔ لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ ٹھنڈے مزاج اور مثبت سوچ والا شخص ہے۔ پہلی بیوی کا انتقال شادی کے آٹھ ماہ بعد ہی ہوگیا تھا۔ بیوی دارجلنگ میں ایک پہاڑی سے پھسل کر سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں جاگری تھی۔ قاسم قریبی پگوڈا کے لاماؤں کے ساتھ جب نیچے پہنچا تو کلثوم کی ٹوٹی پھوٹی لاش ملی۔ کئی مہینے تک قاسم گم صم رہا، پھر رفتہ رفتہ نارمل ہوگیا اور سائرہ سے شادی کرلی۔ ماں باپ کا انتقال ہوچکا تھا، کوئی بھائی بہن بھی نہیں تھے۔ ردی کاغذ کباڑیوں سے خرید کر ساون پور کے کاغذ مل کو سپلائی کردیتا تھا۔ کاروبار کچھ زیادہ اچھا نہیں چلتا تھا، مگر قاسم مطمئن تھا۔ بچوں کی طرح اکثر سائرہ کی شکایت اس کے ممی پاپا اور گلریز سے کیا کرتا تھا۔ ”ممی! دیکھئے، آج پھر مجھ سے ناراض ہوگئیں۔ اب دکان سے آنے میں دیر ہوگئی تو یہ کوئی اتنا بڑا گناہ تو نہیں۔“ یا ”پاپا، میری تو یہ سنتیں نہیں، آپ ہی ڈانٹ کر کہیے کہ سیب کھالیا کریں۔ میں تو اتنی محبت سے ان کے لیے لاتا ہوں، یہ کھاتی نہیں ہیں، پڑے پڑے سڑتے رہتے ہیں۔“ یا ”گلریز بھائی آپ ہی سمجھایے نہ اپنی لاڈلی بے بی کو کہ وقت سے دودھ پی لیا کریں۔ میں تو صبح جلدی چلا جاتا ہوں

دکان...... یہ مستی میں...... "یا" ممی، میں نے دولاکھ کا بیمہ اپنا کرایا ہے، دولاکھ سائرہ کا، اور یہ ہیں کہ مجھ سے لڑ رہی ہیں کہ......"

ایک دن جھجکتے جھجکتے اس نے پاپا سے کہا "پاپا مجھے بیس ہزار کی ضرورت ہے۔ اگر آپ انتظام کر دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ میں تین مہینے میں واپس کر دوں گا...... نہیں واپس تو آپ کو لینے پڑیں گے، اسی شرط پر لوں گا۔" پاپا نے اگلے دن بینک سے بیس ہزار نکلوا دیے۔ قاسم نے دو ماہ بعد واپس کر دیے۔

ایک بار اس نے پچاس ہزار روپے پاپا سے لیے۔ دو مہینے کے وعدے پر لیے۔ ڈیڑھ مہینے بعد واپس کر دیے۔ کہیں سیر سپاٹے کا پروگرام بنتا۔ رات کا کھانا سب لوگ کہیں باہر ہی کھاتے۔ پھر ادھر سے ہی قاسم سائرہ کو لے کر اپنے فلیٹ پر چلا جاتا۔

اس دن اتوار تھا اور سائرہ کی سالگرہ تھی۔ قاسم اور سائرہ حسب معمول آئے ہوئے تھے۔ قاسم نے صبح اٹھتے ہی اپنے بیگ میں سے ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکالی اور سائرہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ہیپی برتھ ڈے ڈارلنگ"

"اوہ...... تھینک یو!" سائرہ چہک کر بولی۔ "یہ کیا ہے؟"

"کھول کر دیکھو۔" قاسم نے اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

سائرہ نے ڈبیہ کھولی۔ باریک سی نوز رنگ (Nose-Ring) تھی۔

وہ 1971 کا سال تھا، اور اس زمانے میں باریک سی نوز رنگ کا فیشن زوروں پر تھا۔

"اوہ، تھینک یو قاسم ڈیئر۔" سائرہ کھل گئی "اٹ از سوئٹ آف یو" کہہ کر سائرہ نے نوز رنگ ناک میں ڈال لی اور اٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ چھوٹی سی پیاری سی رنگ تھی۔

"چار سو سے کم کی نہیں ہوگی" سائرہ بولی۔

"ہو...... تم قیمت کی پرواہ مت کرو۔" قاسم نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تمھیں پسند ہے کہ نہیں؟"

"پسند!" سائرہ چہک کر بولی "I ADORE IT" ٹھہرو، میں سب کو دکھا کر آتی ہوں۔"

سبھی نے نوز رنگ پسند کی۔

دوپہر کا کھانا گھر پہ ہی کھایا گیا۔ شام کا کھانا ایک ریسٹورنٹ میں۔

نو بجے قاسم نے کہا۔ "تھینک یو پاپا، تھینک یو گلریز بھائی۔ ہم اب چلیں گے۔ مجھے صبح جلدی ہی اٹھ کر ساون پور جانا ہے۔"

ریسٹورنٹ سے ہی قاسم اور سائرہ ایک تھری وہیلر میں بیٹھ کر فلیٹ کی طرف چلے گئے۔ گلریز وغیرہ اپنے فلیٹ کی طرف چلے آئے۔

گلریز کو یہ خبر دوسرے دن صبح دس بجے کالج میں ملی کہ سائرہ بری طرح جل گئی ہے۔

وہ ایک تھری وہیلر لے کر قاسم کے فلیٹ پر پہنچا۔

باہر ہی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ قاسم کا، سائرہ کے گھر والوں کا اور پولیس کا انتظار تھا۔ گلریز کو سارے پڑوسی پہچانتے تھے۔ کسی پڑوسی ہی نے اسے کالج میں فون کیا تھا۔

اسے دیکھ کر سبھی خاموش ہو گئے لوگوں نے اسے آگے بڑھنے کے لیے راستہ دیا۔

وہ دروازہ کھول کر اندر پہنچا۔

سائرہ کچن کے فرش پر تھی۔

اسے دیکھ کر پہلا خیال جو گلریز کے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ اذیت نہ اس سے زیادہ مجسم ہو سکتی ہے نہ اس سے زیادہ واضح، اور دوسرا خیال یہ آیا کہ یہ لڑکی زندہ رہ کر اتنا بھیانک ظلم اپنے آپ پر کیوں کر رہی ہے!

اس نے دانت پر دانت بھینچ کر دل ہی دل میں کہا۔ "پروردگار، اسے جلد سے جلد موت دے دے" اور پھر وہ ہمت کر کے سائرہ کے پاس بیٹھ گیا۔ اسی وقت سائرہ نے آنکھیں کھول کر بھائی کو دیکھا۔

گلریز نے دھیرے سے پوچھا۔ "یہ کیسے ہوا؟"

سائرہ نے بتا دیا۔

اور مر گئی۔

گلریز نے ساون پور پیپر مل کے ٹیلیفون نمبر حاصل کیے، اور بدقت تمام قاسم سے رابطہ قائم کر کے اسے سائرہ کی موت کی خبر دی۔

پولیس آگئی۔ گلریز نے پولیس کو بتایا کہ مرتے وقت سائرہ نے خود اسے بتایا تھا کہ کھانا پکاتے وقت اس کے نائلون کے گاؤن نے آگ پکڑ لی تھی۔

ماں باپ آگئے۔ قاسم آگیا۔ ماں باپ کا برا حال تھا۔ مگر سب سے برا حال قاسم کا تھا۔ دکھ چاہے جتنا بڑا ہو، رفتہ رفتہ اپنی شدت کھو ہی دیتا ہے۔ قرار بھی آ ہی جاتا ہے۔ ان سب کو بھی قرار آگیا۔ زندگی اپنے معمول پر آگئی۔

ہر اتوار کو قاسم گلریز کے گھر آجاتا تھا۔ ممی پاپا تو کبھی سائرہ کا ذکر کر بھی دیتے تھے، گلریز کبھی سائرہ کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ سبھی جانتے تھے کہ سائرہ کی موت گلریز کی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھی۔ قاسم اکثر گلریز کا دل بہلانے کی کوشش کرتا۔ گلریز کا دل بہلانے کا سب سے اچھا طریقہ یہ تھا کہ اس سے کہانیوں کی، ادب کی باتیں کی جائیں۔ قاسم یہی کرتا تھا۔ آتے ہی وہ سب سے پہلے ہی کہتا۔ "گلریز بھائی، کوئی کہانی ڈکٹیٹ کروانی ہے؟"......

کہانیوں کی گلریز کے پاس کمی نہیں تھی۔ ہر اتوار کو کسی نہ کسی کہانی کا ڈکٹیشن وہ قاسم کو دے دیتا۔

سائرہ کی موت کے بعد گلریز کی کہانیوں میں اور زیادہ درد، اور زیادہ سنجیدگی آگئی تھی۔ ایک دن وہ ڈکٹیٹ کر رہا تھا۔ "سنگتراش کے لیے سنگتراش ہونے سے قبل سنگ شناس ہونا ضروری ہے...... یہ...... سنگ شناسی ہی...... اس کے دل میں...... سنگ سے محبت پیدا کرتی ہے...... اور یہ محبت...... اسے...... سنگ تراشی پر مجبور بھی کرتی ہے...... ایک دن وہ پتھر کا جگر چیر کر دیکھنے کا اہل ہو جاتا ہے...... اس کے ہاتھوں سے...... اجنتا کی مہک آنے لگتی ہے...... اور اس کی نگاہیں قالب سنگ میں...... اتر کر دعوت نظارہ دینے لگتی ہیں...... اور تب وہ ایفروڈائٹ تراش لیتا ہے...... وینس تراش لیتا ہے...... آئرس تراش لیتا ہے...... سائرہ تراش لیتا ہے......"

"سائرہ تراش لیتا ہے!" قاسم نے حیرت کے ساتھ دوہرایا...... اور گلریز کی طرف دیکھنے لگا، اور گلریز کو جیسے کسی نے آسمان سے زمین پر پٹک دیا۔ اس نے پیشانی میز پر ٹکا دی۔ روانی ختم نہیں ہو گئی تھی۔ چور چور ہو گئی تھی۔ گلریز وہ کہانی کبھی ختم نہ کر سکا۔ اس لیے کہ کہانی ایک سنگتراش کی تھی اور سنگتراش کا فن سائرہ کے بت تک پہنچتا ضرور تھا مگر اس کے بعد دم توڑ دیتا تھا۔ سائرہ کے بت کے بعد "نہیں" کی منزل تھی۔ سب کچھ نفی تھا۔

اس دن بھی اتوار تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد گلریز نے قاسم سے کہا۔ "میرا کچھ کام کرو گے؟"

"ضرور......" قاسم بڑے خلوص کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ "آیئے۔"

گلریز اسے اپنے کمرے میں لایا اور خود حسب معمول ایزی چیئر میں بیٹھ گیا۔ قاسم ہمیشہ کی طرح میز پر آیا۔ اس نے قلم کھولا اور پیڈ اپنے آگے سرکایا۔

گلریز نے کہا۔ "اس کا صفحہ چوبیس کھولو۔ جہاں تک لکھا ہے اس کے آگے لکھنا۔ بس تھوڑا سا رہ گیا ہے۔ کہانی ختم ہونے والی ہے...... ذرا پڑھنا، آخری جملہ کیا تھا؟"

قاسم نے پڑھا...... "حالات کی بے رحمی اب کسی بھی زاویے سے اس پر اپنا شکنجہ ڈھیلا کرنے کو تیار نہیں تھی۔ آج اس کی آخری کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی۔" قاسم خاموش ہو گیا۔

گلریز بولا۔ "اس کے آگے ہی لکھنا......" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کمرے کی کھڑکی کے باہر دیکھا۔ آسمان...... بہت دھندلا بھی نظر آیا...... اور...... بہت دور بھی اس نے...... قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کیا......، نیچے لکھنا...... اگلے پیراگراف سے......

میں ہار گیا۔ تمام کوششوں کے باوجود ہر کامیابی...... اور ہر خوشی...... مجھ سے...... دور ہے...... ہر ناکامی...... ہر غم...... میرا مقدر ہے۔ لوگ مٹی چھو لیتے ہیں...... تو سونا ہو جاتی ہے...... میں...... سونا چھو لیتا ہوں...... تو مٹی ہو جاتا ہے...... ایسی زندگی سے کیا فائدہ...... اس لیے...... میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہوں۔ میں خودکشی کر رہا ہوں...... اس کا...... ذمہ دار کوئی دوسرا نہیں...... میں خود ہوں......"

اتنا بول کر گلریز نے آنکھیں بند کر لیں۔ قاسم کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے قلم بند کر کے میز پر ڈال دیا۔ دو تین منٹ تک انتظار کرنے کے بعد اس نے دھیرے سے پکارا "گلریز بھائی......!"

کوئی جواب نہیں ملا۔

قاسم اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ گلریز یا تو کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہے یا گہری نیند میں۔ سائرہ کی موت کے بعد یہی ہونے لگا تھا۔ کہانی ڈکٹیٹ کراتے کراتے اچانک وہ آنکھیں بند کر لیتا، اور پھر یا تو کسی گہری سوچ میں یا گہری نیند میں ڈوب جاتا۔ آج بھی یہی ہوا تھا۔ پانچ مہینے گزر گئے۔

ایک شام گلریز پیسٹری کا ڈبہ لے کر قاسم کے فلیٹ پر پہنچا۔

"یہ پیسٹری۔!" قاسم مسکرا کر بولا۔ "آپ کو یاد ہے کہ پیسٹری میری کمزوری ہے!"

"کیسے بھول سکتا ہوں کہ پیسٹری تمہاری کمزوری ہے، اور آج تمہاری سالگرہ ہے" گلریز نے کہا۔

"اوہ!" قاسم تعجب سے بولا۔ "کمال ہے! آپ کو یہ بھی یاد ہے۔ یقین کیجیے مجھے بالکل یاد نہیں تھا۔ کاش آج...... سائرہ بھی ہوتی......" اس کا لہجہ اداسی میں ڈوب گیا۔ چہرے پر اداسی پھیل گئی۔

"چھوڑو۔" گلریز نے کہا، ڈبہ کھولا، بائیں ہاتھ سے ایک پیسٹری نکال کر قاسم کو کھلائی۔ "آپ بھی تو لیجیے۔" قاسم نے کہا اور ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"آدھے گھنٹے کے بعد...... ابھی آدھے گھنٹے پہلے ہومیو پیتھی کی دوا لی ہے۔" گلریز نے بتایا اور ڈبہ میز پر رکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ قاسم اپنے ڈبل بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"وہی ایسیڈ بٹی؟" اس نے استفسار کیا، اور گلریز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اچانک قاسم نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ "یہ...... یہ مجھے عجیب سا لگ رہا...... ہائے گلریز بھائی...... م...... مجھے کچھ...... ہو رہا ہے......"

گلریز اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

"یہ کک...... کیا...... ہو را...... ہائے" قاسم آگے پیچھے ہلتے ہوئے بولا۔

"تم بے ہوش ہو رہے ہو۔" گلریز نے دھیرے سے کہا۔

"مجھے...... ہوش...... کک...... کیوں...... کیوں"؟ قاسم کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ "اس پیسٹری...... میں...... کک...... کیا تا؟" اس نے کہا لیکن پھر سے ہوش نہیں رہ گیا کہ گلریز نے کیا بتایا تھا۔ وہ بیڈ پر ڈھلک گیا۔

صبح پانچ بجے اس کی آنکھ کھلی تو گلریز کو سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا دیکھا۔

تقریباً فوراً ہی اسے یاد آگیا کہ گلریز نے اسے پیسٹری کھلائی تھی، اور کہا تھا "تم بے ہوش ہو رہے ہو۔"

"گلریز بھائی......" اس نے گلریز کو مخاطب کیا اور تب اسے اندازہ ہوا کہ یہ دو لفظ بھی بہ دقت تمام ہی اس کے منہ سے نکل سکے تھے۔ اسے یاد نہیں آیا کہ ایسی شدید نقاہت سے کبھی پہلے بھی سابقہ پڑا ہو۔ پلکیں جھپکانا تک اس کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ لگتا تھا سارے

جسم کی جان نکل گئی ہو۔

"کہو...... کیا کہنا چاہتے ہو۔" گلریز بولا۔ نہ اس کے لہجے سے کسی جذبے کا اظہار ہو رہا تھا نہ چہرے سے۔

قاسم نے کچھ کہنا چاہا، مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ ایک بات تو اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کی وہ نقاہت قطعی طور پر غیر قدرتی تھی۔ بڑی بے بسی سے وہ گلریز کی طرف دیکھنے لگا۔

"بہت زیادہ نقاہت محسوس ہو رہی ہے؟" کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گلریز نے پوچھا۔ قاسم کی ناک سے بہت لاغر سا، بہت دھیما سا "ہوں" نکلا۔

"ان کیمیکلز کے کمپاؤنڈ کی وجہ سے ہے جو میں نے تیار کر کے پیسٹری میں ملا کر پیسٹری تمہیں کھلائی تھی۔" گلریز نے بڑی لاتعلقی سے بتایا۔

ڈھنگ سے تعجب تک قاسم کی آنکھوں سے عیاں نہ ہو سکا۔

"یہ کمپاؤنڈ میری ایجاد ہے۔" گلریز نے اسی غیر جذباتی آواز میں بتایا۔ "اس کے صرف دو قطرے کسی بھی چیز میں ملا کر آدمی کو کھلا یا پلا دو۔ دو منٹ میں بے ہوش ہو جائے گا۔ بے ہوشی کی مدت سات سوا سات گھنٹے ہوگی...... دس گھنٹے تک دوران خون بے حد دھیما رہے گا اور جسم کے تمام مسلز اور رگیں تقریباً ناکارہ رہیں گی۔ اگر یہ کمپاؤنڈ زیادہ مقدار یعنی دو کی جگہ تین قطرے جسم میں پہنچ جائے تو آدمی بے ہوشی کے عالم میں ہی مر جائے گا کیونکہ دل کے مسلز اتنے NUMB ہو جائیں گے کہ کام کرنا بند کر دیں گے، یعنی جسم میں خون کی گردش ایک دم ختم ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے پیسٹری میں تمہیں اس کمپاؤنڈ کے صرف دو قطرے دیے تھے۔"

قاسم کی آنکھوں میں حیرت کا تاثر نمایاں ہو گیا، اور اس میں استفہام کی آمیزش بھی نظر آئی۔

گلریز تقریباً دو منٹ تک خاموشی سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔ "تم نے اپنی پہلی بیوی کلثوم کا بھی دو لاکھ کا بیمہ کرایا تھا......" گلریز کی آواز اب بھی ہر قسم کے جذبات سے عاری تھی۔

قاسم کی آنکھیں کچھ زیادہ پھیل گئیں۔ اس نے اس بار شاید کچھ کہنا ہی نہیں چاہا تھا۔ اس سے کوئی جواب نہ پا کر گلریز نے کہا۔ "پھر ایک دن وہ مر گئی...... کلثوم......

تمہاری پہلی بیوی...... ایک حادثے میں انشورنس کی ایک ایکسیڈینٹل پالیسی لی تھی تم نے...... اور کلثوم ایکسیڈنٹ میں ہی مری...... تمہیں چار لاکھ روپیہ مل گیا۔"

قاسم کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔

گلریز بولا۔ "پھر تم نے سائرہ سے شادی کرلی۔ اس کا بھی تم نے دو لاکھ کا بیمہ کرایا۔ اس کی بھی تم نے ایکسیڈینٹل پالیسی لی۔ سائرہ بھی ایک حادثے کا ہی شکار ہو کر مری۔ تمہیں پھر چار لاکھ روپے مل گیا۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی نگاہیں اب بھی قاسم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ان نگاہوں میں کسی بھی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔

اچانک قاسم کے ہونٹ ہلے۔ بہت دھیمی سی آواز اس کے منہ سے نکلی۔ "اس میں ...... مم ...... میرا کیا...... قصور ...... جب سائرہ جلی ...... تھی تو میں ...... ساون پور...... میں تھا۔"

"نہیں۔" گلریز اسی غیر جذباتی آواز میں بولا جس میں اب تک بات کر رہا تھا۔ "تم اس وقت صرف پولیس ریکارڈ میں ساون پور میں تھے...... ورنہ تم یہیں تھے...... اسی فلیٹ میں۔"

قاسم نے کچھ کہنا چاہا، مگر آواز اس کے منہ سے نہیں نکلی۔

گلریز بولا۔ "سائرہ خود نہیں جلی تھی۔ تم نے اسے جلایا تھا۔ مرتے وقت اس نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے اس کے کپڑوں میں آگ لگائی تھی...... میں نے یہ بات پولیس کو نہیں بتائی...... کسی کو نہیں بتائی...... کیا فائدہ ہوتا بتانے سے؟...... برسوں مقدمہ چلتا...... چشم دید گواہ اور ثبوت کے فقدان میں تم الزام سے بری ہو جاتے...... ممکن ہے بری نہ ہوتے...... ممکن ہے عدالت میں میری بات پر یقین کرلیا جاتا...... ممکن ہے تمہیں پھانسی کی سزا ہو جاتی۔ پھر تم اپیل کرتے...... ہائی کورٹ جاتے...... ممکن ہے وہاں سے بری ہو جاتے...... ممکن ہے، وہاں بھی تمہاری سزا برقرار رہتی...... ممکن ہے تمہیں پھانسی ہو جاتی...... کون جانے کیا ہوتا...... اور کب ہوتا...... بہر حال جو کچھ بھی ہوتا تم اس اذیت سے ہر حال میں ناواقف رہتے جس اذیت سے وہ شخص گزرتا ہے جس کی موت پچانوے فی صد جلنے سے ہوتی ہے...... میرے داہنے ہاتھ کی پشت ایک بار کسی کی جلتی ہوئی سگریٹ سے چپک گئی تھی۔ میں ہی جانتا ہوں کتنی تکلیف ہوئی تھی مجھے اس ذرا سے جلنے کے بعد...... اس اذیت، اس

تکلیف تک ہمارا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا جس اذیت، جس تکلیف سے وہ عورت گزرتی ہوگی جسے زندہ جلا دیا جاتا ہے، جس کی موت پچانوے فی صد جلنے کے سبب ہوتی ہے۔ سائرہ پچانوے فی صد جل گئی تھی۔ اس لیے میں تمہیں پریکٹیکلی یعنی عملی طور سے آگ سے گزاروں گا۔ تاکہ تم احساس کر سکو کہ سائرہ کس اذیت سے گزری ہوگی۔"

اتنا کہہ کر گلریز نے بایاں ہاتھ بڑھا کر کرسی کے پیچھے رکھا ہوا پیٹرول کا ٹن اٹھایا اور کھڑے ہو کر اوپر سے نیچے تک قاسم پر پیٹرول ڈال دیا۔ خالی کنستر ایک طرف رکھ دیا اور جیب سے ایک پڑیا نکالی اور بولا۔ "اس کاغذ میں پوٹیشیم پرمیگنٹ ہے، اور اس شیشی میں گلیسرین۔" اس نے جیب سے شیشی نکالی۔ "اب میں اس پوٹاش میں گلیسرین کے چند قطرے ڈال کر پڑیا باندھوں گا۔ اسے تمہارے بستر پر رکھ کر تمہارے کمرے سے چلا جاؤں گا۔ آدھے منٹ کے بعد یہ پڑیا شعلہ بن جائے گی اور تم قاسم اس اذیت سے گزرو گے جس سے تم نے سائرہ کو گزارا تھا۔"

اس نے ایسا ہی کیا...... جب وہ دروازے کے پاس پہنچا تو اس نے قاسم کے منہ سے نہیں بلکہ کل وجود سے آواز کے پیکر میں نکلی ہوئی منت سنی۔ "گل...... ریز...... بھائی" اس نے پلٹ کر دیکھا...... قاسم اٹھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ مگر اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں پا رہا تھا۔

گلریز کمرے سے نکل گیا......

قاسم کی جلی ہوئی لاش کو خانہ پری کی خاطر پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔

اسی شام رپورٹ آگئی۔

اسی شام کیس فائل کر دیا گیا...... کیونکہ قاسم کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو پرچہ پولیس کو اس کی میز سے ملا تھا، اس پر لکھا تھا۔

"میں ہار گیا۔ تمام کوششوں کے باوجود ہر کامیابی اور ہر خوشی مجھ سے دور ہے، ہر ناکامی، ہر غم میرا مقدر ہے، لوگ مٹی چھو لیتے ہیں تو سونا ہو جاتی ہے، میں سونا چھو لیتا ہوں تو مٹی ہو جاتا ہے۔ ایسی زندگی سے کیا فائدہ۔ اس لیے میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہوں۔ میں خود کشی کر رہا ہوں۔ اس کا ذمے دار کوئی دوسرا نہیں، میں خود ہوں۔"

●●

شاہد فروغی

سڑا ہوا ہاتھ

دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ کمرے کے اندر بلب کی روشنی تھی جس کی شعائیں دروازے سے نصف برآمدہ تک ایک زاویہ کی شکل بنارہی تھیں۔
میں ٹھٹھک سا گیا۔ ایک معمر شخص، لاغر سانولے رنگ کا، جس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، میرے کمرے میں اکڑوں بیٹھے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے میں مشغول تھا۔ اس کی پلیٹ کے سامنے ایک المونیم کا پرانا جگ اور ایک تھیلا تھا جس میں کئی پیوند لگے تھے۔

کمرے میں میں داخل ہوتے ہی میں نے عادتاً سلام کیا۔ اس نے سر اٹھا کر میرے سلام کا جواب دیا۔ میں خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ کر ایک اخبار دیکھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میری ماں ایک کٹورے میں دال لے کر آئی اور اس اجنبی کے سامنے رکھ دی۔

''اور کچھ چاہیے۔'' میں اس اجنبی سے مخاطب ہوا۔

''نا۔''

''اچار لاؤں؟'' میری ماں نے بڑے خلوص سے پوچھا۔

''اکٹو نون داؤ۔'' اس نے بنگالی زبان میں کہا۔ میری ماں کچھ کچھ بنگلہ سمجھتی تھی۔ فوراً اس نے نمک لا کر دیا۔ وہ سر جھکائے کھائے جارہا تھا۔ علاوہ ازیں ہر چند لقمے نگلنے کے بعد وہ دو گھونٹ پانی پی لیا کرتا تھا۔ اس کی صورت بتارہی تھی کہ وہ صبح سے ہی بھوکا ہوگا۔ میں اس کی ظاہری اور باطنی کتاب کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس سے بنگالی زبان میں دریافت کیا۔ ''آپ کہاں رہتے ہیں؟''

اس نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے مجھے رکنے کو کہا۔ میں سوچنا لگا۔ یہ عجیب شخص ہے اور بڑے غور سے اس کی حرکتوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے طشتری سے ہاتھ ہٹالیا کیوں

پتہ : 2/107 منشی نور محمد لین، ہوڑہ، (مغربی بنگال)

کہ اس کی سانسیں اوپر نیچے کو دوڑنے لگیں۔ دم اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا۔ آخر برداشت کی حد ٹوٹ گئی اور یکایک لعاب جیسا پانی اس کی ناک اور منہ سے نکل کر اس کی قمیض اور لنگی پر پھیل گیا۔ کچھ بوندیں کھانے کے پلیٹ میں بھی ٹپک پڑیں۔

یہ دیکھ کر میرا جی متلانے لگا۔ دفعتاً میرے ضمیر نے احساس دلایا کہ یہ میری ہی غلطی تھی کہ میں نے اسے کھاتے وقت ٹوکا۔ ورنہ اس کے گلے میں چاول کے دانے اور پانی کے پھنسنے کی نوبت نہ آتی۔ کچھ دیر کے بعد اس کے اندر کا طوفان ٹھہرا تو میری باتوں کا جواب نہایت سادگی سے اپنی بنگالی زبان میں دیا۔ اور اپنی زندگی کی داستان سنانے لگا۔

''میں ڈائمنڈ ہاربر کے ایک چھوٹے سے علاقے میں رہتا ہوں۔ میری ایک بوڑھی بیوی ہے۔ میں دن بھر قصبے قصبے، گاؤں گاؤں چکر لگاتا پھرتا ہوں۔ اب تو وہ پہلے جیسی آواز بھی نہیں رہی جو میں گا کر راہ گیروں کا دل جیت سکوں۔ دم پھولنے لگتا ہے۔ کھانسی اٹھ جاتی ہے۔ کچھ عمر کا تقاضہ بھی ہے۔ پھر بھی ادھر ادھر گشت کرنے سے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے، جس سے اپنا اور اپنی بیوی کا دوزخ بھرنے کا بند و بست کسی نہ کسی طرح ہو جاتا ہے۔ یہ تو نصیب کی بات ہے۔ دنیا میں ہر انسان تھوڑی بہت محنت اور کوشش کرتا ہے لیکن سبھی کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔ کوئی کم ہی محنت کرتا ہے لیکن خدا ضرورت سے زیادہ اسے اس کی اجرت دیتے ہیں۔ کوئی بہت ہی زیادہ محنت و مشقت، سعی اور تدبیر کرتا ہے پھر بھی اسے خاک ہی نصیب ہوتی ہے۔ یہ سب قدرت کا کرشمہ ہے جو انسان کی سمجھ سے باہر ہے۔ اب مجھے ہی دیکھئے میں کئی ہنر جانتا ہوں۔ راج مستری، گھرامی اور بڑھئی سے لے کر کھیتی تک کا کام کر لیتا تھا لیکن اب میں اپنے دائیں ہاتھ اور جسم کی کمزوری سے مجبور ہوں۔

۷ سال قبل کی بات ہے میں ایک پیڑ سے آم توڑ رہا تھا۔ نہ جانے کس کی آہ میری جوانی کو لگ گئی۔ درخت سے پاؤں پھسل گیا اور میں زمین پر گر پڑا۔ نتیجہ میں دائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اپنے گاؤں میں کوئی ایسا وید نہیں تھا جو ٹوٹی ہڈیوں کو جوڑ دے۔ پڑوسیوں سے میری تکلیف دیکھی نہ گئی۔ ان میں سے ایک نوجوان نے مجھے ذرا دور کے گاؤں کے ایک اسپتال میں لے جا کر میرے ٹوٹے ہاتھ کا پلستر کروا دیا۔

ہفتہ بعد پلستر والے ہاتھ میں کھجلی سی ہونے لگی، لیکن میں نے اسے معمولی کھجلی سمجھ کر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تین ہفتے گزر گئے۔ پلستر والے

ہاتھ میں جلن ہونے لگی۔ ایک روز درد اتنا بڑھا کہ میں تمام رات تکلیف سے تڑپتا رہا۔ صبح ہوتے ہی میں نے اپنے ہاتھ کے پلستر کو چاک چاک کر دیا۔ جب اس پر نظر جمیں تو میری روح کانپ اٹھی۔ جگہ جگہ کئی پھوڑے نکل آئے تھے۔ جن سے لہو رس رہا تھا۔ پلستر کے اندر سینکڑوں کھٹملوں کے انڈے بچے لال دانے کی شکل میں رینگ رہے تھے۔

ایک تو میں پہلے ہی سے کافی پریشان تھا۔ اس پر یہ دوسری مصیبت آن پڑی۔ جی میں آرہا تھا کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ سڑا ہوا ہاتھ لے کر میں کسی کے پاس بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی بو سے خود میرا جی متلانے لگتا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔

میں ایک رات چپکے سے اپنے بستر سے اٹھ کر خودکشی کی غرض سے ڈائمنڈ ہاربر ساحل کی طرف چل پڑا۔ ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس گھنگھور اندھیرے میں دور دور تک سمندر کا پانی سیاہ بادل کی طرح آسمان سے ملتا دکھائی دے رہا تھا...... میں اکیلا تھا۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے موت کا فرشتہ میرے سائے میں گم ہو کر میرے پیچھے پیچھے چل رہا ہو۔ اس ہیبت ناک سناٹے میں صرف سمندر کا شور سنائی دے رہا تھا جیسے لاکھوں عفریت ایک آواز ہو کر شور مچا رہے ہوں۔ ''آجاؤ سمندر کی تہہ میں! آجاؤ سمندر کی تہہ میں!!''

میں ساحل کے قریب پہنچ کر پیچھے مڑا۔ ریت پر دور تک میرے قدموں کے نشانات بکھرے تھے۔ میں وہیں کھڑا اپنی جھونپڑی کی طرف دیکھنے لگا جو اب مجھ سے ایک یا ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھی...... جہاں سے صرف لالٹین کی ٹمٹماتی روشنی نظر آرہی تھی...... تھوڑی دیر کے بعد ہی میں صاف صاف دیکھنے لگا کہ ایک عورت ہاتھ میں لالٹین لیے تیز تیز قدم بڑھاتے میری ہی طرف چلی آرہی ہے...... مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ یہ میری بیوی تھی...... شاید سوتے میں آنکھ کھل گئی تھی اور مجھے گھر میں نہ پا کر وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ساحل کی طرف آنکلی تھی...... شاید میرا مقصد سمجھ گئی تھی۔ وہ قریب بالکل میرے قریب آگئی اور میرے سینے سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس کے آنسو اور معصوم چہرے کو دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئیں...... میرے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا اب اس کے لیے زندہ رہوں گا......

●●

احمد عباس حسینی

بیٹی کی شادی

میں بچپن ہی سے کم گو ہوں۔
شروع سے ہی مجھے زیادہ لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں۔ اس کی خاص وجہ میرا بچپن میں یتیم ہونا ہے۔ دس سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہوا۔ ماں نے پاس پڑوس کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے سے منع کیا لہٰذا جب بھی کھیلنے کی خواہش ہوتی تو اپنے گھر کی چہار دیواری میں کھیل کود لیتا۔ گھر کے باہر کیسے لوگ رہتے ہیں؟ کس طرح کا ماحول ہوتا ہے؟ کچھ خبر نہیں۔ میں تو شام کو جلد کھانے اور مغرب کی اذان کے بعد بستر پر دبک کر سونے کا عادی ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ذہن کی نشو ونما زیادہ پروان نہ چڑھی اور میرے اندر احساس کمتری کا مادہ بڑھنے لگا۔ اسکول گیا تو وہاں سارے بچوں سے علیحدہ کلاس میں کنارے گوشہ نشینی اختیار کی۔ کالج میں داخلہ ہوا تو اس میں بھی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی۔ کالج کی کسی ایکٹیوٹی میں حصہ نہ لیا۔ بس اپنے کام سے کام۔ سن بلوغ پر پہنچنے کے بعد طرح طرح کے احساسات و جذبات ابھرنے لگے۔ ذہن میں مختلف قسم کے تصورات جنم لینے لگے۔ آنکھوں میں دنیا کی رنگینیاں بھلی لگنے لگیں لیکن دل کے اندر پوشیدہ احساس کمتری کا داروغہ فوراً اپنی آنکھیں نکال کر ڈانٹتا اور تنبیہ کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے آج تک کوئی ترقی نہ کی ہمہ وقت دبکا سہا رہتا۔ بچپن میں بزرگوں کا خوف ذہن کے پردے پر ایسا غالب ہوا کہ شعور آنے پر وہی خوف سماج کے ہر فرد سے لگنے لگا۔ کسی بھی کام کے لیے قدم اٹھاتا لیکن فوراً ہی رک جاتا۔ نہ جانے اس کا انجام کیا ہو گا۔ ابتدا سے قبل انجام کا تصور ذہن میں گھومنے لگتا۔ یہ خیال نہیں آتا کہ میرا تصوراتی مجرم بے قصور ہو سکتا ہے۔ یہ احساس میرے ذہن کے دائرے سے باہر تھا کیونکہ میں ہمیشہ اپنے سامنے والے سے خوفزدہ رہتا۔

پتہ: ۷۰۴سی۔ پاکٹ۔ ۲، میور وہار۔ دہلی ۱۱۰۰۹۲

اس کا مقابلہ کرنے سے ڈرتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ قصور میرا ہی نکل آئے۔ جوانی کے ایام میں نہ جانے کیا کیا گل کھلانے کا خاکہ مرتب کیا۔ تصوراتی رنگین پتنگ نے افق کو چھو لینے کی کوشش کی لیکن لاحاصل۔ ذہن میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ منزل کا راستہ کیسے طے کیا جائے بس لالچی کتوں کی طرح دور سے زبان نکال کر رال ٹپکاتا رہتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ ایک دن ماں نے اپنی پسند کی ایک لڑکی کا آنچل میرے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔ جب میں نے اس لڑکی کے چہرے سے سرخ آنچل ہٹا کر "بی بی میں تیرا غلام" کی مہر ثبت کی تو وہ ایک ٹک مجھے دیکھتی رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ میرے جیسا شخص ایسی بات زبان پر کیسے لایا۔ لیکن میں تو ایک لڑکی کو اپنی بیوی کے روپ میں دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے بوکھلا سا گیا۔ دادی اماں نے بچپن میں کسی پری کی کہانی سنائی تھی اور اس کے حسن کی تعریف میں لغت سے نہ جانے کیسے کیسے الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ اس وقت اس کہانی کی پری میرے سامنے موجود تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے جنت کی حور میرے سامنے بیٹھی ہو۔ صالحہ جتنی سڈول تھی اتنی ہی حسین، اور ذہین تو بلا کی تھی۔ میری توقع سے زیادہ وہ ایک باتونی اور شوخ و چنچل لڑکی تھی۔ مجھے اس کی عادتیں پسند آ گئیں۔ اس کی محبت نے میری زندگی میں ایک نئی رنگینی بھر دی۔ میرے اندر وہ پہلے جیسی کیفیت نہ تھی۔ اب میں آہستہ آہستہ اپنا ذاتی دائرہ وسیع کرنے لگا مگر وہ احساس کمتری کا داروغہ ذہن کے ایک گوشہ میں پوشیدہ تھا۔ جب کبھی موقع ملتا سامنے آ کر بڑی بڑی آنکھیں نکال کر رنگ دکھانے لگتا۔ عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ میری امنگوں کی موج پر کوئی باندھ ڈال دیتا۔ ہمارے سینہ سے ایک کھٹکتی سانس نکلتی، بے حد طمانیت اور آسودگی کی۔ دل جانے کیوں اچاٹ سا ہونے لگتا۔ ایسے موقع پر صالحہ کے تسلی بخش رائے مشورے، لذیذ کھانے، مختلف ہنسی مذاق میرے احساس کمتری کے اس دیو کو بھگانے میں کامیاب ہوتے جس سے میں خوفزدہ تھا۔ اب میری آنکھوں میں چمک آجاتی اور میں ایک ترو تازہ پھول کی طرح کھل اٹھتا، پوری کائنات جھوم اٹھتی۔

زندگی ایک ہموار راہ سے گزر رہی تھی۔ اس دوران میرے اور صالحہ کے درمیان ردا آ گئی۔ ایک حسین اور خوشنما سبک سی کلی کے روپ میں، رنگ و نور کا ایک پیکر بالکل اپنی ماں کی ہو بہو شکل، وہی رنگت، پتلے و باریک ہونٹ، قندھاری انار جیسے سرخ گال، نرگسی

آنکھیں، ریشم جیسے گھنگھریالے بال بالکل چینی کی گڑیا۔ جس دن اسپتال میں وہ پیدا ہوئی میں خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے قدرت نے پوری کائنات میری گود میں ڈال دی۔ میں نے بہت دیر تک اسے اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ میری کلمہ کی انگلی اس کے نرم و نازک گلابی ہونٹوں کو مس کرنے لگی۔ ایک خوشنما گلاب کی پنکھڑی جیسے باریک لب، قدرت کی صناعی کا بھی جواب نہیں۔ اس نے ہمیں کن کن نعمتوں سے نوازا ہے پھر بھی کبھی کبھی ہم اس کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ یہ ہمارے جہنم میں جانے کی نشاندہی ہے۔

آہستہ آہستہ ردا کی کلکاریوں کی آواز میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔ پھر اس کے معصوم لبوں پر اک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ میں جب آفس سے آتا اور اس کے چہرے پر نظر پڑتی تو آفس کی سارے دن کی تھکان دور ہو جاتی۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد صالحہ ایک گلاس پانی پیش کرتی لیکن میں تو ردا کو گود میں اٹھا کر اس سے پیار کرنے لگتا اور پیاس کا احساس ہی نہ ہوتا۔

آہستہ آہستہ ردا کے جسم میں نت نئی حرکتیں شروع ہو گئیں۔ کل تک جو ننھی سی جان غوں غاں کرتی تھی اب وہ اپنی زبان سے "بابا" پکارنے لگی۔ یہ بھی ایک نیا انداز تھا کیونکہ آج کے بچے اپنے باپ کو پاپا یا ڈیڈی پکارتے ہیں۔ کمبخت انگریز چلے گئے لیکن چلتے وقت اپنے قدموں کے نقوش نہیں مٹا سکے۔ آج اس ترقیاتی دور میں ہم اپنے دیش کی روایت اور اس کی سنسکرتی کو بھول کر ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انگریزی پڑھانا یا بولنا گناہ عظیم ہے۔ انگریزی ہی وہ واحد زبان ہے جو پوری دنیا میں بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے اس علم کو حاصل کرنا ضروری ہے لیکن اس کا استعمال وقت ضرورت پر ہی مناسب ہے کیونکہ جو پیار و محبت لفظ پتاجی، ابا یا بابا میں ہے وہ پاپا، ڈیڈ یا ڈیڈی میں نہیں۔

ردا کو روتا ہوا میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب کبھی صالحہ کسی کام میں الجھی ہوتی اور وہ بھوک سے بلکنے لگتی تو میں تڑپ اٹھتا۔ ایک دن اس کے پھول سے گالوں پر آنسو بہتے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کی آنکھوں سے روپہلے موتیوں کے دانے ایک ایک کر کے گر رہے ہیں۔ اچانک ایک درد، ایک چبھن سی سینے میں لیے میں قیدی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ میرے دل میں ایک عجیب تلاطم برپا ہو گیا۔ ذہنی کرب کی یہ بڑی جاں گسل منزل ہوتی ہے جب انسان اپنے محبوب کو پریشان حال دیکھتا ہے اور اس دن پہلی بار میں صالحہ

سے الجھ پڑا۔

"آپ کا زیادہ لاڈ پیار اسے برباد کر دے گا۔" صالحہ کی زبان سے یہ جملہ پہلی مرتبہ سنا۔

ایک لمحے کے لیے میں خاموش بیٹھا سوچنے لگا کہ صالحہ کے اس جملے میں کتنا وزن ہے۔ جو بات اس نے کہی ہے اس میں کتنی گہرائی ہے۔ اس نے ردا کے مستقبل کے بارے میں ہلکا سا اشارہ کیا پھر بھی میں نے بے قابو ہو کر اسے سینے سے چمٹا لیا۔ میں چند لمحے خاموشی سے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ ردا کا نرم و نازک وجود میرے سینہ سے چپک گیا۔ جیسے ہی میرے جسم کی خوشبو اور میرے سینے کی گرمی کا اسے احساس ہوا اس کے نازک لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی، آنکھوں میں ایک شریر بچوں کی جھلک نمایاں ہوئی اور میں نے جھک کر اس کے متبسم لبوں کو چوم لیا۔ پھر ہلکے سے اس کے جسم میں گدگدی پیدا کی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کی اسی معصوم سی ہنسی پر میرا دل قربان ہونے کے لیے بیتاب ہو اٹھتا۔

پھر وقت اس کے جسم میں کچھ توانائی لایا اور وہ گھٹنوں چلنے لگی۔ گھٹنوں چل چل کر اس نے کچھ چیزیں ادھر ادھر پھینکنا شروع کر دیں۔ اس کے پاس کھلونوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ طرح طرح کے رنگین کھلونے، پلاسٹک کے ہاتھی، بندر، کچھوا، انڈا دیتی مرغی، ننھی ننھی بیٹری سے چلنے والی کاریں وغیرہ۔ ان کے علاوہ صالحہ یا میں جب بھی بازار سے گزرتا کوئی نیا کھلونا یا غبارہ ضرور لاتا۔ بچپن میں جو بادشاہت ملتی ہے وہ زندگی کے دوسرے حصہ میں کہاں! کھلونوں سے کچھ دیر کھیلنا، پھر انھیں ادھر ادھر پھینکنا اور گھر کے دوسرے سامان کی طرف لپکنا اس کا خاص مشغلہ تھا۔ زیادہ تر صالحہ کے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے میک اپ کے سامانوں، چوڑیوں یا پاؤڈر یا تیل کی شیشی کی شامت آتی اور بے چاری صالحہ انھیں بچاتے بچاتے تھک سی جاتی۔

آہستہ آہستہ اس کے ننھے سے قدموں میں طاقت آگئی اور وہ چلنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے پیروں سے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں دوڑنے لگی۔ میں جب آفس سے آتا تو وہ صالحہ سے قبل دروازے پر پہنچ کر "بابا آگئے۔ بابا آگئے" تالیاں بجاتی ہوتی خوشی سے چلانے لگتی۔ ایک بار صالحہ کی زبان سے نکل گیا۔ "کسی کے بابا آئے ہیں۔ کھلونے ڈھیر سے لائے ہیں۔" بس شام کے وقت جب سے ماں کا جملہ "کسی کے بابا آئے ہیں ......" دہرایا جاتا

جب تک میں اسے گود نہ لے لیتا وہ میری ٹانگوں سے لپٹی رہتی۔ گود میں لیتے ہی وہ اپنے ہاتھوں کو میری گردن میں حمائل کر کے ننھے لبوں سے میرے چہرے کا بوسہ لینے لگتی۔ میں اس کے لبوں کا لمس محسوس کر کے سرشار ہو اٹھتا۔ دن بھر کی مصروفیات سے تھکا ماندہ شخص خوشگوار استقبال سے ساری تھکان بھول جاتا۔ رات میں جب اسے نیند کا جھونکا آتا وہ دوڑ کر میرے سینہ سے لگ جاتی اور "بابا نیند" کہتی یعنی میں اسے لوریاں سناؤں تو وہ پریوں کے پالنے میں آرام فرمائے گی۔ چنانچہ میں اسے "آجارے نندیا آجا" یا "لکڑی کی کاٹھی۔ کاٹھی کا گھوڑا، گھوڑے کی دم پر جو مارا ہتھوڑا۔ گھوڑا دوڑا دوڑا دوڑا" والا گانا گنگناتا تو دھیرے دھیرے اس کی پلکیں بند ہونے لگتیں اور پانچ منٹ میں وہ نیند کی حسین وادیوں میں ایک راجکماری کی طرح سیر کرنے لگتی۔ بچپن کی شہنشاہیت میں جو سکون ہے وہ دنیا کے عظیم شہنشاہوں کو کہاں میسر! زندگی کا یہ دور عظیم دور ہے جس میں شان ہی شان ہے۔ دنیا کے تمام تفکرات سے مبرا، تمام الجھنوں سے دور......

رفتہ رفتہ وہ ننھا پیکر نرسری اسکول میں جانے لگا۔ اسکول سے آکر اپنا ہوم ورک کرنے میں یوں مشغول ہوتی جیسے بہت بڑی ذمہ داری سر پر آن پڑی ہو۔ کبھی کبھی میں اسے اپنی طرف متوجہ کرتا تو وہ اپنی بھولی سی زبان سے جواب دیتی۔

"رکیے بابا۔ ہوم ورک نہ کرنے پر انگلش ٹیچر بہت بگڑتی ہیں۔ پلیز ذرا رکیے۔"

یوں تو بچے مجھے شروع سے ہی بہت عزیز ہیں۔ خوشنما، حسین پھولوں کی مانند۔ خوشیاں صرف بچپن کی بھولی بھالی مسکراہٹوں میں ہی جھلکتی ہیں۔ پھر ردا تو اپنی بچی میرے دل کا ٹکڑا۔ اس کے اس جملہ نے بہت متاثر کیا۔ اس کی معصومیت نے جیسے میرے دل کو مٹھی میں لے لیا تھا۔ میں لپک کر اٹھا اور اسے اپنی گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔ وہ "پلیز پلیز" کرتی رہی۔ پھر میری نگاہ اس کے چہرے پر گئی۔ میری آغوش میں پہلی بار اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ میرے پیار سے زیادہ اس نے اپنے اسکول کے کام کو فوقیت دی۔ اب وہ مچل رہی تھی۔ اس کے رونے سے قبل میں نے جلدی سے اسے نیچے اتار دیا۔ وہ دوڑ کر اپنی کاپی پینسل کی طرف بھاگی۔ فوراً مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس کا ذہن اسکول کے ہوم ورک کی طرف رجوع تھا لیکن میں اسے اپنی محبت کی طرف متوجہ کر رہا تھا جسے وہ اس وقت ناپسند کر رہی تھی۔

نرسری اسکول اور پھر اسکول کے چھوٹے دروازے سے نکل کر کالج کے آہنی گیٹ میں داخل ہوئے، اس کے بعد یونیورسٹی کی عالیشان بلڈنگ تک پہنچنے تک کا وقت یوں گزرا کہ کچھ احساس نہ ہوا۔ اس کی پیدائش کے چھ سال بعد اُس کا چھوٹا بھائی علی بھی عالم وجود میں آگیا۔ گول مٹول بھولا بھالا سا۔ ردا اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔ قدرت نے اس کی تنہائی دور کر دی اور اس کے ساتھ کا ایک وسیلہ مہیا کر دیا۔ لیکن میری طرف سے وہ غافل نہ ہوئی۔ علی کے ہمراہ کچھ دیر وقت گزار کر وہ پھر میری ہی طرف چمٹی رہتی۔ علی میاں اپنی ماں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ وہ انھیں کے آنچل کا اسیر بن گئے۔ یوں بھی عالم نفسیات سیگمنڈ فرائڈ کا قول بھی تھا کہ بیٹا اپنی ماں سے محبت کرتا ہے اور بیٹی اپنے باپ سے پیار کرتی ہے۔ بچپن ہی سے انسان اپوزٹ سیکس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ میں نے فرائڈ کی طرف وحشت زدہ نگاہوں سے دیکھا۔ فرائڈ کی موت ایک عرصہ پہلے ہو چکی۔ کتنا وقت گزر گیا مگر اس کا قول زندہ ہے۔ میں ردا کو خود سے جدا نہ کر سکا۔

دوسرے بچوں سے دوستی کرنا ردا کی عادت ہو گئی۔ نرسری اسکول میں پاس پڑوس کی ننھی منی کلیاں تھیں، کالج میں کچھ تعداد بڑھی اور یونیورسٹی کی وسیع عمارت میں قدم رکھتے ہی اس کے دوستوں اور سہیلیوں کا دائرہ بڑھ گیا۔ روزانہ کوئی نہ کوئی لڑکی گھر میں موجود، بات چیت کا سلسلہ شروع ہوتا جو کافی دیر تک چلتا۔ ہاں یہ بات ضرور ہوئی کہ اس نے جب شعور کی منزل میں قدم رکھا تو اپنے ذاتی معاملات میں صالحہ سے رائے مشورہ لینے لگی۔ ظاہر ہے عمر کے بڑھنے پر اسے خاص و عام باتوں کی پرکھ ہوئی اور مخصوص باتوں میں شریک کرنے کے لیے صالحہ جیسا اہم رفیق اسے نظر آیا کیونکہ وہ اس کی ہم جنس تھی۔ یوں بھی عورتوں کو پردہ داری اور رازداری رکھنے کی گھٹی بچپن میں دی جاتی ہے جس کا اثر زندگی بھر رہتا ہے۔ اب چیزوں کی خرید، اس کی پسندیدگی، رنگوں کا امتیاز، یہاں تک کہ دوستوں کے چناؤ کے بارے میں بھی وہ ماں کی رائے پر فوقیت رکھتی۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ بڑے ہونے پر میری محبت سے فائدہ اٹھا کر من مانی نہیں کی البتہ اگر میرا نہیں تو کم از کم صالحہ کا مشورہ ضرور لیا۔ یوں بھی میں اپنے دفتر کے کاموں میں الجھ کر اس کی طرف کم ہی توجہ دیتا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ شام کے وقت کا وہی پرانا روٹین بچپن والا دہرایا جاتا۔ دروازہ کھولنا، میرے ہاتھ سے بیگ لینا، بڑھ کر گلے میں باہیں ڈال کر کس کرنا نہیں گیا۔ میرے

سارے کاموں کی ذمہ داری اس نے اپنے سر پر لے لی۔

یہ نہیں کہ ردا صرف کتابیں پڑھتی رہتی اور کوئی کام نہیں کرتی۔ اب وہ آہستہ آہستہ گھر کی تمام ذمہ داریوں میں بھی دلچسپی لینے لگی۔ اپنے کمرے اور گھر کے دیگر حصوں کی ڈسٹنگ، چھٹی کے دنوں میں واشنگ مشین میں کپڑے دھونا اور کچن میں ماں کی مدد کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے پکوان سیکھنا بھی اپنا فرض سمجھنے لگی۔ محرم کے دنوں میں عورتوں کے اصرار پر نوحہ کی بیاض لے کر بھی کھڑی ہو جاتی۔ قدرت نے آواز بھی بہت پیاری دی تھی۔

یہ محرم بھی ایک عظیم یادگار ہے۔ ایک ایسا واقعہ جو چودہ سو سال قبل اس دنیا میں ہوا تھا لیکن آج بھی وہ سانحہ کسی مجلس میں منبر رسولؐ سے ذاکر کی زبانی تر و تازہ محسوس ہوتا ہے۔ واقعات کربلا کی کہانی ایک ایسی عظیم ہستی کی کہانی ہے جو تا قیامت بھلائی نہیں جا سکتی۔ کربلا کی جنگ حق و باطل کی جنگ تھی۔ اس وقت بھی اسلام کو ماننے والے مسلمان تھے۔ سبھی "اللہ اکبر" کہتے، نماز پڑھتے، مگر ان میں کچھ ظالم تھے اور کچھ مظلوم۔ ایک ضعیف باپ کے ہاتھوں میں چھ ماہ کا بچہ پیاس کی شدت سے اپنی خشک زبان ہونٹوں پر پھیر کر اپنی پیاس کا اظہار کرتا ہے مگر ان ظالم مسلمانوں کا دل نہیں پسیجا بلکہ باپ کے کلام (اے مسلمانو! اگر تم کو مجھ سے دشمنی ہے اور تم سمجھتے ہو کہ اصغرؑ کے بہانے میں پانی پی لوں گا تو میں اسے زمین پر لٹا کر ہٹ جاتا ہوں تم چند قطرے اس کی سوکھی زبان پر ڈال دو) کو قطع کر دیا۔ یہ تھا اس دور کا اسلام۔ حسینؑ نے اپنی قربانی دے کر دین کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔ اہل اسلام کا ہر وہ فرد جسے دین سے محبت ہے وہ کربلا کو فراموش نہیں کر سکتا۔ ورنہ ہر دور میں شیطان پیدا ہوا ہے جس نے خداوند تعالیٰ کے سامنے دعوا کیا ہے کہ میں تیرے نیک بندوں کو اچھے کاموں کو کرنے سے روکوں گا۔ حق کا پرچم ہمیشہ لہرایا۔ بہتر (۷۲) سپاہیوں کی جنگ سے سینکڑوں شیطان نیست و نابود ہو گئے اور آج دنیا کے سامنے اسلام کا پرچم بلند ہے۔ انشا اللہ تا قیامت بلند رہے گا۔

ایک مرتبہ کچھ عرصے کے لیے مجھے اپنے آفس کی طرف سے آن ڈیوٹیشن دلی جانا پڑا۔ دلی میں اپنے ایک دوست کے یہاں قیام کیا۔ ردا سے یہ میری پہلی دوری تھی۔ دوست کے یہاں مجھے ہر طرح کا آرام تھا۔ کوئی تکلیف نہ تھی پھر بھی میرا دل اداس رہتا۔ صالحہ اور

ردا کی یاد ستاتی رہتی۔ وہ دن جب ہم ایک دوسرے کی رفاقت پر ناز کرتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ کتنے خوشگوار دن تھے۔ کیسی خمار آفریں فضا تھی جس میں ہم تھے۔ ان دنوں کی یادیں ہی ہمارا سرمایہ بن گئیں۔ دلی کی فضا میں میں انھیں یادوں کے ساتھ جی رہا تھا کہ اچانک ایک دن میرے آفس میں ایک لڑکی داخل ہوئی اور میرے ٹیبل کے قریب آتے ہی آہستہ سے بولی۔

"سر یہ میرا اپائنٹمنٹ لیٹر ہے۔ میں آپ کے انڈر کمپیوٹر آپریٹر کی پوسٹ پر جوائن کرنا چاہتی ہوں۔ اجازت دیں۔"

اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا مگر میری نگاہیں اس کے چہرے اور اس کے متناسب جسم پر جمی تھیں۔ وہی رنگت۔ وہی بوٹا سا قد۔ بالکل ردا جیسی۔ میری اپنی ردا۔ جس کی یادیں یہاں تنہائی میں مجھے بے چین کیے ہوئے تھیں۔

"بیٹی آپ کا نام؟"

"نورینہ۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"آپ بیٹھئے، کھڑی کیوں ہیں۔" میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ تھینکس کہہ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر ایک تبسم کی لہر دوڑ گئی۔ بالکل ردا جیسی مسکراہٹ۔

"یااللہ یہ بچی میری ردا جیسی ہے۔" میرے ذہن میں کئی سوالات نے جنم لیا لیکن ایک جواب سے سارے سوالات کا حل مل گیا۔

شاید خدا کو میری تڑپ اور بیٹی کی یادوں پر ترس آیا ہو اور اس نے یہ انتظام کیا، میں دن میں اس بچی سے مل کر باتیں کر کے کچھ تسلی کر سکوں۔

نورینہ کا اپائنٹمنٹ ہیڈ آفس سے میرے آفس میں ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھے یہ پتہ چلا کہ وہ بہت سی ایسی خوبیوں کی مالک تھی جو ردا میں تھیں۔ دو انسانوں میں اس قسم کی خوبیاں صرف جڑواں بھائی یا جڑواں بہن میں ہی پائی جاتی ہیں لیکن اس طرح کی مناسبت میں نے پہلی بار دیکھی۔ ردا یوپی کے ایک متوسط علاقہ کی لڑکی اور نورینہ قدرت کے حسین عطیہ، ملک کی فردوس زمین سری نگر سے تعلق رکھتی تھی۔ ہزاروں کلو میٹر کی دوری۔ پھر بھی دونوں کی اس مناسبت سے مجھے خوشی ہوئی۔ اس سے باتیں کرنے اور اپنے قریب بلانے

میں مجھے کچھ ذہنی سکون ملنے لگا۔

ایک دن اچانک نورینہ میرے روم میں آئی۔ اور خاموش کھڑی ہو گئی۔ چہرہ اداس اور آنکھیں پر نم۔ غالباً یہاں آنے سے قبل روئی ہو۔ میں بے چین ہو اٹھا۔

"سر! میری والدہ کی طبیعت خراب ہے ابھی ابھی فون سے میسج ملا۔"

یکایک میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ دھیرے سے کرسی چھوڑی اور اس کے قریب پہنچ کر فرط جذبات سے اس کے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں میں باندھ لیا اور بولا۔

"پہلے تو تم مجھے سر کہنا چھوڑ دو۔ لفظ "سر" میں مجھے اجنبیت کا احساس ہوتا ہے اس لیے تم مجھے بابا یا انکل کہہ کر مخاطب کر سکتی ہو۔ تمہاری ماں بیمار ہیں تم چھٹی کی ایک اپلیکیشن لکھ کر دے دو۔"

"سر ابھی بیس دن قبل جوائن کیا ہے، اتنی لمبی چھٹی!"

"پھر سر۔" میں نے اپنی ایک انگلی اس کے لبوں پر رکھی۔ "ہاں تم جتنے دن سری نگر میں رہنا چاہو، رہو۔ جب تمہاری ماں پوری طرح صحت یاب ہو جائیں تو پھر تم واپس آنا۔ اس کے علاوہ تم اپنے اخراجات کے لیے یہ کچھ روپے اپنے پاس رکھ لو۔ وہاں پہنچ کر بھی اگر ضرورت پڑے تو مجھے بلا تکلف خبر کر دینا۔ ایک باپ کی طرف سے بیٹی کے لیے۔" میں اپنی محبت پر قابو نہ پا سکا۔

"آپ کتنے اچھے ہیں بابا۔" وہ فرطِ جذبات سے میرے سینے سے لگ گئی اور مجھے محسوس ہوا جیسے میرے سینہ پر بہت دنوں سے پڑا بوجھ اتر گیا۔

صالحہ اور ردا سے ہفتہ عشرہ میں ایک بار ضرور بذریعہ فون بسلسلہ خیریت باتیں کرتا۔ ایک بار صالحہ سے نورینہ کے بابت پوری کیفیت بیان کر دی تو وہ بہت خوش ہوئی۔

"چلئے اچھا ہوا، وہاں آپ کو ایک بیٹی تو ملی، کچھ دل بہل جائے گا۔"

"ہیلو بابا کیسی ہے آپ کی دوسری بیٹی۔" ردا کی شوخی بھری آواز سنائی دی۔

"تمہاری کاپی۔"

"میری طرح۔" اس کی متعجب آواز سنائی دی۔

"ہاں بیٹا، تمہارا ہی دوسرا روپ، صرف نام اور جائے پیدائش میں فرق ہے۔"

"چلئے اچھا ہے آپ کو ایک بیٹی مل گئی لیکن میں آپ کو بہت مس کر رہی ہوں بابا۔

آئی لو یو سو مچ۔" ردا کی درد بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"آئی لو یو ٹو(I love you too)۔" میں نے بھی ادھر سے جواب دیا۔

فون منقطع ہو گیا مگر میرے دل میں ایک میٹھا سا درد دے گیا۔ اس رات میں کافی دیر تک جاگتا رہا۔ کچھ دنوں کے بعد نورینہ سری نگر سے واپس آگئی۔ اس کی ماں ٹھیک ہو چکی تھی۔ آفس کا سارا کام روٹین سے چل رہا تھا۔ ایک دن شام کو میں دیر تک آفس میں بیٹھا رہا۔ تقریباً سارا اسٹاف جا چکا تھا۔ میں اپنے کام میں محو تھا کہ اچانک آفس کے اکاؤنٹ آفیسر مسٹر راجن میرے کمرے میں داخل ہوئے۔

"سر میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"تشریف رکھیے۔" میں نے ایک چیئر کی طرف اشارہ کیا۔

"سر میں ذرا مس نورینہ کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کیا ہوا نورینہ کو۔" میرا دل دھک سے ہو گیا۔ دھیرے سے پکڑے ہوئے قلم کو نیچے رکھ دیا۔

"آج کل مس نورینہ کی دوستی مسٹر مناف سے کچھ زیادہ بڑھ رہی ہے۔ چونکہ آپ مس نورینہ سے ایک بیٹی کی طرح پیار کرتے ہیں لہٰذا میں یہ بتادوں کہ مجھے یہ دوستی پسند نہیں۔ صرف بدنامی کے علاوہ کچھ نہیں۔ مناف ایک ایسا نوجوان ہے جو یونیورسٹی لائف سے نہ جانے کتنی لڑکیوں کے ساتھ فلرٹ کر چکا ہے اور آج بھی اس کی جھوٹی محبت کے جھانسے میں کتنی لڑکیاں ہیں۔"

"اس اطلاع کا بہت بہت شکریہ۔ آپ تو جانتے ہیں کہ نورینہ میری اپنی بچی نہیں ہے لیکن اس کی شکل صورت میری بیٹی ردا سے ملتی جلتی ہے لہٰذا میرے دل میں اس کے لیے جگہ ہے۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔" مسٹر راجن کے جانے کے بعد میں نورینہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ کشمیر کی ایک نوخیز کلی بھولی بھالی سی لڑکی۔ اسے دنیاوی درندوں کا کیا علم۔ اسے تو یہ بھی تجربہ نہیں کہ سامنے دیکھنے والا ظاہراً شریف شخص کب کس گھڑی شیطان کا لباس پہن کر وحشت زدہ ہو جائے گا۔

دوسرے دن آفس پہنچتے ہی میں نے چپراسی سے نورینہ کو روم میں بلوایا۔ بڑی آہستگی سے آکر وہ میرے مقابل بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایک خوشنما پھول جیسی

تازگی تھی۔

"آپ نے مجھے یاد کیا ہے بابا؟" اس کے لب دھیرے سے وا ہوئے۔

"ہوں۔ دیکھو نورینہ میں صاف گو انسان ہوں، مجھے باتیں گھما پھرا کر کرنے کی عادت نہیں۔ باتیں بنانے والوں سے مجھے نفرت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مناف سے زیادہ دوستی بڑھاؤ۔ بس آفس کے کاموں تک ہی خود کو محدود رکھو۔ دائرہ زیادہ وسیع کرنے سے بدنامی ہے اور میں نہیں پسند کروں گا کہ لوگ تم پر انگلیاں اٹھائیں۔"

"آپ ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ مناف مجھے ایک بہن کی طرح مانتا ہے۔"

"بیٹا! یہ صرف "ماننا" ہی زیادہ خطرناک ہے۔ سماج کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ اس دنیاوی رشتے سے مجھے نفرت ہے۔ کب کس گھڑی اس کے ذہن میں کوئی شیطانی کیڑا جنم لے لے، کوئی نہیں جانتا اور تمہارا پاکیزہ دامن میلا ہو جائے۔ بیٹی، عورت کا وجود ایک شیشہ سے کم نہیں۔ اس میں ایک باریک سا بال اس کی تباہی و بربادی کی نشاندہی ہے۔ تم اپنے ماں باپ سے دور ہو۔ یہاں تنہا ہو۔ اتفاقاً میری ردا کی ہم شکل ہو لہٰذا میں نے بات صاف کر دی۔ تم سمجھدار ہو، فائدہ اور نقصان اچھی طرح سمجھتی ہو۔"

نورینہ میری باتیں خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلملانے لگے۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن الفاظ اس کی زبان سے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ کچھ دیر وہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھی رہی پھر دھیرے سے اُٹھ کر میرے روم سے باہر نکل گئی۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں کے موتیوں کو دیکھ کر میں تڑپ اٹھا۔ مجھے ردا کا بچپن یاد آیا۔ کسی بات پر روتے ہوئے اس کے آنسوؤں کا گرنا جسے دیکھ کر میں بے چین ہو اٹھتا تھا۔ اچانک ردا کا خیال آتے ہی میں چونک پڑا۔

"ماشاءاللہ میری ردا بھی اب جوان ہو گئی مجھے اس کے لیے بر تلاش کرنا چاہیے۔"

لیکن میں کیسے اس کے لیے کوئی موزوں لڑکا تلاش کروں؟ جو اسے تازندگی خوش رکھ سکے کیونکہ میں تو احساس کمتری کا شکار ہوں۔ نہ تو میرا کوئی دوست ہے اور نہ سماج میں کسی سے جان پہچان۔ میں نے تو کسی عزیز و اقربا کی خوشی یا غم کے موقع پر شرکت نہ کی۔ میں تو صرف گھر سے آفس اور آفس سے گھر کے راستہ سے واقف ہوں۔ اس مسئلہ پر میری کون مدد کرے گا۔ میرے ذہن کے دریچے میں ایک سے ایک سوالات ابھر رہے تھے۔ اس رات

پہلی بار میں پریشان ہوا۔ ردا کے بارے میں پہلی بار دماغ میں کوئی سوال ابھرا۔
دوسرے دن صبح ہی صبح صالحہ کا فون آگیا۔
"آپ دو دنوں کی چھٹی لے کر آجائیں۔ مجھے ردا کے سلسلہ میں کچھ باتیں کرنی ہیں۔"
"کیا بات ہے؟ خیریت ہے۔"
"ہاں" آپ آئیں تو کچھ کہوں۔"
فون منقطع ہو گیا۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ آخر کیا بات ہو گی۔ صالحہ نے کچھ واضح نہیں کیا۔ جب میں گھر پہنچا تو کوئی بات ایسی نظر نہیں آئی جو پریشان کن ہو۔ ردا مجھے دیکھتے ہی گلے لگ گئی۔ میرے گالوں پر کس کرنے لگی۔
"بابا آپ اچانک بغیر اطلاع کیسے چلے آئے۔ کوئی فون نہیں کیا۔"
مجھے بہت تعجب ہوا کہ صالحہ نے فون کی خبر ردا کو نہیں دی۔ اب میری تشویش بڑھی کہ صالحہ نے یوں فون کر کے کیوں بلایا۔ پورا دن ہنسی خوشی اور مذاق میں گزر گیا۔ لیکن میں ردا کو دیکھ کر نہ جانے کیوں حیرت میں پڑ گیا کہ کیا یہ وہی ردا ہے۔ کہاں وہ نو دس سال کی شوخ و چنچل سی ردا جس کی شرارتیں پورے گھر کو سر پر اٹھائے رکھیں، اور کہاں یہ ردا۔ کتنی تبدیلی آگئی ہے اس میں۔ اب تو اس میں کچھ سنجیدگی آگئی تھی۔ ماشاللہ یہ تو بڑی ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے دراز سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔
شب میں کھانے کے بعد صالحہ نے بتایا کہ ردا کے لیے ایک نسبت آئی ہے۔ لڑکا اور اس کے گھر والے مجھے پسند ہیں۔
"صالحہ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟"
"کیا وہ بچی ہے۔ میں جب آپ کے گھر میں آئی تھی تو میری عمر کیا تھی۔ لڑکا اچھا ہے برسر روزگار ہے۔ گاڑی ہے، کوٹھی ہے۔ راج کرے گی میری بیٹی۔ صرف آپ ان لوگوں سے مل لیں۔"
"ارے ہماری بیٹی اتنی بڑی ہو گئی کہ لوگ رشتہ دینے لگے اور مجھے خبر نہیں۔" پھر میں اس کی تنہائی کے کرب کو سوچ کر ہچکچاہٹ سے بولا۔
"تم کو اگر پسند ہے تو اقرار کر لو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ آپ باپ ہیں۔ آپ بھی تو اپنی نگاہ سے دیکھ کر پرکھ لیں۔"

"میں کیا دیکھوں یا بات کروں۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔" ایک لمحہ کے لیے میں گھبرا سا گیا۔

"یوں پریشان ہونے سے کوئی فائدہ؟ ایک نہ ایک دن بیٹی کی شادی کرنی ہے۔ اس وقت وہ اس عمر میں پہنچ گئی کہ اس کی شادی کردی جائے۔ نازک نازک سی، بہت پیاری دلہن ہوگی میری بچی۔" صالحہ تصورات کے دریا میں بہہ گئی۔

"میں شادی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ لڑکیاں کسی دوسرے گھر کی امانت ہوتی ہیں۔ ماں باپ تو صرف امین ہوتے ہیں، صرف پال پوس کر بڑا کرنے تک حق ہے۔ پھر شادی کے بعد تو وہ اپنے سسرال والوں کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتی۔ لیکن شادی کے سلسلے میں لڑکے والوں سے کیا باتیں کرنی چاہئیں۔ کیا رسم و رواج ہے مجھے علم نہیں۔ یہ باتیں سوچ کر ہی پسینہ آرہا ہے۔ تم ایسا کرو اپنے کسی بھائی کو بلالو۔ وہ ضرور تمہارے مسئلہ کو حل کردیں گے۔"

"اف! اف! میں کیسے سمجھاؤں اس کولہو کے بیل کو جو اپنے ہی سر میں گاتا جا رہا ہے۔ اچھا ٹھیک ہے میں ابھی فون کر کے اپنے بھائی کو بلاتی ہوں۔"

"اچھا، مرتا کیا نہ کرتا۔" میں نے ہتھیار ڈال دیا۔

جیسا کہ صالحہ نے بتایا تھا لڑکا اور اس کے گھر والے سبھی ٹھیک تھے بلکہ معیار سے کچھ بلند تھے۔ ردا کے ماموں نے ساری باتیں کیں۔ میں خاموشی سے یہ سوچنے لگا کہ کیا ردا یہاں ایڈجسٹ کرلے گی۔ ان لوگوں کے معیار کے مطابق میں جہیز کیسے مہیا کروں گا۔ اچانک لڑکے کے باپ نے مجھے متوجہ کیا۔

"جناب! آپ بھی تو کچھ بولیں۔"

"اجی صاحب! ان کی قوت گویائی جاتی رہی۔ بس باتیں سمجھ لیتے ہیں۔ اپنی زبان نہیں کھولتے۔" ردا کے ماموں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کیا کہا، میں گونگا ہوں۔" اچانک میری آواز نکلی اور سبھی متعجب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"ارے میں نے اسی لیے تو یہ جملہ کہا تھا کہ آپ کو تیر کی طرح چبھے اور آپ فوراً اپنی شیریں زبان سے کچھ ادا کریں۔" ردا کے ماموں فوراً بولے۔ پورے کمرے میں ایک قہقہہ گونج اٹھا۔ اچانک مجھے شرمندگی کا احساس ہوا اور میں پسینے میں نہا اٹھا۔

لڑکے اور اس کے گھرانے کو ردا بے حد پسند آئی۔ انھیں جہیز کی بالکل ضرورت نہ تھی وہ صرف ردا کو چاہتے تھے۔ پھر بھی میں ان کے مناسبت سے خود کو بہت پست محسوس کر رہا تھا۔ جس دن شادی کی تاریخ مقرر کرنے وہ لوگ میرے گھر پر آئے پورے علاقہ میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ محلے کے سبھی افراد کو ردا عزیز تھی۔ میں نے جہیز میں دینے کے لیے اپنی حیثیت سے بالاتر ایک حسین ساڈنر سیٹ خریدا اور اسے اپنے خاص روم میں پوشیدہ رکھا۔ اسی وقت ان لوگوں کی آمد کی خبر ملی۔ میں نے اوپری منزل سے نیچے لان میں گیٹ کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سجی ہوئی ایک نئی اسٹیم ماروتی آگے آگے اور اس کے پیچھے دوسری گاڑیاں گیٹ کے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ اچانک میری نظر ڈنر سیٹ پر پڑی۔ مجھے وہ تحفہ بہت ہی حقیر سالگا۔ میں اس کو صالحہ کی نظروں سے چھپانے کے لیے دوسرے ڈارک روم میں رکھنے جا رہا تھا تبھی مجھے ایک آہٹ سی سنائی دی۔

"کیا چیز ہے بابا؟" ردا میرے سامنے کھڑی تھی۔

"کچھ نہیں۔"

"نہیں آپ کچھ چھپا رہے ہیں۔" اس نے بڑھ کر میرے ہاتھ سے ڈنر سیٹ کا پیکٹ لے لیا اور اُسے کھولنے لگی۔ میں ساکت کھڑا اس کی تیز انگلیوں کو دیکھتا رہا۔ جیسے ہی اس نے پیپر ہٹا کر سیٹ کو دیکھا، کمرے میں اس کی ایک چیخ گونج اٹھی۔

"ہائے بابا۔ بیوٹی فل۔ کتنا خوبصورت ہے یہ سیٹ۔ میں اسے ضرور لے جاؤں گی۔" اس نے بڑھ کر میری پیشانی کا بوسہ لے لیا۔ میں ایک لمحہ کے لیے اس کی خوشی بھرے جذبات کو دیکھتا رہا پھر فوراً ہی چونک پڑا۔

"بیٹی! نیچے لان میں نئی ماروتی کے سامنے اس معمولی سے ڈنر سیٹ کی کیا اوقات۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"اوہ بابا، آپ کی دی ہوئی معمولی سے معمولی شے ایک انمول رتن کے برابر ہے۔ اس کے سامنے ماروتی یا قیمتی دوسری چیزیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ وہ ساری میرے لیے بیکار ہیں۔"

میں نے بڑھ کر ردا کو سینہ سے لگالیا۔ اسی وقت صالحہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

"آپ لوگ یہاں ہیں لوگ نیچے آچکے۔ جلدی چلئے۔" پھر وہ نیچے چلی گئی۔ شاید اس کی نظر ڈنر سیٹ پر نہیں پڑی۔

لڑکے کی ماں فرزانہ بیگم نے ردا کی مخروطی انگلی میں ایک طلائی انگوٹھی ڈال دی اور لڑکے کے باپ امیر صاحب نے ماروتی کی کنجی ردا کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولے۔

"بیٹی، یہ میری طرف سے حقیر نذرانہ۔"

ردا نے اپنی جھکی پلکوں کو اوپر اٹھایا۔ اس کی نظریں میری نظروں سے ٹکرائیں۔ آنکھوں کے اشارے سے میں نے اسے سلام کرنے کی ہدایت دی۔ منگنی کی رسم خوشگوار ماحول میں ادا کر دی گئی۔ شادی کی تاریخ ایک ماہ بعد ٹھہری۔

اب دونوں طرف مصروفیت بڑھ گئی۔ مہمانوں کی فہرست جب بننے لگی تو میرا احساس کمتری کا داروغہ پھر سامنے آگیا کیونکہ میرے اپنے ذاتی دوست واحباب زیادہ نہ تھے۔ میں صرف تھوڑے سے لوگوں سے متعارف تھا۔ وہ بھی صالحہ اور ردا کے ذریعہ۔ ردا کی سہیلی شازمہ کے باپ ڈاکٹر زین العابدین سے راہ ورسم بڑھ گئی تھی۔ انھیں مطلع کیا۔ نورینہ کے فادر سعید صاحب سری نگر سے تھوڑے تعلقات پیدا ہوئے، انھیں خبر کی۔ راحیل کمال کے پاپا کمال صاحب کو اطلاع دی۔ ان کے علاوہ آفس کے کچھ گنے چنے حضرات۔ میرا حلقہ بہت محدود تھا لیکن صالحہ کی ضد تھی کہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مدعو کروں۔ اس سلسلہ میں دیگر اخراجات اور زیادہ بھیڑ سے بھی میں گھبراتا تھا۔ ابتدا سے میں تنہائی پسند ہوں۔ لوگوں سے ملنا میری عادت نہیں لیکن صالحہ اور ردا کی باتوں کے سامنے مجھے خاموش رہنا پڑا۔ وہ تینوں سارے کام انجام دیتے رہے۔

جس دن بارات آنے والی تھی اس سے ایک دن قبل میں ساری رات سو نہ سکا۔ ردا سے بچھڑنے کا درد مجھے تڑپا رہا تھا۔ آنکھیں بند کیے میں ماضی کے سمندر میں اس کی پیدائش سے لے کر اب تک کے تمام مناظر میں غوطے لگا رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اسکرین پھیلا ہوا تھا۔ پورے آسمان جیسا۔ پرچھائیاں حرکت کر رہی تھیں۔ وہ چھوٹی بچی جس کی شفاف آنکھیں، گندم کے پکے ہوئے خوشوں جیسے سنہرے بال اور سیب جیسے سرخ گال سے لے کر ایک حور جیسی جوان لڑکی کے روپ میں میری آنکھوں میں آگئی۔ دل میں ایک بے

چینی سی بڑھی اور میں آنکھیں کھول کر اپنے بیڈ روم کا جائزہ لینے لگا۔ پورا کمرہ بلو نائٹ بلب کی ہلکی سی روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ میرے بیڈ کے بغل میں دوسرے بیڈ پر صالحہ سکون سے سو رہی تھی جیسے آج ہی اس نے ردا کو رخصت کر دیا اور اطمینان سے آرام کر رہی ہو۔ میرے دل میں ایک عجیب سی خلش پیدا ہوئی اور میں نے دھیرے سے اپنا بیڈ چھوڑا۔ روم کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ پورے مکان میں خاموشی طاری تھی۔ اچانک میری نگاہ ردا کے روم پر پڑی۔ اس کے کمرے میں تیز روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ میرے قدم ادھر بڑھ گئے۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ردا اپنے بیڈ پر بیٹھی کسی چیز کو دیکھ رہی تھی اور آہستہ آہستہ رو رہی تھی۔ میرا دل تڑپ اٹھا۔ بچپن میں بھی اس کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر میں بے چین ہو جاتا تھا۔ میرے قدم اس کے روم کی طرف بڑھے۔ اتفاقاً دروازہ کھلا تھا۔ میں خاموشی سے اندر داخل ہوا اور چپکے سے اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ پرانے البم کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ جس میں میری اور اس کی لاتعداد تصاویر تھیں۔ یہ تصویریں بھی کتنی یادگار ہوتی ہیں۔ ماضی کے نقوش کی ثبت۔ جان لیوا یادیں جو قید کرلی جاتی ہیں۔ ان تصویروں کو دیکھتے دیکھتے ردا کی آنکھوں میں موتیوں کی لڑیاں ٹوٹ کر ایک ایک کر کے گر رہی تھیں۔ میں نے دھیرے سے رومال نکالا اور ان انمول موتیوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ ردا نے مڑ کر دیکھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ میرے سینہ سے لگ کر رونے لگی۔

"بابا! آج کی رات میرے اس گھر کی آخری رات ہے۔" وہ سسکتی ہوئی بولی۔

"نہیں، نہیں یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔"

"مجھے معلوم ہے بابا۔ اب تو یہ گھر میرے لیے پرایا ہو جائے گا۔ آپ کا پیار اور آپ کی محبت بھی میرے لیے اجنبی بن جائے گی۔ وہ جوش اور ولولہ ختم ہو جائے گا جو بچپن سے آج تک تھا۔" ردا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ وہ اس طرح لرز رہی تھی کہ اس سے اچھی طرح بات بھی نہیں کی جا رہی تھی۔ اس کے الفاظ اور انداز نے میرے اندر طوفان برپا کر دیا۔ سسکیاں لیتی ہوئی ردا کی آنکھوں پر میں نے اپنے لبوں کو ثبت کر دیا۔ ان آنکھوں کا نمکین پانی میرے ہونٹوں سے ٹکرایا۔ میرے اندر ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی اور میں تڑپ اٹھا۔

"نہیں نہیں بیٹا، ایسا نہیں سوچتے۔ تو تو میری جان ہے۔ میری زندگی ہے۔ میرے

جسم کی روح ہے۔ تجھے میں کیسے جدا کروں گا۔ تیری محبت اپنے دل سے کیسے الگ کروں گا۔
لیکن بیٹی یہ رسم دنیا ہے قدرت کا حکم ہے۔ لڑکیاں پرائی امانت ہوتی ہیں۔ والدین کو صرف ان کی پرورش و نگہداشت کا حق ہے پھر ایک ایسا دن آتا ہے کہ وہ جس کی امانت ہوتی ہیں وہ آکر لے جاتا ہے۔ لڑکے کے والدین اس کے والدین بن جاتے ہیں۔ ان سے محبت اور ان کے حکم کی اطاعت ہی ان کا اہم فریضہ ہو جاتا ہے۔ بیٹا تم اپنے فرائض سے غافل نہ ہونا ورنہ تمہارا ابابا تمہاری تعلیم و تربیت میں لاپرواہی برتنے کے الزام میں بدنام ہو جائے گا۔ ممکن ہے اپنے گھر کو بنانے میں تمھیں کچھ قربانیاں دینی پڑیں۔ اپنی خواہشات کا گلا گھونٹنا پڑے یا اپنی آرزوؤں کو دبانا پڑے۔ انھیں کی ادائیگی پر ایک خوشحال گھر کی بنیاد ہے۔ لہٰذا تمہیں اپنے حسن سلوک سے سبھی کے دل کو جیتنا ہے۔ سبھی کو موہ لینا ہے۔ اس گھر کا دروازہ تمہارے لیے ہمیشہ کھلا ہے۔ جب بھی کسی رائے مشورہ کی ضرورت محسوس ہو، تم آسکتی ہو۔"

میں نے پتہ نہیں کتنے آبدار موتی اپنے رومال میں اکٹھا کیے۔ اس کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو میرے لیے ایک قیمتی سرمایہ تھے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میرے پیار کا کشکول بھر گیا۔ آج میری تپسیا مکمل ہو گئی۔ اپنی بیٹی سے بے حد پیار کرنے والے باپ کی دھڑکن کو میں سمجھتا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ اس کے ماتھے پر کوئی شکن نہ آئے۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکان آئی اور میں نے بڑھ کر اس کی پیشانی کا بوسہ لے لیا۔

دوسرے دن وہ پالکی میں سوار ہو کر اپنے گھر جا رہی تھی۔ بابل گائے جا رہے تھے۔ بڑے بوڑھوں کی آنکھیں نم تھیں۔ سہیلیوں کی سسکیاں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں اور صالحہ کا تو برا حال تھا۔ میں نے پہلی بار اسے یوں روتے دیکھا اور میں دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے سوچ رہا تھا۔

"کیا خداوند عالم بیٹیاں اسی لیے پیدا کرتا ہے کہ ہم ان کی پرورش کریں، اپنے دل میں اس کے لیے محبت، درد اور تڑپ کے احساسات پیدا کریں اور پھر ایک دن اسے جدا کر دیں۔ آخر ایسا کیوں؟"

●●

نثار احمد صدیقی

سودا

وہ باغیچے میں گلاب کی کیاریوں کے پاس ایک بنچ پر بیٹھی تھی، صبح کا وقت تھا اور اکتوبر کی ٹھنڈی، بوجھل بوجھل سی ہوا مشامِ جاں معطر کر رہی تھی، پھول آس پاس کھلے ہوئے تھے، زندگی کی چالیس بہاریں دیکھنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر اب تک شادابی تھی۔ دس سال پہلے شوہر کی ناگہانی موت نے پیٹریشیا کی زندگی ویران کردی تھی۔ مگر اب سب کچھ معمول پر تھا۔ وقت نے بہت سے زخم بھر دیے تھے۔ یا یوں کہا جائے کہ اس نے خود سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ آمدنی زیادہ نہیں تھی پھر بھی وہ اور اس کی اکلوتی سترہ سالہ بیٹی دونوں خوش تھے۔ قناعت اور سادگی، کفایت اور ہوش مندی سے پیٹریشیا نے تند و تیز وقت کا مقابلہ کر لیا تھا اور اپنا بھرم قائم کر رکھا تھا۔ کبھی وہ اپنی بیٹی سے کہا کرتی تھی کہ فضول خرچی نہیں کی جاتی ہے۔ سارا ہنر تو احتیاط میں ہے۔ آدمی چاہے تو شرمندگی و خواری سے بچ سکتا ہے۔ ذاتی معاملات اور تعلقات میں بھی وہ بے حد محتاط تھی۔ ہر اس بات سے احتراز کرتی جس سے ذہنی سکون پراگندہ ہونے کا اندیشہ ہو۔ مجموعی طور پر لوگ اسے ایک ہمدرد اور باوقار خاتون سمجھتے تھے۔ گئے دنوں میں اسے بحث و مباحثہ کا شوق تھا۔ اپنی بات منوانے، دلیلیں دینے کا شوق۔ اب بھی وہ سیاسی و سماجی بحثوں میں دلچسپی سے شریک ہوتی تھی مگر اپنی رائے سے ممکنہ حد تک اجتناب ہی کرتی تھی بلکہ اکثر و بیشتر اب ان اجتماعات میں اس کی حیثیت ایک مبصر اور تماشائی کی ہوا کرتی تھی۔

پیٹریشیا نے ساڑھے نو بجے ناشتہ کیا تھا اور اس کی بیٹی سوزین اب تک غائب تھی۔ بہر حال میزبان اور دوسرے بہت سارے مہمان وقت پر ناشتہ کرنے نہیں آسکے تھے۔ اس لیے سوزین کی یہ غیر حاضری درگزر کی جاسکتی تھی۔ سوزین سرکشی کی حد تک شوخ تھی اور شاعری کی حد تک حسین۔ اتنی کم عمری میں وہ اپنی عمر سے بڑے لوگوں پر غلبہ پا لیتی تھی۔ بلاشبہ اس میں

پتہ: پوسٹ بکس نمبر 17075، تلک نگر، چمبور، ممبئی

اس کی ذہانت کو بڑا دخل تھا۔ بسااوقات وہ کمزور ارادے کے لوگوں کو توزچ کر دیتی تھی۔ ماں اپنی بیٹی کی اس سرکشی کو اس کی ناپختہ کاری ہی پر محمول کرتی اور سوچتی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں لچک آہی جائے گی۔ وقت تو سب سے بڑا قاتل ہے۔

پیٹریشیا اپنی سوچوں میں گم تھی کہ سوزین کی آہٹ سے چونک پڑی اور اس کے چہرے پر شگفتگی چھاگئی۔ ''اتنی دیر میں اٹھی ہو تم......؟'' وہ کسی قدر ناراضگی سے بولی۔ ''اگر رات کو میری طرح جلد سو جاتیں تو صبح اتنی دیر سے نہ اٹھتی، دیکھو فضا میں ایسی تازگی ہے۔ مگر تم جیسے احمق بستر میں پڑے رہتے ہیں۔ دیر سے اٹھ کر تم نے ایک سہانی صبح کا لطف کھودیا۔''

سوزین پر ابھی تک خوابیدگی سی طاری تھی۔ انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ ''واقعی یہ ایک نرم و نازک صبح ہے۔''

''مجھے امید ہے کہ تم نے برج میں بڑی بڑی بازیاں نہیں لگائی ہوں گی۔ برج بہت کھیلنے لگی ہو تم۔''

سوزین نے ماں کی طرف جارحانہ انداز میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تھکن تھی۔ ''برج؟ نہیں تو البتہ ایک دو بار کھیلے تھے۔ رات کو، پھر بیکارٹ شروع کر دیا تھا۔''

''سوزین! تم زیادہ تو نہیں ہار رہی ہو نا۔؟'' پیٹریشیا نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

''پرسوں رات کو میں بہت بڑی رقم ہار گئی تھی۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''پھر یہ سوچ کر کل بھی کھیل میں شریک ہو گئی کہ ہارا ہوا حساب برابر کرلوں گی لیکن معلوم ہوا کہ بیکارٹ میرے مطلب کا کھیل نہیں ہے، کل میں پرسوں سے بھی زیادہ رقم ہار گئی۔''

''کیا کہہ رہی ہو تم۔'' پیٹریشیا نے گھبرا کر کہا۔

''بس ہو گیا۔'' سوزین ہونٹ سکوڑ کر بولی۔

''بہت برا ہوا، میں تم سے سخت ناراض ہوں، کتنی رقم ہاری؟''

سوزین اپنی انگلی میں ایک کاغذ لپیٹ رہی تھی، اس نے کاغذ سیدھا کیا اور تذبذب آمیز لہجے میں بولی۔ ''پرسوں میں سات سو دس ہاری تھی اور کل رات گیارہ سو بیس۔''

''گیارہ سو بیس کیا۔؟''

''پونڈ۔'' سوزین نے سادگی سے جواب دیا۔

"سوزین۔ !یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔" پیٹریشیا چلا اٹھی۔

"جی۔ کل اٹھارہ سو بتیس۔"

پیٹریشیا گنگ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد سنبھل کر بولی۔ "تم پاگل ہو گئی تھیں؟ آخر ہم اتنی بڑی رقم کہاں سے دیں گے؟ ہمارے پاس تو کوئی چیز بھی اتنی قیمتی نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایک قلیل آمدنی میں ہم کتنی مشکل سے گزارا کر رہے ہیں۔ ہم تباہ ہو جائیں گے، برباد ہو جائیں گے۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے، اگر ہم نے یہ رقم نہ دی تو سماجی طور پر برباد ہو جائیں گے، پھر ہمیں کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔"

"آہ خدایا۔ تم نے یہ کام کیسے کیا سوزین؟" پیٹریشیا کی آواز بھرا گئی۔

"اب یہ سوال کرنے سے کیا فائدہ ممی؟ جو ہونا تھا ہو گیا، میرا خیال ہے جوئے کا رجحان مجھے ورثے میں ملا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ تمہارے والد نے تاش کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا نہ وہ کبھی ریس کے قریب پھٹکے، اور مجھے تو تاش کے پتوں کی پہچان تک نہیں ہے۔"

"بسا اوقات جو چیزیں دوسرے خونی رشتوں سے منتقل ہوتی ہیں اور جب اگلی نسل میں پہنچتی ہیں تو ان میں شدت آجاتی ہے۔" سوزین اطمینان سے کہہ رہی تھی۔ "ماموں کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟ وہ تو اسکول سے بھاگ کر اپنی کتابیں تک بازی میں لگا دیتے تھے۔ اگر وہ اتنے زبردست جواری نہ ہوتے تو مجھ میں یہ جراثیم کیسے آسکتے تھے۔"

"کتنے آدمیوں کا قرض ہے تم پر؟"

"خوش قسمتی سے ایک ہی آدمی کا۔ ایشلے جیروم کا۔" سوزین نے بتایا۔ پرسوں اور کل زیادہ تر وہی جیتتا رہا۔ تاش کا بڑا اچھا کھلاڑی ہے۔ شاید اسے آپ جانتی ہوں۔ بدقسمتی سے وہ زیادہ مالدار نہیں ہے اس لیے جوئے میں جیتی ہوئی یہ رقم وہ نظر انداز نہیں کرے گا۔ وہ بھی ہماری طرح ایک مہم جو ہی ہے۔"

"ہم مہم جو ہیں۔" پیٹریشیا نے احتجاج کیا۔

جو لوگ مہمانی کے شوق میں شہر آئے اور اپنی بساط سے زیادہ بڑی بڑی بازیاں جوئے میں لگا دیتے ہیں۔ میرے خیال میں انھیں مہم جو ہی کہنا چاہئے۔" سوزین تنک کر بولی۔ وہ اپنی

ماں کو بھی اس لغزش میں ملوث کرنا چاہتی تھی۔

"کیا تم نے اسے بتادیا کہ ہم کس مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔" پیٹریشیا نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

"ہاں...... میں اس وقت آپ سے یہی بات کرنے آئی ہوں۔ میں نے ایشلے جیروم سے گفتگو کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس کے قرض سے چھٹکارا پانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ وہ بہت تشنہ کام، حسرت زدہ سا معلوم ہوتا ہے۔" پیٹریشیا چونک کر بولی۔

"حسرت زدہ!" پیٹریشیا چونک کر بولی۔

"عاشق مزاج۔" سوزین نے پر سکون لہجے میں کہا۔ "دراصل توقع کے خلاف وہ محبت کا شکار ہو گیا ہے۔"

"ہاں وہ ایک شائستہ اور خوش اخلاق آدمی ہے۔ دوسروں کی باتیں توجہ سے سنتا ہے۔" پیٹریشیا نے ایشلے جیروم سے اپنی رسمی ملاقاتیں یاد کرتے ہوئے کہا۔

"کیا واقعی اس نے شادی کی پیش کش......؟"

"آپ ٹھیک سمجھیں۔ وہ شادی ہی کرنا چاہتا ہے۔ نہ معلوم وہ ایک مثالی شوہر ثابت ہوگا یا نہیں۔ مگر اس کی اتنی حیثیت ضرور ہے کہ اس کے ساتھ اچھی زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ کم سے کم اس سے تو اچھی، جیسی ہم گزار رہے ہیں۔ اس کے علاوہ خاصا وجیہ اور شان دار آدمی بھی ہے۔ اگر ہم نے اس کی پیش کش قبول نہ کی تو ہمیں اپنی چھوٹی سے جائداد فروخت کرکے اس کا قرض اتارنا پڑے گا، پھر میں کوئی ملازمت ڈھونڈتی پھروں گی اور آپ رات دن سوئی دھاگا لے کر اپنی آنکھیں پھوڑتی رہیں گی۔ فی الحال ہماری زندگی اچھی خاصی گزر رہی ہے۔ تھوڑی بہت عزت بھی ہے اور ہمیں تقریبات میں بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ اگر یہ آمدنی ختم ہوگئی تو زندگی عذاب ہو جائے گی، آپ کی رائے جو کچھ بھی ہو، مگر میرا خیال ہے یہ تجویز زیادہ قابل اعتراض نہیں ہے۔"

"اس کی عمر کیا ہوگی؟" پیٹریشیا نے پوچھا۔

"اڑتیس سال یا ایک دو سال زیادہ۔"

"کیا وہ تمھیں پسند ہے۔؟"

سوزین ہنس پڑی۔ "آپ کو پسند ہے تو مجھے بھی پسند ہے اور اب اس میں پسند ناپسند

ما سوال بھی کیا ہے۔

پیٹریشیا نے رونا شروع کر دیا۔ ”آہ ہم کس مصیبت میں پھنس گئے۔ ذرا سی رقم اور سماجی حیثیت کے لیے کتنی بڑی قربانی دینا پڑے گی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کبھی ہم پر یہ پہاڑ ٹوٹے گا۔ میں نے بس کتابوں میں پڑھا تھا کہ بعض لڑکیوں کو معاشی ابتری کے باعث ناپسندیدہ آدمیوں سے شادی کرنا پڑتی ہے۔“

”آپ کو ایسی فضول کتابیں نہیں پڑھنا چاہئیں۔“ سوزین نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

”مگر اب تو یہ ہمارے ساتھ بیت رہا ہے۔ میری اپنی بچی قربان ہو رہی ہے، وہ ایک ایسے شخص سے شادی کرنے پر مجبور ہے جو عمر میں اس سے بہت بڑا ہے اور جسے وہ پسند بھی نہیں کرتی۔“

”نہیں۔ ممی!“ سوزین نے اسے ٹوکا۔ ”میں شاید وضاحت نہیں کر سکی، وہ مجھ سے شادی کے لیے نہیں کہہ رہا ہے، اسے مجھ جیسی شوخ اور سرکش لڑکیاں بالکل نہیں بھاتیں، وہ تو پختہ عمر کی عورتوں کا دلدادہ ہے، اسے دراصل آپ سے محبت ہو گئی ہے۔“

”مجھ سے؟“ پیٹریشیا کی چیخ نکل گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بیٹی کی صورت دیکھنے لگی۔

”ہاں وہ کہتا ہے کہ آپ اس کا مثالیہ ہیں۔ آپ کی تعریف میں اس نے نہ جانے کیا کیا الفاظ استعمال کیے تھے۔ میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ مسٹر! اگر ہمارے مالی حالات خراب نہ ہوتے تو میں ممی سے ہرگز تمہاری شادی کی سفارش نہ کرتی مگر اب..... اب یہ قرض صرف اسی صورت میں اتر سکتا ہے۔ ممی پلیز! چند منٹ بعد وہ خود آپ کے پاس آنے والا ہے۔“

لیکن بیٹی۔۔۔“

”مجھے معلوم ہے ممی کہ آپ اس سے زیادہ واقف نہیں ہیں، مگر ایسے حالات میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ آپ ایک شادی پہلے بھی کر چکی ہیں اور سنا ہے دوسرا شوہر ایک اینٹی کلائمکس کی طرح ہوتا ہے۔ اوہ..... وہ دیکھئے! انشلے جیروم آ رہا ہے۔ میں اب چلتی ہوں۔ ظاہر ہے آپ دونوں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا اور سمجھنا چاہیں گے۔“

سوزین یہ کہہ کر دوسری جانب چل پڑی۔

●●

ساجد حمید

سود و زیاں

شامت آتی ہے تو پوچھ کر نہیں آتی۔ اچھا خاصا آدمی ایسی ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہے کہ آنے والی سات پیڑھیاں بھی اس کا تدارک کر نہیں پاتیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

میں آپ سے متفق ہوں۔

ہمارے پڑوسی ہی کو لیجیے، کیا باغ و بہار آدمی تھا۔ بے چارے کو دنیا کی نظر لگ گئی۔

آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟

بڑے میاں کی، اور کس کی۔ آپ انھیں نہیں جانتے۔

نہیں!

ایک ہی کے محلے میں تو رہتے ہیں۔

صرف یاد اللہ ہے، دیکھا ہے۔ جانا نہیں۔

کیا مطلب؟

معاملے کے بغیر آدمی جانا نہیں جا سکتا۔

کیا آپ نے ہر آدمی کو اسی طرح جانا ہے؟

جی ہاں۔ حدیث شریف میں بھی یہی آیا ہے۔

دھت تیری کی۔ اب بحث کی گنجائش ہی کہاں۔ فرض کیجیے میں ملی ہوں، آپ اپنی بات کیسے منوائیں گے۔

بہت آسان ہے۔ وہی کہہ دیجیے جو اکثریت کہتی ہے۔

اچھا تو یہ نسخہ ہے آپ کا۔

کیوں نہ ہو!

یہ کل یگ ہے بھائی۔ اکثریت کی باتوں پر کیوں کہ ایمان لایا جا سکتا ہے

بغیر آگ کے دھواں نہیں اٹھتا۔
چلئے مان لیتے ہیں۔ کیا آپ آدمی کو جاننے کے بعد ہی معاملہ کرتے ہیں؟
نہیں۔ عوام کی رائے پیش نظر رہتی ہے اور معاملہ کے بعد مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔
یوں کہیے کہ آپ نے بھی دھوکے کھائے ہیں۔
ہاں اسی کو تجربہ کہتے ہیں۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑا ہے۔
تو پھر بڑے میاں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔
کل تک اچھے تھے، آج برے ہو گئے۔
میں عوام کی نہیں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔
میری رائے بھی وہی ہے۔
اچھا ایک بات بتائیے، انھوں نے جو کیا وہ ٹھیک تھا؟
کیا کیا انھوں نے؟
بیوی سے طلاق اور سالی سے شادی!
کوئی مجبوری رہی ہو گی۔
کیا خاک مجبوری ہو گی۔
آپ کو بھلا اعتراض کیوں ہونے لگا، بیاہ رچایا ہے، بھگا کو تو نہیں لے گئے۔
مجھے ہی کیا سارے محلے کو اعتراض ہے، آپ کے سوا۔
کوئی مصلحت رہی ہو گی، سالی بھی تو بیوہ تھی۔
کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ضرور ہے۔
کیا آپ پولس میں تھے؟
نہیں تو!
پھر شک کیوں کر رہے ہو بے چارے پر، انھوں نے جو کیا شرع کی رُو سے جائز ہے۔
جوان بچیوں کے بارے میں بھی سوچا ہوتا۔
کیا فرق پڑتا ہے؟
بہت برا، کون انھیں بیاہ لے جائے گا۔

زمانہ بدل چکا ہے بھائی۔
آپ کی سوچ ہی عجیب ہے ...... بے چاری لڑکیاں!
زبانی ہمدردی جتانا کوئی آپ سے سیکھے۔
تو کیا کروں؟ بہو بنا کر گھر لے آؤں؟
ارے ہاں، یہ تو آپ ہی کر سکتے ہیں۔
توبہ توبہ، میری کیا مت ماری گئی ہے!
بھئی زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے آپ ہی لکیر کے فقیر
کیا مطلب؟
اب مجھے مطلب بھی سمجھانا پڑے گا۔
دیکھئے جناب یہ ہندوستان ہے امریکہ یا فرانس نہیں۔ اب بھی ہم میں روحانی اور اخلاقی قدریں موجود ہیں۔
قدریں! اصل زندگی سے ان کا کیا واسطہ، یہ تو آجکل کتابوں میں بند ہیں۔
لگتا ہے بڑے میاں کا جادو آپ پر بھی چل گیا ہے۔
کیسا جادو!
تبھی تو آپ بڑھ چڑھ کر ان کی حمایت کر رہے ہیں۔
دیکھئے نا میں ان کا حامی ہوں اور نہ مخالف، جو سچائی ہے وہ پیش کر رہا ہوں کیوں کہ آج کل آدمی صرف اپنے حساب سے جی رہا ہے۔
معاشرے میں رہتے ہوئے وہ اپنے حساب سے کیسے جی سکتا ہے؟
کیا ہم نہیں جی رہے ہیں!
جی تو رہے ہیں لیکن معاشرے کے حساب سے
اب چھوڑیے بھی..... آپ بڑے میاں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں جب کہ ماضی قریب میں شہر کی ایک معزز ہستی نے بھی ایسی حرکت کی تھی۔
دیکھئے ان لوگوں کی بات اور ہے۔
کیوں؟ وہ بھی تو اسی معاشرے میں رہتے ہیں!
معاشرے میں رہتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔

وہ کیسے؟

اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں......

اسی لیے میں نے کہا تھا کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ بڑے میاں کے اس فعل سے آپ کے ہاضمے پر کیوں اثر پڑنے لگا؟

آپ میرے ہاضمے کی بات کر رہے ہیں یہاں پورا محلہ درد شکم سے کراہ رہا ہے۔

نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں یوں کہیے چٹخارے لینے کے لیے موضوع ہاتھ آ گیا۔

کیا اس کا اثر ہمارے بچوں پر نہیں پڑے گا؟

ضرور پڑے گا۔ لیکن اثر منفی ہو گا یا مثبت اس کا انحصار ان کی تعلیم و تربیت پر ہے۔

تعلیم اور ہماری قوم!

کیا آپ باور کرانا چاہتے ہیں کہ منفی اثر کے سوا کچھ نہیں پڑے گا۔

یقیناً اب تو آپ مان گئے نا کہ بڑے میاں نے جو کیا وہ سراسر غلط تھا۔

نہیں!

کیوں نہیں!

اس لیے کہ بڑے میاں نے جو صحیح سمجھا وہ کیا۔ آپ کو ان کے نجی معاملے میں مداخلت کا حق نہیں پہنچتا۔

کیا یہ ان کا نجی معاملہ ہے؟

بالکل!

اس کا منفی اثر جو بچوں پر پڑا، اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

ان کے اپنے والدین پر، کیا آئے دن شہر میں وارداتیں نہیں ہوتیں؟

کیا مطلب؟

اب چھوڑیے ان باتوں کو، یہ بتائیے آپ کے گھر کا ماحول کیسا ہے؟

بالکل ویسا ہی جیسا کہ ایک شریف آدمی کے گھر کا ماحول ہوتا ہے۔

میرا مطلب ہے آپ کا خاندان اجتماعی زندگی گزار رہا ہے یا انفرادی؟

ایک چھت کے نیچے بسر کر رہے ہیں تو اجتماعی زندگی گزارنا ہوا۔

وہ کیسے؟

کیا آپ کے بچے آپ سے کسی بات پر مشورہ کرتے ہیں، صلاح لیتے ہیں؟
انھیں اس کی کیا ضرورت، وہ بالغ ہیں، تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہیں۔
تو پھر یہ اجتماعی زندگی کہاں ہوئی، کیا آپ اپنے بزرگوں سے مشورہ نہیں کرتے تھے۔
بھئی وہ دور الگ تھا۔
تو آپ مان رہے ہیں کہ تبدیلیاں نامانوس طور پر در آئی ہیں!
آپ کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہیں؟
یہی کہ اب گھروں میں جذباتی ہم آہنگی نہیں رہی، آپ کا بچپن گاؤں میں گزرا ہوگا؟
ہاں، یقیناً!
آپ کو چوپال یاد ہے۔
کیوں نہیں!
آپ اب بھی گاؤں آتے جاتے ہوں گے؟
سال میں ایک آدھ بار۔
کیا وہاں چوپال اب بھی موجود ہے؟
ارے کہاں، وہ تو بھولی بسری یاد بن چکا ہے۔ چوپال تو اس وقت کی ضرورت تھا، اب نہیں رہا۔
کیوں نہیں رہا؟
اب کس کے پاس اتنا وقت ہے رات گئے تک گپ شپ اڑاتا رہے۔
کیا وہاں صرف گپ شپ ہوتی تھی؟
نہیں تو، دوسرے مسائل پر بھی گفتگو ہوتی تھی۔
کیا وہاں مذہب وملت کی تفریق تھی۔
بالکل نہیں!
کیا وہاں لوگ دوسرے کے غم اور خوشیوں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔
ہاں یہ بات درست ہے کہ لوگ ایک کنبے کی طرح رہتے تھے۔

تو آپ مان رہے ہیں کہ چوپال قومی یکجہتی اور اجتماعی زندگی کا بنیادی اسکول تھا۔

ہاں اس وقت کی ضرورت تھی۔

نہیں بھائی یہ اس وقت کی نہیں بلکہ آج کی ضرورت ہے کیوں کہ آج لوگ ایک چھت کے نیچے بسر کرتے ہوئے بھی اجنبی ہیں۔ نہ ایک دوسرے کی خوشی میں شریک ہوتے ہیں اور نہ غم۔ میں سب اپنے حساب سے جی رہے ہیں۔ اور بھائی۔

آپ کہاں کھو گئے؟

●●

گلشن کھنہ
لندن

مسٹر ٹاٹ

پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہجرت کر کے وہ دہلی میں بس گیا تھا اور محکمۂ صحت میں ملازمت کرتے ہوئے اسے دس سال بیت گئے تھے۔ وہ ایک کلرک تھا اور اسے ابھی تک کوئی ترقی نہیں ملی تھی اور نہ ہی اس کی مالی حالت پہلے سے بہتر ہوئی تھی۔ اس لیے ہر برس نئے نئے سوٹ سلوا کر پہننے سے وہ قاصر تھا مگر اس کے دفتر کے دوسرے ساتھی اچھے اچھے کپڑے پہن کر آفس آتے تھے۔ موسم سرما کے شروع ہوتے ہی گیبر ڈین ترویرا، ٹیریلین اور خالص اونی کپڑوں کے سوٹ تیار ہونے لگتے تھے۔ مگر خستہ حالی کی وجہ سے اس نے آج تک نیا گرم سوٹ نہیں پہنا تھا۔ اس کے پاس پٹی کا ایک پرانا سوٹ تھا جو اس نے دہلی میں نوکری ملنے پر سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کی ایک دوکان سے خریدا تھا۔ پورے دس برس تک یہ پرانا سوٹ موسم سرما میں اسے سردی سے بچاتا آ رہا تھا۔ مگر لگاتار استعمال سے وہ کوٹ اور پتلون گھس گھس کر بیکار ہو گئے تھے اور اس سوٹ نے اپنی بے چارگی کا اعلان بھی کر دیا تھا مگر اس نے اپنی گھسی ہوئی پتلون کو پیوند لگا کر گزارا کرنا شروع کر دیا تھا۔ کوٹ کی حالت تو قابل رحم ہو چکی تھی اور وہ گھس گھس کر ایک ٹاٹ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ شاید اسی لیے اس کے دوستوں نے اسے مسٹر ٹاٹ کہہ کر پکارنا شروع کر دیا تھا۔ دفتر میں جب بھی کوئی دوست یا جان پہچان والا کوئی شخص اسے ایک نظر بھر کر دیکھ لیتا تو اسے جھرجھری سی ہونے لگی اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے جسم پر کوئی بھی کپڑا نہ ہو، بلکہ وہ سب کے سامنے اکیلا ننگ دھڑنگ گھوم رہا ہو۔ ایسے مواقع پر وہ نہایت پریشان ہو جاتا اور سخت سردی کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگتے۔ اسے اپنی کمزوری کا شدت سے احساس ہونے لگتا۔ لوگوں کی طنزیہ نظروں سے بچنے کے لیے وہ غسل خانے میں گھس جاتا اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بڑبڑانے لگتا۔ "کسی غریب پر رحم کھانا چاہیے۔ مگر

غریبوں کی کوئی نہیں سنتا۔ یہ ہمارا سیکشن آفیسر بھی کتنا بے رحم ہے۔ غرباء کے لیے کوئی بھلائی نہیں کر رہا۔" وہ بڑی سادگی سے یہ سوال اپنے آپ سے کرتا اور پھر دفعتاً ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہو جاتی اور وہ پھر بولنے لگتا۔ "واہ! تو بھی تو بے رحم ہی ہے۔ تو اگر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے تو یہ کوٹ پتلون بھی سوچتے ہوں گے کہ ہم بھی کیسے شریف آدمی کے پلّے پڑے ہیں۔ ہمیں چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتا۔" وہ یہ سوچتا ہوا غسل خانے سے نکل کر گنگنانے لگتا اور اس کا دفتر قہقہوں سے گونج اٹھتا تو وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ چاروں طرف سے طنزیہ قہقہے اس کے کانوں میں گونجتے۔ اس کی بے بسی اور بے کسی کا مذاق اڑاتے اور وہ سہم کر رہ جاتا۔ پھر وہ سوچنے لگتا۔ اپنے بارے میں اپنے دوستوں کے بارے میں۔ اپنے سیکشن آفیسر کے بارے میں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے سیکشن آفیسر کا بھڑکیلا اور شاندار لباس کہاں سے آیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کے بڑے بڑے لوگوں کی سفارش سے وہ سیکشن آفیسر بن گیا تھا۔ اسے اپنے ساتھیوں اور سیکشن آفیسر پر بہت غصہ آتا مگر یہ سوچ کر کہ وہ اپنے سیکشن آفیسر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، خاموش ہو جاتا۔

ایک صبح جب وہ آفس میں داخل ہوا تو اس کے سیکشن کے ایک دوسرے کلرک روندر نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "کیوں بھائی مسٹر ناٹ یہ تمہارا کوٹ ہے یا ڈسٹ بن؟" اس کے ساتھ ہی ایک طنزیہ قہقہہ گونج اٹھا۔ پھر گور بخش نے جملہ کسا۔ "معلوم ہوتا ہے مسٹر ناٹ نے سارے شہر کا کوڑا کرکٹ اس میں ڈالنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔" یکایک پھر سارا دفتر فلک شگاف قہقہوں سے گونج اٹھا مگر وہ سر جھکائے کرسی پر بیٹھا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ اس کمرے میں بیٹھا رہے گا دفتر کے سب ساتھی اس کے بے کسی اور مجبوری پر قہقہے لگاتے رہیں گے۔ اس کی بے بسی کا مذاق اڑاتے رہیں گے۔

دوستوں کے اس رویے سے وہ کافی تنگ آ چکا تھا اور ان سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ اس پرانے سوٹ کو اتار پھینکے اور ایک نیا سوٹ سلوا لے۔ مگر خستہ حالی کی وجہ سے اس کے لیے ایسا کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ گرم کپڑے کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی تھیں اور آج کل تین سو روپیہ فی میٹر سے کم قیمت کا کپڑا ملنا بہت ہی مشکل تھا اور اس بھاؤ کا کپڑا خریدنے کی اس میں سکت نہیں تھی۔ ایک اونی سوٹ تیار کروانے کے لیے کم از کم پندرہ سو روپے درکار تھے اور وہ اتنی بڑی رقم اپنی تنخواہ سے زندگی بھر نہیں بچا سکتا تھا۔ وہ پھر سوچنے

لگتا، اپنے بارے میں، اپنے گرم سوٹ کے بارے میں، اپنے ان دوستوں کے بارے میں جن کی ستم ظریفیوں کا وہ شکار ہو چکا تھا۔ جن کے زہر بھرے الفاظ اس کے کان بہرے کر رہے تھے۔ "یہ دوست مجھے چین سے جینے کیوں نہیں دیتے۔ کیا انھیں میری مجبوریوں کا ذرا بھی احساس نہیں۔ ان کے طنزیہ جملے سن سن کر میرے کان بھی پک گئے ہیں۔ کوئی عجب نہیں کہ ان کی یہ زہر بھری باتیں سن کر میں پاگل ہو جاؤں۔ ہا...... ہا...... ہا......" وہ سوچتے سوچتے ایسے قہقہے لگانے لگتا جن سے حقارت اور تلخی کی بو آتی تھی۔

دوسرے دن جب وہ دفتر پہنچا تو سیکشن آفیسر نے اسے اپنے پاس بلایا اور کہا۔ "دیکھو بھائی مسٹر ٹاٹ، ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی طرف سے اگلے ہفتہ دہلی میں ایک نمائش لگ رہی ہے اور سنٹرل گورنمنٹ کے آرڈرز کے مطابق میں نے تمہارا بھی وہاں انتظام کر دیا ہے۔ ہر ہفتہ اور اتوار کو تمہاری ڈیوٹی وہاں ایک گیٹ کیپر کی حیثیت سے ہوگی۔ تمھیں وہاں پر سات روز کام کرنا ہے۔ ان سات دنوں میں تمھیں تقریباً بارہ سو روپے آمدنی ہو جائے گی۔ اور......" ابھی سیکشن آفیسر نے اپنا جملہ ختم بھی نہیں کیا تھا کہ اسسٹنٹ رو ندر بول اٹھا۔ "اور شاید اس طرح اس غریب سوٹ کو بھی تم سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ یقین مانو مسٹر ٹاٹ! ہمیں تم سے زیادہ ان کوٹ اور پتلون پر ترس آتا ہے۔ اب بے چارے اس سوٹ نے کھڑکیوں اور روشندان سے جھانک جھانک کر یہ کہنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے آزاد کر دو۔ مجھے آزاد کر دو۔" اس کے ساتھ ہی ایک زوردار قہقہہ گونجا اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اگلے ہفتے سے اس نے نمائش پر جانا شروع کر دیا۔ وہ صبح آٹھ بجے ہی گورنمنٹ آف انڈیا کے پویلین پر پہنچ جاتا اور شام کے آٹھ بجے تک وہاں کام کرتا رہتا۔ کبھی کبھی تو وہ اس قدر تھک جاتا کہ وہ دن بھر کی بھاگ دوڑ سے گھبرانے لگتا۔ مگر اسی لمحے نئے سوٹ کا جذبہ اس کے اندر ایک نیا ولولہ، ایک نیا جوش بھر دیتا۔ شام کے آٹھ بجے جب وہ گھر لوٹتا تو دن بھر کی تھکان اسے لوری دے کر سلا دیتی۔

نمائش کے اختتام پر جب تنخواہ کے علاوہ اس کی ہتھیلی پر سو سو کے بارہ نوٹ آئے تو وہ نئے نوٹوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہ کرنسی نوٹ نہ ہوں بلکہ کسی ولایتی اونی کپڑے کے تھان ہوں۔ وہ زائد رقم پاکر بہت ہی مسرور ہوا تھا۔ اسی روز اپنی سائیکل لے کر دفتر سے وہ سیدھا چاندنی چوک جا پہنچا اور جس دوکان پر سب سے پہلے اس کی

نظر پڑی وہ اسی میں جا گھسا۔ اس دوکان میں ایک اور شخص جس نے شاندار اونی کپڑے کا گرم سوٹ زیب تن کر رکھا تھا دوکاندار سے محو گفتگو تھا۔ شیشے کی الماریوں میں لٹکے قسم قسم کے اونی کپڑے جھلملا رہے تھے اور دوکاندار اس گاہک سے کہہ رہا تھا کہ "لیجیے جناب یہ امپورٹڈ گیبرڈین ہے۔ چاہے آپ کتنی بار دھلوا کر اسے استعمال کریں مگر کیا مجال جو رنگ میں فرق پڑ جائے۔ نہ یہ ڈرائی کلین سے خراب ہو اور نہ ہی سورج کی کڑی دھوپ اس کا کچھ بگاڑ سکے۔ اگر سالہا سال کے استعمال کے بعد اس کی کوالٹی میں فرق پڑ جائے تو کپڑے اور سلائی کے دام واپس کر دیے جائیں گے۔" دوکاندار کی یہ بات سن کر وہ بہت خوش ہوا کیونکہ اسے بھی ایسا ہی کپڑا درکار تھا۔ اس کے پہلے سوٹ کے کپڑے کا رنگ کسی پھلبہری کے مریض کی طرح چتکبرا ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ ایسا کپڑا ہی اس کے سوٹ کے لیے موزوں رہے گا۔ اس کپڑے کو دیکھنے کے لیے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ دوکاندار نے ایک نظر اس کے لباس پر ڈالی اور ناک چڑھاتا ہوا بولا۔ "کیا چاہیے آپ کو؟"

"مجھے ایک سوٹ کا کپڑا چاہیے۔ کیا بھاؤ ہے اس کپڑے کا؟" اس نے سوال کیا۔

"یہ کپڑا آپ کے مطلب کا نہیں۔" یہ کہہ کر دوکاندار نے پھر پہلے گاہک کی طرف رجوع کیا۔ "ہاں جناب پھر دے دوں چار سوٹوں کا کپڑا۔ واہ صاحب واہ! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ کے پاس پیسے کی کیا کمی ہے۔ راجہ کے گھر میں موتیوں کا کال اور پھر ہم آپ سے پیسے مانگتے ہی کب ہیں۔ آپ جیسے حضرات کی خدمت کر کے ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے۔"

"اس کپڑے کا کیا بھاؤ ہے؟" بیٹھے بیٹھے مسٹر ٹاٹ نے پھر پوچھا۔

"جو بھاؤ مرضی دے دینا۔" یہ کہہ کر دوکاندار نے گھٹیا کوالٹی کے کپڑے کے تین چار تھان اس کی طرف پھینک دیے اور کہا "یہ دیکھ لیجیے اور بتائیے آپ کو کون سا کپڑا چاہیے؟"

"اس کپڑے کا کیا بھاؤ ہے؟" مسٹر ٹاٹ نے ایک تھان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "بہت سستا ہے۔ صرف اڑھائی سو روپیہ فی میٹر۔ تین میٹر یعنی ایک سوٹ کے لیے صرف ساڑھے سات سو روپے۔"

"یہ لیجیے ساڑھے سات سو روپے۔ مجھے ایک سوٹ کا کپڑا دے دیجیے۔" مسٹر ٹاٹ نے جیب سے رقم نکال کر دوکاندار کو دی تو اس نے تین میٹر کا ایک پیس کاٹ کر اس کی

طرف بڑھادیا۔ وہ سوٹ کا کپڑا لے کر خوشی سے جھومتا ہوا گھر کی طرف ہو لیا۔ راستے میں پہاڑ گنج کے ایک ٹیلر ماسٹر سے سوٹ کی سلائی کے دام سن کر حیران رہ گیا۔ کپڑے کی قیمت سے زیادہ سلائی کی اجرت مانگ رہا تھا۔ اس لیے وہ موتی نگر کی طرف ہو لیا۔ وہاں اس کا ایک دوست رہتا تھا جس سے اکثر وہ اپنے بچوں کے کپڑے سلوایا کرتا تھا۔ وہ سوٹ کا کپڑا لے کر سیدھا اس کے پاس پہنچا اور ہفتہ میں سوٹ تیار ہو جانے کا وعدہ لے کر گھر پہنچ گیا۔

ایک ہفتہ بعد اس کا نیا گرم سوٹ بن کر تیار ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا سوٹ تھا جو اس نے خود بنوایا تھا۔ دوسری صبح جب وہ اپنا نیا سوٹ پہن کر دفتر پہنچا تو حسب معمول اس کے دفتر کے دوسرے ساتھی کمرے میں کہیں نظر نہ آئے۔ آج وہ وقت سے پہلے آفس پہنچ گیا تھا۔ وہ بہت شاد اور مسرور نظر آرہا تھا۔ اسے اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ اب اسے کوئی مسٹر ٹاٹ نہیں کہے گا۔ اب کوئی بھی بھری محفل میں اس کا مذاق نہیں اڑائے گا۔ اب دفتر کے چپراسی اسے دیکھ کر چہ میگوئیاں نہیں کریں گے بلکہ جھک کر ادب سے سلام کریں گے۔ اسی اثناء میں جب اس نے اپنے ڈپٹی سکریٹری کو اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ چوکنا ہو گیا۔ جب وہ آفیسر اس کے قریب آیا تو اس نے اپنی گردن اونچی کر کے اسے ''گڈ مارننگ'' کہا۔ ڈپٹی آفیسر نے اس کا نیا سوٹ پسند کر لیا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اتنے میں اس کا سیکشن آفیسر کمرے میں داخل ہوا اور اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''ہیلو مسٹر ٹاٹ۔ ارے بھائی آج تم اس قدر بدلے ہوئے نظر آتے ہو کہ پہچانے ہی نہیں جاتے۔'' سیکشن آفیسر کا یہ جملہ تیر کی طرح اس کے سینے میں چبھ گیا۔ اسے مسٹر ٹاٹ کے نام سے نفرت ہو چکی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے سیکشن آفیسر کا منہ نوچ لے۔

اسی لمحے اس کے دوسرے ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے اور اسے دیکھتے ہی رونڈر نے فقرہ کسا۔ ''ہیلو مسٹر ٹاٹ۔ بھئی نیا سوٹ تیار کیا ہے، ہمیں بھی بتاؤ تا کہ ہم بھی ایسا ہی ایک سوٹ بنوا سکیں۔۔۔ ہا۔۔ ہا۔۔'' پھر وہی جانا پہچانا طنزیہ قہقہہ گونج اٹھا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے گرم گرم سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ رمیش بول اٹھا۔ ''واہ بھئی مسٹر ٹاٹ۔ استاد یہ کپڑا کہاں سے مارا۔ قسم خدا کی کپڑا تو واقعی لاجواب ہے اور کسی ایسٹ مین کلر فلم سے کم رنگین نہیں۔ دیکھو تو اس میں کون سے رنگ کی کمی ہے؟''

رمیش کے ایسے جملے سن کر وہ بہت سٹپٹایا اور اس کی آنکھیں مارے غصہ کے سرخ ہو گئیں اور جب اس نے جھٹکا دے کر کوٹ کا کالر رمیش کے ہاتھوں سے چھڑانا چاہا تو وہ کالر رمیش کے ہاتھوں میں ہی رہ گیا اور دفتر کا کمرہ فلک شگاف قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ان قہقہوں کی تاب نہ لا کر وہ کمرے سے باہر ہو گیا اور برآمدے میں کھڑا ہو کر غصے کی آگ میں جلتا رہا۔ چند لمحے وہ وہیں کھڑا اپنے دوستوں کو کوستا رہا اور کسی کو بتائے بغیر دفتر سے گھر چلا گیا۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنا سوٹ اتار کر مارے غصے کے ایک کونے میں پھینک دیا اور پھر روتے ہوئے اپنے آپ کو چارپائی پر اس طرح گرا دیا جیسے پت جھڑ کے موسم میں کوئی سوکھا پتا زمین پر آگرے۔ وہ اونچی آواز میں رو رہا تھا۔ اس کے روتے اور سسکیاں بھرنے کی آواز سن کر اس کی بیوی بھی باورچی خانہ سے نکل کر اس کے پاس آگئی اور گھبرائے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے خیریت تو ہے نہ؟''

''ہاں۔ ہاں۔ خیریت ہے۔ تو کیا کہنا چاہتی ہے۔ چلی جا یہاں سے۔'' اس کی آنکھوں میں ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی تھی اور سسکیاں بھرتا ہوا بولتا جا رہا تھا۔

''یہ دنیا والے بڑے ظالم ہیں۔ بے بس اور غریب لوگوں کی مجبوریوں پر قہقہے لگاتے ہیں۔ ان کی بے کسی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے اس ظالم دنیا کے تمام لوگوں کا گلا گھونٹ دوں۔ تمام دنیا کے گرم کپڑے اکٹھے کر کے آگ لگا دوں تا کہ ہر بشر ننگ دھڑنگ ہو کر چیختا پھرے اور پھر کوئی کسی کو مسٹر ناٹ نہ کہہ سکے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھوں سے بہتی آنسوؤں کی دھار کو قمیض سے صاف کر ڈالا اور پھر زور کا ایک قہقہہ لگایا۔ اس کا یہ طنزیہ قہقہہ کسی امریکی ایٹم بم کی طرح کمرے میں گونج اٹھا۔ اس کی چھوٹی بچی جو ساتھ والے کمرے میں سو رہی تھی سہم کر جاگ گئی۔ وہ اسی طرح بھیانک قہقہے لگاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اگر آپ کبھی نئی دہلی گئے ہوں تو شاید آپ نے وہاں کی سڑکوں پر ایک ننگ دھڑنگ انسان کو پاگلوں کی طرح چیختے چلاتے اور چکر لگاتے دیکھا ہو، جو ہر اس شخص کو جس نے اونی کپڑے کا سوٹ پہن رکھا ہو دیکھ کر قہقہے لگانے لگتا ہے۔ یہ وہی مسٹر ناٹ ہے۔

●●

ہاتھوں میں لیے تیغ وسناں بیٹھا ہے
ہم زاد نہیں دشمن جاں بیٹھا ہے
جس جا بھی متاع فکر لے کر بیٹھا ہے
لگتا ہے کوئی اور وہاں بیٹھا ہے

x-x-x

بادل تو جمائے تھے پہاڑوں پہ نگاہ
دریاؤں کو جانا تھا سمندر کی راہ
یوں حدت صحرا کو پسینے آئے
گرتے ہوئے شبنم نے کہا بسم اللہ

x-x-x

موسم کے تقاضے یہ ذرا سوچو نا
انجام ہے مطلع کا مکدر ہونا
کھانے کی کوئی چیز اگاؤ پہلے
پھر شوق سے کھیتوں میں ستارے بونا

x-x-x

اس دھوپ کو دیوار سے ڈھل جانے دے
مغرور کے ارمان نکل جانے دے
پھر ہاتھ لگاتے ہی نہ بل ہوں گے نہ وہ
رسی کو ذرا ٹھیک سے جل جانے دے

x-x-x

دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے مجھ کو
صابن کی طرح کاٹ رہا ہے مجھ کو
رستے میں بنا رکھی ہے میں نے جو خلیج
ہم زاد مرا پاٹ رہا ہے مجھ کو

x-x-x

موتی نہ تھے دریا میں تو ہم کیا کرتے
آنسو ہی نہیں آنکھ میں، غم کیا کرتے
ہاتھ آئے وہی کھوکھلے لفظوں کے صدف
گہرائی کی روداد رقم کیا کرتے

x-x-x

بھڑکی ہوئی اک مشعل غم رکھتا ہوں
شبنم کی طرح دیدۂ نم رکھتا ہوں
دکھتی ہوئی رگ نہ اپنی چھپالے دنیا
مجبور ہوں، کاغذ پہ قلم رکھتا ہوں

x-x-x

ہر چند کے روتے ہو ہزاروں کے لیے
پیدل ہی تو کٹتے ہیں سواروں کے لیے
سرورو عقائد کے سنہرے پتو!
پت جھڑ بھی ضروری ہے بہاروں کے لیے

x-x-x

صحرا مجھے ہر گام پہ زک دیتا ہے
منزل مرے ہاتھوں سے جھٹک دیتا ہے
لیکن مرے پاؤں تھمنے لگتے ہیں جہاں
شفقت سے مری پیٹھ تھپک دیتا ہے

مظفر حنفی
P.1/7, CIT Scheme,
Calcutta-54

"ماہیا" ایک پنجابی صنف ہے لیکن ادھر اردو شعراء نے اسے اپنایا ہے۔ آج کل رسائل میں خوب اس کا چرچا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں غنائیت بلا کی ہے۔ اسی غنائیت کے پیش نظر میں نے اس کو "غزل" میں ڈھالنے کا تجربہ کیا ہے اور کچھ "ماہیا غزلیں" کہی ہیں۔ ایک "ماہیا غزل" نذر قارئین ہے۔ "ماہیا" کا اپنا ایک فنی نظام ہے اس کو برقرار رکھتے ہوئے غزل کی حدود و قیود کو اور اصول کو ذہن میں رکھا گیا ہے۔ یہ تجربہ کتنا کامیاب رہتا ہے اس کا فیصلہ اہل نقد و نظر ہی کریں گے۔ قمر

ماہیا غزل

معیار نظر جاتا، کٹ کے روایت سے، جذبوں کا اثر جاتا
بیگانہ گزر جاتا، فکر و فن سے اگر، احساس بھی مر جاتا

آواز بہت اونچی، خوب نہیں ہے کچھ، پرواز بہت اونچی
کیوں دست ہنر جاتا، حد میں اگر رہتے، کیوں کاسۂ سر جاتا

طوفانوں سے ڈر جانا، عزم کی پستی ہے، ساحل پہ پلٹ آنا
ہاتھوں سے گہر جاتا، تہہ میں سمندر کی، میں جو نہ اتر جاتا

چسکا تھا قیادت کا، صید ہوا آخر، بے سمت سیاست کا
بچ کر جو گزر جاتا، راہ ہوس سے تو، کیوں کاندھے سے سر جاتا

آثار تباہی بھی، وجہ ندامت ہے، دزدیدہ نگاہی بھی
بہتر تھا اگر جاتا، بزم نگاراں میں، شائستہ نظر جاتا

پہلے سے نہ کچھ جانا، وقت نکلنے پر، اب کاہے کو پچھتانا
جانا تھا اگر جاتا، لے کے زمانے سے، کچھ زاد سفر جاتا

دشواری و مشکل کیا، عزم اگر ہو جواں، پھر دوری منزل کیا
ساگر میں اتر جاتا، ساتھ جو تم ہوتے، طوفاں سے گزر جاتا

خاموش رہا برسوں، گھر سے کہیں اپنے، باہر نہ گیا برسوں
ہر چہرہ اتر جاتا، آئنہ لے کر میں، محفل میں اگر جاتا

مقبول دعاؤں سے، کام نہ لیتا میں، جو اس کی عطاؤں سے
لہجے سے اثر جاتا، فکر بکھر جاتی، بے فیض ہنر جاتا

پندار کا آئینہ، وہ نہ بچاتا اگر، کردار کا آئینہ
ہاتھوں سے قمرؔ جاتا، وقت کی آندھی سے، ٹکرا کے بکھر جاتا

قمرؔ سنبھلی
5572۔ نئی سڑک، دہلی۔110006

کانٹوں سے نہ گھبرا، چل
آگے تیرے دکھ کا
شاید کوئی نکلے حل

□

باغوں میں بسنت آئی
دیکھ ہواؤں میں
ہر شاخ کی انگڑائی

□

اکثر یہی ہوتا ہے
پھول جسے سمجھو
پتھر وہی ہوتا ہے

□

بے کار ہوں پڑھ لکھ کر
دھول اُڑاتا ہوں
بس شہر کی سڑکوں پر

□

وقت آتا ہے ایسا بھی
دھوپ بھی چبھتی ہے
اور ڈستا ہے سایا بھی

□

آنکھوں کو دھواں کردوں
آگ جو سینے کی
دنیا پہ عیاں کردوں

فراق جلال پوری
پوسٹ: جلال پور، محلہ قاضی پورہ،
ضلع: امبیڈکر نگر (یوپی) ۲۲۴۱۴۹

چاہت کے اصولوں پر
تھل کا سفر سارا
کر ڈالا بگولوں پر

❖

پنوں تھا کہ بادل تھا
آنکھ میں سسی کی
صحرا کوئی جل تھل تھا

❖

پہلے پر آب ہوئی
یاد میں سوہنی کی
پھر آنکھ چناب ہوئی

❖

جب بیٹھی تھی مانجھے میں
ہیر میں تھا رانجھا
اور ہیر تھی رانجھے میں

❖

اک بنسی نشانی تھی
کرشن کنہیا اور
رادھا کی کہانی تھی

حیدر قریشی
Auf der Roos-7
65795, Hattershim I,
(Germany)

کیسی یہ دعا مانگوں
درد دیا جس نے
اس کا ہی بھلا مانگوں

⊠

جان تجھ پہ لٹاتے ہیں
یاد میں رو رو کر
دل اپنا جلاتے ہیں

⊠

دل میں ہے کسک باقی
سوکھے پھولوں میں
اب تک ہے مہک باقی

⊠

جاگیر بناتے ہیں
پھول ہی گلشن کی
تقدیر بناتے ہیں

⊠

پریت تم سے نبھائیں گے
نغمے پیار بھرے
ہم مل کر گائیں گے

گلشن کہنہ
92,Grove Road
Houslow, Middx.
TW3 3PT.(U.K)

طوفان جو آیا ہے
شہر میں ہر جانب
یہ قہر خدا کا ہے

کیا جرم سلونا ہے
طفل کے ہاتھوں میں
پستول کھلونا ہے

آئینہ دکھانے میں
لوگ نہیں ڈرتے
سچ بات بتانے میں

اپنوں کے لئے سپنا
حسن سراپا ہے
غیروں کے لئے اپنا

اس سمت بھی آجگنو
رات اندھیری ہے
تقدیر جگا جگنو

غم کس کو بتانا ہے
دوست نہیں کوئی
بے رحم زمانا ہے

مشتاق افضل
G-40۔ بنگلہ بستی، گارڈن ریچ روڈ،
کلکتہ۔700069

مختار ٹونکی

ننانوے کا پھیر

خدا بخشے ہمارے نانا جان کو جو اپنی عمر کے ننانوے سال میں فرمایا کرتے تھے کہ ننانوے کا پھیر بڑا اندھیر کرتا ہے۔ یہ آدمی کو نہ اٹھانوے کا رکھتا ہے اور نہ اسے سیکڑہ بنانے کا سنہرا موقع دیتا ہے۔ ادھر نہ اُدھر بس اُدھر میں لٹکا دیتا ہے اور جو اُدھر میں لٹک گیا اسے نہ تو خدا ہی ملتا ہے اور نہ وصالِ صنم نصیب ہوتا ہے۔ دور اندیشی سے کام لے کر شاید اردو کے قدیم ریاضی دانوں اور علم ہندسہ کے ماہروں نے "ننانوے کے پھیر میں ہونا" محاورہ اسی لیے ایجاد کیا ہو کہ ایک صدی ایسی آئے گی جو صرف ننانوے سال میں ختم ہو جائے گی۔ واہ بھائی واہ! یہ بھی کوئی دستور ہند ہوا کہ جب چاہا کتر بیونت کر دی اور جو چاہا اس میں گھٹا بڑھا دیا۔ اجی حضرت! ہمیں تو نانا جان مرحوم نے پوری طرح ناپ تول کر بتایا تھا کہ وقت کے پیمانے ہوتے ہیں اور یہ پیمانے اتنے ٹھوس اور جامد ہوتے ہیں کہ غالبؔ کے جام سفال کی طرح یہ ٹوٹ پھوٹ نہیں سکتے۔ آج اگر یہ جام جمشید نہیں تو کیا ہوا، نانا جان کا نواسہ تو موجود ہے جو صدی کے بحران کا بخیہ ادھیڑ سکتا ہے اور طول شب فراق چاہے نہ ناپ سکتا ہو مگر اپنی شد بد سے یہ ثابت کر سکتا ہے کہ ایک صدی ابھی اپنی آخری سانسوں کا شمار کر رہی ہے اور پوری طرح جاں بحق نہیں ہوئی ہے کہ نئی صدی کا تولد کر لیا گیا ہے اور اس نو مولود کا عقیقہ نام رکھ کر جو ہاؤ ہو مچائی جا رہی ہے وہ سراسر غلط ہے۔ قرن ہا قرن سے چلے آرہے وقت کے پیمانوں سے کھلواڑ ہے، دم توڑتی صدی کے ساتھ زنا بالجبر ہے، ریاضی کے اصولوں سے غداری ہے اور ہماری تہذیبی وراثت بنام پراچین سنسکرتی پر حملہ ہے۔ بے شک ہم یہ جانتے ہیں کہ نقار خانے میں بھلا طوطی کی آواز کون سنتا ہے ع

ہے مخالف کل زمانہ، میں اکیلا آدمی

مگر ہمارے پیارے ہندوستان میں، چاہے بگڑی ہوئی حالت میں ہو، جمہوریت قائم

ہے اور جمہوریت کے طفیل ہر ایک مرد وزن کو اظہار رائے کا ٹوٹا پھوٹا اختیار حاصل ہے۔ اسی کو اپنا ہتھیار بنا کر ہم پرانی صدی کا دفاع کریں گے اور نام نہاد "ملے نیم ایر" سے پوچھیں گے کہ وہ قبل از وقت کیوں منصۂ شہود پر آ کر یہ دھماچوکڑی مچا رہا ہے۔ جی ہاں بقول

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

ہاں تو مہربانو قدردانو، ریاضی دانوں کی یہ بات گرہ میں باندھ لو کہ صدی کی عمر چار دن نہیں ہوتی کہ دو آرزو میں کٹ جائیں اور بقیہ دو انتظار کے خلفشار میں، بلکہ دس ضرب دس برابر سینکڑہ ہوتا ہے اور بغیر سنچری بنائے یہ آؤٹ نہیں ہوتی ہے اور شاید اسی لیے قدیم آریوں نے اپنی عمر کو سو سال متصور کر مقرر کیا تھا اور کرکٹ میں بھی یہ دستور ہے کہ سنچری تب مانی جاتی ہے جب بلے باز پورے سو رن بنا ڈالے۔ ننانوے یا ساڑھے ننانوے پر سنچری تسلیم نہیں کی جاتی۔ ساڑھے ننانوے کی پخ ہم نے اس لیے لگائی ہے کہ ابھی سنچری ننانوے کے پھیر میں ہے۔ بلے باز نے جوں توں کر کے ننانوے رن بنا لیے ہیں۔ فرض کر لیجیے کہ اس نے گیند کھیلی ہے اور وہ سوواں رن لینے کے لیے وکٹوں کے درمیان دوڑ رہا ہے۔ ساڑھے ننانوے..... مگر ابھی اس کے حساب کتاب میں سینکڑہ نہیں لکھا جا سکتا کیوں کہ وہ رن آؤٹ بھی ہو سکتا ہے۔ بھاگتے بھاگتے ہانپتے کانپتے وہ وکٹ تک پہنچنے کے بجائے ہیک ٹو پویلین ہو سکتا ہے۔ کچھ یہی حالت زار ہماری بیسویں صدی کی ہے۔ ہماری حقیر رائے میں ہمارے دماغ کے باایمان امپائر نے ابھی اسے آؤٹ قرار نہیں دیا ہے کہ اکیسویں صدی کے نام کا "ہزارہ" کھلاڑی میدان میں آ ڈٹا ہے۔ اب دیکھیں تیسرا امپائر کیا کرتا ہے۔ چلیے! اسلو موشن میں یہ تماشا بھی دیکھیں۔

بر سبیل تذکرہ اور براہِ تبصرہ اگر آپ جناب سے پوچھا جائے کہ محترمہ اکیسویں صدی کب تشریف لا رہی ہیں تو آپ چیں بجبیں ہو کر آنکھیں لال پیلی کر کے کہیں گے کہ میاں عقل کے ناخن لو اور ہوش کی دارو کرو۔ کس کرہ کے باشندے ہو اور کون سی دنیا میں رہتے ہو۔ کرۂ ارضی پر تو ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو رات کے ٹھیک بارہ بجے اکیسویں صدی بڑے جاہ و حشم اور کروفر سے اپنی جلوہ سامانی کے ذریعہ آنکھوں کو خیرہ اور دل و دماغ کو تیرہ کر چکی ہے اور آج کل اسی کے چرچے ہیں ہر زبان پر۔ اگر آپ ایسا کہیں گے تو بھی بے جا نہیں کہیں گے کیونکہ بیسویں صدی کا وجود آپ نے ۱۹۹۹ء تک محدود کر دیا اور جب بے چاری اس صدی کے سارے نو کے ہندسے صفر صفر میں بدل جائیں گے تو رہے گا کیا اور اس کے پاس بچے گا کیا؟ لامحالہ سن ۲۰۰۰ء کا جامہ اکیسویں صدی کو زیب تن کرانا ہوگا مگر ہم بھی اپنے نانا جان کے نابغۂ

خاندان کے نواسے ہیں، آپ کے اس برہان قاطع کو قاطع برہان بنادیں گے اور آپ کی توجیہہ کی دھجی اڑادیں گے۔ ہم بہ بانگِ قلم آپ سے کہے دیتے ہیں کہ ۲۱ویں صدی پہلی جنوری ۲۰۰۱ سے شروع ہوگی۔ ہمہ تن گوش ہو کر سنیں کہ از روئے علم ہندسہ کے کسی بھی صدی کا آغاز پہلے سال سے ہوتا ہے نہ کہ صفر سال سے۔ پس ثابت ہوا کہ بیسویں صدی ۳۱ر دسمبر ۲۰۰۰ء تک قائم ودائم رہے گی اور نیا ہزارہ بچہ اسی دن رات کے بارہ بجے تولد ہوگا۔ آپ کو چلتے چلتے یہ بھی بتادیں کہ پچھلی صدی یعنی موجودہ صدی ۱۹۰۱ء سے شروع ہوئی تھی نہ کہ سن ۱۹۰۰ء سے۔ کیا سمجھے آپ؟ چلئے ریاضی کی دماغ پچی سے بھی آپ کے دل ودماغ پر یہ روشن کردیں۔ ہمیں یہ بتائیں کہ گنتی زیرو سے شروع ہوتی ہے یا ایک دو تین، آجا موسم ہے رنگین، سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر آپ کے خیال میں زیرو سے ہیرو بنتا ہے تو میاں زیرو کو رکھیں گے کہاں؟ ان کی اکیلے حیثیت ہی کیا ہے! کوڑی بھی نہیں جب تک کسی دوسرے ہندسے کا دم چھلا بننے کا انھیں شرف حاصل نہ ہو جائے۔ گنتی حقیقت میں "ایک" سے اپنی ابتدا کرتی ہے اور نو پر اپنی مسافت ختم کرتی ہے۔ مسٹر صفر تو بعد میں آتے ہیں اور ایک کی بغل میں بیٹھ کر دس بننے کی سعادت حاصل کرتے ہیں اس لیے اکیسویں صدی یعنی نام نہاد نئی صدی ہماری حقیر ترین رائے میں ۲۰۰۱ء میں ظہور پذیر ہونی چاہیے۔ ہے نا! دل ودماغ میں کھچڑی پکانے والی بات......

لو صاحب! غضب ہوگیا۔ تیسرے امپائر کی تیسری آنکھ نے کیا دیکھا اور کیا نہیں دیکھا، مگر اپنے اختیاراتِ خصوصی کی بناء پر دھواں دار بلے بازی کرنے والے کھلاڑی کو ساڑھے ننانوے پر ہی آؤٹ کردیا۔ کوئی اسے کلین بولڈ تو نہ کرسکا مگر آؤٹ کرنے کے دوسرے طریقے بھی تو ہیں۔ جب امپائر نے مل جل کر آؤٹ کر ہی دیا ہے تو ہم بھی اڑیل ٹٹو کیوں بنیں؟ نئے ہزارے کا کھیل بھی دیکھ لیتے ہیں۔ صدیوں کا کھیل!

آنکھ والا نئی الفی کا تماشا دیکھے

کہتے ہیں کہ صدیوں کا کھیل کرکٹ سے بھی بہت پرانا کھیل ہے اور اس سے پہلے 1600, 1700, 1800اور 1900 صدیاں بھی اپنا کھیل دکھا چکی ہیں، مگر آپ ہم اس وقت موجود نہیں تھے لیکن یہ تو ہم اب بھی دیکھ سکتے ہیں کہ مذکورہ صدیوں میں صفر دو دو بار آیا ہے جب کہ 2000 میں صفر کی شناختی پریڈ تین سے ہوگی، اس لیے یہ صدی صرف صدی نہ ہو کر "الفیہ" ہے اور الفیہ کی آمد ہماری آپ کی زندگی میں ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ ہمارے ماضی قریب کے اسلاف نے اسے نہ دیکھا ہوگا اور نہ سال دو ہزار کے بعد مستقبل

قریب کے ہمارے اسلاف اسے دیکھ پائیں گے، کیونکہ الفیہ ایک ہزار سال میں ہی اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ عیسوی کلینڈر کے مطابق یہ الفیہ دوبارہ آیا ہے اور اسی نے سب کہرام مچایا ہے ع

الله الله انقلابِ روزگار

مگر آپ اسے ہماری کج فہمی قرار دیں یا بدعقلی میں شمار کریں کہ ہم تو اب بھی یہی کہیں گے کہ سن ۲۰۰۰ء کو شروع ہوئے صرف چار مہینے ہوئے ہیں اور اس کے ختم ہونے میں مئی سے دسمبر تک پورے آٹھ مہینے یعنی دو سو پینتالیس دن باقی ہیں اور اس کے بعد ہی اکیسویں صدی آئے گی۔ ہماری کھوپڑی بھی تو ننانوے کے پھیر میں پڑ گئی ہے۔ ایسے مخمصے کے موقع پر ہمیں بے چاری اردو کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اب ہم آپ کو بتائیں کہ رازِ درونِ پردہ کیا ہے اور کیوں، بیسویں صدی کی مٹی پلید کی جارہی ہے۔ پرنٹ میڈیا سے لے کر الکٹرانک میڈیا تک کے سارے ابلاغی وسائل کیوں شور و غوغا مچارہے ہیں اور کیوں "الفیہ زندہ باد" "ہزارہ پائندہ باد" کے نعرے لگائے جارہے ہیں۔ دراصل بیسویں صدی کے خاتمے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا دو ہزار سالہ زمانہ جوڑا جارہا ہے تاکہ جس کو کراس پر چڑھایا گیا تھا اس کا جشنِ زریں بھی جوش و خروش کے ساتھ منایا جاسکے۔ اکیسویں صدی کے سارے پروپیگنڈے میں مغربی ممالک کی ہنیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کیونکہ وہ اس طرح تہذیبی بالادستی چاہتے ہیں اور مادہ پرستی کے غلیظ کلچر کو ہمارے اوپر لادنا چاہتے ہیں۔ پس پردہ اسلام دشمن عناصر سرگرم عمل ہیں جو احیائے اسلام اور فروغ دینِ حنیف سے خوفزدہ ہیں اور آرزومند ہیں کہ عیسائیت کے سامنے اقوامِ عالم سرنگوں ہو جائیں اور مذاہبِ عالم ٹھنڈے پڑ جائیں۔ اسی لیے الفیہ کو ہوّا بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ "ملے نیم ایئر" کی دھوم دھام ہے۔ عیسائیت کا بھرا ہوا جام ہے۔ ارے آپ کہاں چلے؟ جس بات کا سارے فسانے میں ذکر نہ تھا شاید وہی بات آپ کو ناگوار گذری ہے۔ خیر جاتے جاتے ہمارا یہ شعر تو سنتے جائیے ع

نئی صدی کا یہ موسم نئے طریقوں سے
پرانے دور کی قدروں کو سب مٹادے گا

●●

ظفر صہبائی

غالبؔ کی شوخیاں

غالبؔ کو مختلف عنوانات اور نئے نئے پہلوؤں سے دریافت و تلاش کرنے کا کام اُن کی موت کے بعد سے اب تک جاری ہے۔ اس راہ میں پہلا سنگِ میل مولانا حالیؔ کی تصنیف یادگارِ غالب ہے، جو غالبؔ کی شخصیت اور فن کے رموز و نکات سے ابتدائی طور پر متعارف کراتی ہے۔ مولانا حالیؔ نے غالبؔ کے جن چہروں کی نقاب کشائی کی ہے اُن میں ایک چہرہ شوخ، بذلہ سنج اور ظریف غالبؔ کا بھی ہے، جو خوباں سے چھیڑ اور شوخیاں کرنے کے ساتھ اپنی ذات پر بھی پھبتیاں کستا ہے اور قہقہے لگاتا ہے۔ اس شوخ و شنگ غالبؔ کے پیچھے ایک اور غالبؔ بھی غیر محسوس طور پر نظر آتا ہے، جو اذیت پسند (sadist) ہے۔ خود پر نشتر آزمائی کر کے لطف لیتا ہے، درد پر مسکراتا ہے، اپنے زخموں پر نمک مل کر سسکیوں کو ہنسی میں چھپا لیتا ہے۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

مندرجہ بالا اشعار میں غالبؔ کی ظرافت و شوخی ایک پردہ ہے جس کی اوٹ سے

پتہ: مکان نمبر ۱۰، گلی نمبر ۱۲، بیر سیہ روڈ، بھوپال۔ ۴۶۲۰۳۸

آنسوؤں کے چہرے نکتے دکھائی دیتے ہیں۔ خالص مزاح اور ٹھٹھول کسی شعر میں مشکل سے ہی راہ پاتے ہیں۔ غالب نے اپنے فنی رموز سے خود آگاہ کیا ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے
جو لفظ بھی غالب مرے اشعار میں آوے

غالب کے اس شعر کو گرہ میں باندھ لیا جائے تو یہ سوچ بے معنی ہو جائے گی کہ اُن کا بیان مبتذل، ان کے الفاظ پست اور خیالات سفلہ پن کی حد تک آسکتے ہیں، بُرے سے بُرے حالات میں بھی اُن کا تخیل اوج ثریا پر ہی رہا اور انھوں نے اعلیٰ نسبی روایات کو ترک نہیں کیا۔ بھلے ہی خلعت بیچ کر اُنھیں قیمت چکانی پڑی ہو۔ اگرچہ اُنھوں نے اپنی بُرائیوں کو کبھی نہیں چھپایا اور کھلے دل سے اپنی شراب نوشی کے باعث ملنے والی ذلت کا اعتراف کیا۔

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اسی سلسلہ کا ایک اور شعر ہے جس میں وہ اپنی بادہ کشی پر تو نادم ہیں لیکن اپنی روحانی بلندی کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

حقیقت یہ ہے کہ غالب عام انسانوں کے مقابلے میں بلند شخصیت کے مالک تھے، اُنھوں نے اپنی ذاتی خامیوں، کوتاہیوں اور انفرادی لغزشوں کے لیے نہ کوئی مکر کیا نہ کوئی جواز ہی دیا۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

عام طور پر لکھنے والوں نے غالب کی ظرافت کو محض ظرافت کے خانے میں رکھ کر سرسری ٹال دیا ہے۔ اب ذیل کا شعر ہی دیکھیے جس میں غالب نے مسجد کی حرمت کے تئیں مذہبی نمائندوں کی بے حسی پر کس پُر لطف پیرائے میں نشتر لگایا ہے۔

شیخ جی کعبے کا جانا معلوم
آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں

اُردو میں غالبؔ کے علاوہ کوئی ایسا شاعر نہیں ہے جو اپنی پوری شخصیت کے ساتھ شاعری میں وارد ہوا ہو۔ غالبؔ اپنی شاعری میں رئیس زادے، ایک ترک سلجوقی وافراسیابی بھی ہیں، شرابی وقمار باز بھی ہیں اور عسرت کی انتہائی کو پہنچے ہوئے مفلس بھی۔

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

یہ غیر معمولی ذہنی کھلاپن، کشادہ قلبی اور وسیع الخیالی کا مظہر ہے۔

مجھے اپنے موضوع سے متعلق اشعار کا انتخاب کرتے وقت اس دلچسپ حقیقت کا بھی ادراک ہوا کہ غالبؔ نے شوخیٔ بیان میں اور شوخیٔ خیال کے اظہار میں بھی فن کاری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چاہے بات ''بوسے'' ہی کی ہو۔

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو یہ خو کہیں
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا
کہ شب خیال میں بوسوں کا اژدہام ہوا

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

پہلے شعر میں مکالمے کا لطف ہے اور دیگر اشعار میں زبان وبیان کا حسن۔ یہ شعر بھی دیکھیے، غالب نے کس خوبی سے محاورہ نظم کیا ہے کہ شوخی اور عمومیت کے باوجود شعر عام سطح سے کہیں بلند ہے۔

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے مرے ہاتھ پاؤں داب تو دے

غالبؔ نے دربان سے متعلق متعدد اشعار کہے ہیں اور ہر شعر میں کوئی نہ کوئی الگ پہلو نکالا ہے۔

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں
وعدہ آنے کا وفا کیجئے، یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ غالبؔ مشکل زمینوں میں کہی گئی غزلوں میں سنجیدہ مزاجی کی فضا میں بھی شوخی کر جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سنگلاخ بے آب و گیاہ چٹانوں کے بیچ سے اچانک کوئی چشمہ قہقہہ مار کر پھوٹ پڑا ہو۔

کافی ہے نشانی ترے چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

میں نے کہا کہ بزمِ ناز، غیر سے چاہئے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
مالِ سنی کو مباح اور خونِ صوفی کو حلال

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہو کر سوئے دشت
بن گیا تقلید سے میری یہ سودائی عبث

غالبؔ کا یہ شعر شوخی کے ساتھ انفرادیت کا بھی حامل ہے۔ اس رُخ سے کسی اور شاعر کے یہاں شاید ہی ملے۔

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

غالبؔ کے یہ اشعار بھی لطفِ بیان سے خالی نہیں ہیں اور زبان زد خاص و عام ہو چکے ہیں۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

وصول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

کیا ہے جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

غالب کی ان شاعرانہ شوخیوں میں جو پہلو نظر میں آگئے اُن کا ذکر میں نے کیا۔ اُن کی شوخیوں کے کئی اور پہلو بھی نکل سکتے ہیں، ہو سکتا ہے کوئی اور اس سمندر سے ایسے گوہر آبدار نکال لائے جس سے غالب کی معنی آفرینی پر مزید روشنی پڑ سکے۔ ●●

کالی داس گپتا رضا

اردو کے نامور محقق، ماہر غالبیات اور شاعر کالی داس گپتا رضاؔ ۲۱ و ۲۲ مارچ کی درمیانی شب میں خاموشی کے ساتھ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ان کا انتقال نئی دہلی کے ایک ہوٹل میں ہوا۔ وہ پدم شری ایوارڈ لینے ممبئی سے دہلی آئے تھے۔

کالی داس گپتا رضا محض محقق، ادیب اور شاعر نہیں تھے، وہ اس زبان کے سچے عاشق اور جاں نثار تھے۔ ایک بڑے اور کامیاب تاجر بینکر ہوتے ہوئے بھی انھوں نے زیادہ وقت اردو کی خدمت میں گزارا۔ اردو سے عشق کا ذکر وہ خود کرتے ہیں۔

تجھ سے میں اے حسینۂ اردو
لوگ کہتے ہیں پیار کرتا ہوں
پیار ہی تجھ سے میں نہیں کرتا
جان تجھ پر نثار کرتا ہوں

رضاؔ صاحب ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء کو سکندر پور تحصیل نواں شہر، ضلع جالندھر میں ایک ساہوکار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اردو میں ادیب فاضل، فارسی میں منشی فاضل، سینئر کیمرج اور اکاؤنٹس میں لندن چیمبر آف کامرس اینڈ رائل سوسائٹی آرٹس اگزامینیشن میں کامیابی حاصل کی۔ منشی فاضل امتحان کے بعد وہ مشرقی افریقہ چلے گئے اور اپنا کاروبار شروع کیا۔ اس دوران وکالت کا خیال آیا۔ چنانچہ لاء کالج میں داخلہ لیا مگر اسے مکمل نہ کر سکے۔ لیکن اردو کے ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے انھوں نے خوب شہرت حاصل کی۔ اسی لیے ان کی بیگم ساوتری صاحبہ کہتی ہیں کہ ”گپتا جی نے مجھ سے اور میرے بچوں سے بھی زیادہ انڈیا اور اردو سے پیار کیا۔ انھوں نے افریقہ میں لوگوں کو اردو سکھائی، مشاعرے کیے، کئی لوگ ان کی بدولت شاعر بن گئے۔ پھر ہم انڈیا آگئے شروع میں یہاں دل نہیں لگا لیکن بعد

میں کاروبار اور اردو میں ایسے لگے کہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا۔ بلکہ کاروبار سے زیادہ اردو ان کے دن رات کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔"

کالی داس گپتا بنیادی طور پر شاعر تھے انھوں نے ۱۵ سال کی عمر ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔ جارج و پنجم کی وفات پر ایک مرثیہ کہا۔ ان کے اسکول کے استادوں نے داد دی۔ اس طرح داد ملنے سے انھیں مزید شعر کہنے کا حوصلہ ملا اور ۱۹۴۶ء میں وہ باقاعدہ داغ کے شاگرد جوش ملسیانی کے شاگرد ہو گئے۔ غزل کے علاوہ دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی لیکن انھیں بحیثیت محقق زیادہ شہرت ملی۔ ان کی تحقیق کا مخصوص موضوع غالبیات ہے۔ رضا صاحب نے دیوان غالب کی تاریخ وار ترتیب و تدوین کی۔ اس وسیع کام پر انھیں ۱۹۸۷ء میں غالب انعام برائے اردو نثر سے سر فراز کیا گیا۔ اس کے علاوہ ان کی جملہ علمی ادبی خدمات پر آل انڈیا غالب ایوارڈ (۱۹۸۹ء) آل انڈیا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (۱۹۹۶ء) مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ایوارڈ سراج اورنگ آبادی ایوارڈ (۱۹۹۷) عالمی فروغ اردو ایوارڈ دوحہ قطر (۱۹۹۹) ساہتیہ شرومنی ایوارڈ حکومت پنجاب (۲۰۰۱) اور حکومت ہند کے پدم شری اعزاز (۲۰۰۱ء) سے نوازا گیا۔

کالی داس گپتا رضا کے اردو میں گیارہ شعری مجموعے "شعلۂ خاموش" "شورش پنہاں" "شاخ گل" اجالے" "گیت اور بھجن" "شور غم" "شعاع جاوید" "غزل اور گلاب" "نظم "سمندر" "احترام" "ابھی ناؤ نہ باندھو شائع ہوئے۔ ہندی میں "آسمان اکیلا" اور انگریزی میں The Silent Flame "H" Ode to East Wind میں شعری مجموعے ہیں۔

نثر میں غالبیات پر ۲۲ چھوٹی بڑی کتابیں ہیں۔ چار کتابیں چکبست کے تعلق سے اور جوش ملسیانی پر بھی چار کتابیں۔ ان کے علاوہ تحقیق تنقیدی سوانحی موضوعات پر ۷ کتابیں علاحدہ ہیں۔

ان کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کالی داس گپتا نے کس قدر پڑھا تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری میں بے شمار کتابیں ہیں۔ جن لوگوں نے ان کی یہ لائبریری دیکھی ہے ان کا کہنا ہے کہ شاید ہی کسی لائبریری میں غالبیات کا ایسا خزانہ ہو۔

کالی داس گپتا کے علمی ادبی کارناموں کا ذکر بہت سے لوگ کرتے ہیں مگر انھوں نے کچھ کام اس قدر خاموشی سے کیے ہیں کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو خبر نہیں ہوئی۔ انھوں

نے بلا تفریق مذہب و ملت ضرورت مندوں کی بھرپور مدد کی۔ ان کی وفات ایک عالم کی وفات نہیں ایک انسان دوست کی بھی وفات ہے۔ انھوں نے بزنس میں پیسہ لگایا، کروڑوں کمائے اور گنوائے لیکن راہ خدا کا جو سودا انھوں نے کیا اس میں کوئی گھاٹا نہیں نفع ہی نفع ہے۔

کالی داس گپتا ایسا روشن چراغ تھے جو خود جل کر دوسروں کو منور کرتا ہے۔ ایسے پاک طینت لوگ اس دنیا میں پیدا ہوتے رہیں اور اسی طرح تاریک دنیا میں روشنی پھیلاتے رہیں۔

(ادارہ)

قتیل شفائی

تین چیزیں تین چیزوں کو کھا جاتی ہیں۔ مدرسی نقاد کو، فلم شاعر کو، ٹی وی سیریز افسانہ نگار کو۔ مگر قتیل شفائی کہتے ہیں کہ فلم نے مجھے نہیں کھایا۔ میں نے ثبوت مانگا۔ کہا کہ ثبوت میرے آٹھ مجموعے ہیں۔ فلم کے لئے بھی لکھتا رہا۔ اور شاعری بھی کرتا رہا۔

ثبوت تو سچا اور پکا ہے کیونکہ دیکھا یہی گیا ہے کہ فلم میں جو شاعر چلا گیا پھر وہیں کا ہو رہا۔ کتنے شاعر ہیں کہ اردو شاعری کے مطلع پر طلوع ہوئے اور شتابی کے ساتھ فلم میں جا کر غروب ہو گئے۔ قتیل شفائی کے کتنے ہی ہم عصروں کا یہ انجام ہو چکا ہے۔ ایک ساحر لدھیانوی تھے کہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ دھوم مچاتے شاعری کے میدان میں آئے۔ مگر فلم میں جب گئے تو پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ اب وہ لتا منگیشکر کی آواز میں زندہ ہیں ورنہ مردہ کہتے ہیں۔ میں نے قتیل شفائی سے پوچھا کہ آپ کے ہم عصر کا یہ انجام ہوا اور آپ کیسے بچ گئے۔ مختصر جواب دیا کہ اس کا ٹیلنٹ بس اتنا ہی تھا۔

قتیل شفائی صاحب کے ٹیلنٹ کا معاملہ یہ ہے کہ کم و بیش ڈھائی ہزار فلمی گیت لکھ چکے ہیں اور ہمت دیکھو کہ ساتھ ساتھ غزل اور نظم بھی لکھتے رہے یعنی مشاعرہ اور ادبی رسالہ سے رشتہ برقرار رکھا۔ فلمیں کمائیں، مشاعرے لوٹے، ادبی رسالوں میں نامور ہوئے، جہاں گئے مقبولیت نے بڑھ کر قدم چومے۔ کہتے ہیں کہ میں ان شاعروں میں نہیں جن کی کتاب کا پہلا ایڈیشن ہی ختم نہیں ہوتا۔ میری کتاب مکتبی بھی ہے۔ مختلف مجموعوں کے نام گناتے گناتے جب مطربہ کا نام لیا تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ بات یہ ہے کہ اس مجموعے سے کچھ داستانیں بھی وابستہ ہیں۔ قتیل صاحب نے اس کی وضاحت یوں کی کہ اس بازار کے طبقہ کا ایک کردار اس کتاب کا محرک ہے۔ مگر میں نے محض اس کردار کو پیش نظر نہیں رکھا۔ پورا طبقہ میرے پیش نظر تھا۔ اس کے ساتھ تجربے سے گزر کو خود میں نے جو جانا اسے بیان کیا۔

واضح ہو کہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ شعر و افسانے میں جو کردار سب سے بڑھ کر پروان چڑھا وہ طوائف ہے۔ یوں سمجھو لو کہ ترقی پسند ادب میں طوائف مزدور سے بھی زیادہ مقبول رہی ہے مگر قتیل صاحب نے سچ کہا کہ "ان شاعروں اور افسانہ نگاروں نے طوائف کو دیکھا نہیں بس خیالی باتیں کی ہیں جس کی بڑی مثال قاضی عبدالغفار کی کتاب "لیلیٰ کے خطوط" ہیں۔ میں نے طوائف کو دیکھا ہے۔"

آٹھ شعری مجموعوں اور ڈھائی ہزار فلمی گیتوں کا یہ خالق ہری پور ہزارہ سے اٹھا، پنڈی میں ابھرا، لاہور میں آکر چمکا۔ ہزارہ کی مٹی نے بھی کیا کیا آدمی پیدا کیے۔ ایوب خان، ڈاکٹر عبداللہ، قتیل شفائی، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ قتیل شفائی، ابھی چھٹی کلاس میں تھے کہ غزل کہہ کر ادبی انعام حاصل کیا۔ باپ نے بیٹے کے شاعر ہونے کی خوشی میں یاروں کی دعوت کی، مگر شاعر نواز باپ کا سایہ جلد ہی سر سے اٹھ گیا۔ جو دولت چھوڑی تھی وہ دیکھتے دیکھتے بہہ گئی۔ پھر ہزارے کی زمین تنگ ہوتی چلی گئی۔ وہاں سے نکل کر پنڈی کا رخ کیا۔ وہاں تلوک چند محروم، عبدالعزیز فطرت اور عدم کی آنکھیں دیکھیں، پنڈی سے چلے تو لاہور۔ یہاں "ادب لطیف" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بن گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ نام اچھل گیا۔

قتیل شفائی کا کہنا ہے کہ ترقی پسند تحریک سے ان کا باقاعدہ تعلق تقسیم کے بعد قائم ہوا۔ قسمت کی بات دیکھو کہ تقسیم کے بعد پاکستان میں ترقی پسند تحریک نے ٹھوکر کھائی اور آخر کے تئیں اللہ کو پیاری ہو گئی کتنے ادیب تحریک کے ساتھ ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کچھ پھول دو دن بہار جانفزا دکھلا کر کملائے۔ بہت سے غنچے بن کھلے ہی مرجھا گئے۔ وہ تو کہئے کہ قتیل شفائی سخت جان تھے کہ زندہ بچ نکلے۔

زندہ بچ نکلنے والے افسوس کے ساتھ یاد کرتے ہیں کہ تحریک نے کیسی کیسی ٹھوکر کھائی۔ یار اپنے ہی زور میں گر پڑے اور پوری ترقی پسند تحریک کو لے بیٹھے۔ قتیل شفائی کہنے لگے کہ انجمن کا کمال یہ تھا کہ جو فیصلے اسے کئی سال بعد کرنے چاہئیں تھے، جوش میں آکر پہلے ہی کر ڈالے۔ مرنے والوں کے بارے میں کہا کہ انھوں نے نعرہ بازی پر تکیہ کیا تھا۔ نعرہ ڈوبا تو وہ بھی ڈوب گئے۔ جنھوں نے فن پر بھروسہ کیا وہ آج بھی زندہ ہیں اور ان کے ساتھ انھوں نے اپنے اس ایمان کا اعلان کیا کہ ترقی پسند نظریے کا زوال نہیں، زوال تحریک کے انتہا پسند ٹولے کا ہوا۔ فلمی شاعری کے بارے میں قتیل شفائی نے کہا کہ وہ ان کے لیے روزی کمانے کا

بستر علالت پر لکھی ہوئی ایک غزل

مجھ کو اب لوگ تجھے خط نہیں لکھنے دیتے
خط لکھوں بھی تو حقیقت نہیں لکھنے دیتے

ناگہاں ٹوٹ پڑی ہے جو قیامت مجھ پر
اس قیامت کو قیامت نہیں لکھنے دیتے

وہ خدا ہے مرا، اس پر حق ہے لیکن
اس کو بھی اپنی شکایت نہیں لکھنے دیتے

چاہتا ہوں مجھے انسان ہی سمجھا جائے
پھر بھی یہ مجھ کو محبت نہیں لکھنے دیتے

دفن ہوں جس میں کفن اوڑھ کر محرومی کا
ایسے گھر کو مجھے تربت نہیں لکھنے دیتے

میں تو شرمندہ ہوں اپنوں سے بھی خدمت لے کر
یہ مگر حرف ندامت نہیں لکھنے دیتے

جو محبت کو پرکھتے ہیں گناہوں سے قتیلؔ
ان کی بھی مجھ کو مذمت نہیں کرنے دیتے

ذریعہ ہے لیکن شاید انھوں نے محض روزی کمانے کا ذریعہ بھی نہیں سمجھا۔ ان کا کہنا ہے کہ جس زمانے میں وہ فلمی دنیا میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں فلمی شاعری کے دو مکاتب تھے۔ ایک آرزو اور تنویر نقوی کا اسکول اور دوسرا پردیپ اور مدھوک کا اسکول۔ مقبولیت دوسرے اسکول کو حاصل تھی۔ مگر ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے شروع ہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ وہ آرزو اور تنویر نقوی کی روایات میں چلیں گے۔ اس فیصلے سے وہ کبھی منحرف نہیں ہوئے۔

قتیل شفائی رائٹر گلڈ کے صوبائی سکریٹری بھی ایک لمبے عرصے تک رہے ہیں۔ یعنی دو Terms پوری کی ہیں۔ رائٹرز کالونی کا ڈول انھیں کے زمانے میں ڈالا گیا تھا۔ **(ادارہ)**

اعزاز احمد آذر

سو گئے آپ زمانے کو جگانے والے

قتیل شفائی کی وفات سے شعر و ادب کا ایک عہد اپنے اختتام کو پہنچا۔ آٹھ دہائیوں سے زیادہ عرصہ چلنے والی سانسوں نے لحہ لحہ شاعری کی ایک تاریخ رقم کی۔ وہ محبت کرنے، محبتیں بانٹنے اور محبتوں کو فروغ دینے والے شاعر تھے۔ محبت ان کی زندگی کا مرکزی نکتہ تھی۔ وہ ایک ایسے شاعر تھے جو بیک وقت وطن کے نغمے بھی چھیڑتا ہے، سماج کے اندھیروں کے خلاف بھی لڑتا ہے، محبوب کے حسن کو چاند اور جوانی کو کنول کہتے ہوئے اس کی صورت دیکھتا ہے تو غزل کہتا ہے۔ جو گیت تخلیق کرتا ہے تو دلوں کو چھولیتا ہے اور نعت کہتا ہے تو عشق رسولؐ کی سرشاری ایک ایک لفظ سے جگمگاتی نظر آتی ہے۔ قتیل شفائی عروس شاعری کے دامن میں تا ابد جگمگاتے ستارے ٹانک کر 11 جولائی 2001ء کو اگلی منزلوں کو سدھار گئے۔

آنکھوں کو بند کرلیا ہونٹوں کے ساتھ ساتھ
اس ضبط پر تو دھوم مری چار سو رہی

قتیل شفائی سے میرے تعلق خاطر کا عرصہ تین دہائیوں سے زیادہ کا ہے۔ میں نے قتیل صاحب کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ وہ اورنگ زیب سے قتیل شفائی کیا بنے شخص شخصیت میں ڈھل گیا۔ میں نے ابھی دو تین برس پہلے ایک ملاقات میں بغیر تمہید اور کسی حوالے کے پوچھا "قتیل صاحب! کبھی اورنگ سے ملاقات ہوتی ہے؟" بے ساختہ بولے: "اورنگ زیب مجھ سے الگ ہی کب ہوتا ہے۔"

ایک بے ساختہ پن ان کے مزاج کا خاصا اور ان کی شاعری کا حسن تھا۔ وہ عمومی زندگی میں بھی بات دل میں چھپا کے نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی کے ہاں کھانے پر مدعو ہوتے اور کھانے کا ذائقہ اور معیار حسب دلخواہ نہ ہوتا تو بغیر لگی لپٹی میزبان پر اس کا

اظہار بھی کر دیتے۔

وہ ایک دوست مزاج انسان تھے۔ ایسا دوست جو دوستوں کو یاد رکھتا اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے وسط میں اپنے شاہدرہ ٹاؤن قیام کے عرصہ میں مجلس احباب ادب کے پلیٹ فارم سے میں نے ان کے ساتھ ایک شام منانے کا اہتمام کیا۔ مجلس احباب ادب کے زیر اہتمام منائی جانے والی ہر شام یادگار شام تھی۔ مگر وہ شام اپنی نوعیت کے لحاظ سے لاہور میں قتیل شفائی کے اعزاز میں شائد پہلی شام تھی۔ قتیل صاحب سے میری نیاز مندی اور براہ راست تعارف کا آغاز اسی زمانے میں اور اسی حوالے سے ہوا تھا اور پھر اس آخری لمحہ تک جب فالج نے ان کی زبان گنگ کر دی اور آنکھوں کو پتھرا دیا، قتیل شفائی نے ہمیشہ ایک حیات آموز محبت سے نوازا۔

قتیل شفائی کی گیت نگاری، ان کی غزل، ان کی نظم، ان کی نعت گوئی، ان کی شاعری کے جتنے بھی پہلو ہیں، الگ الگ طور پر ایک مکمل موضوع ہیں۔ ان پر تھیسس لکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے غیر مطبوعہ کلام کا ذخیرہ اتنا زیادہ ہے کہ بہت سے مجموعے ترتیب دیئے جاسکتے ہیں اور یقیناً یہ کام ان کے صاحبزادے نوید قتیل سرانجام دیں گے۔

قتیل ایک بانکا سجیلا انسان اور دلنواز شاعر تھا۔ ایک زمانے میں مشاعروں میں وہ اپنا کلام ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ ٹائی سوٹ ان کا من پسند پہناوا تھا مگر بعد میں انہوں نے دونوں کو ترک کر دیا۔ مشاعرے وہ تحت اللفظ پڑھتے اور کرتا پاجامہ بطور ملبوس بہت پسند کرنے لگے۔ ان کی یہ نظم ان کے نظریہ شعر کی غماز ہے کہ

لاکھ پردوں میں رہوں بھید مرے کھولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے
میں نے دیکھا ہے کہ جب میری زباں ڈولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے
تیرا اصرار کی چاہت مری بے تاب نہ ہو!
واقف اس غم سے مرا حلقۂ احباب نہ ہو
تو مجھے ضبط کے صحراؤں میں کیوں رولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے

ڈاکٹر مغیث الدین فریدی

اردو کے منفرد لب ولہجہ کے شاعر، تاریخ گو اور ہر دلعزیز استاد ڈاکٹر مغیث الدین فریدی (سابق ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی) کا ۱۵ر جولائی ۲۰۰۱ء کو علی الصبح جاج مئو (کانپور) میں انتقال ہو گیا وہ ۷۶ سال کے تھے۔

فریدی صاحب یکم مئی ۱۹۲۶ء کو فتح پور سیکری (آگرہ) حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے سینٹ جانس کالج آگرہ سے ۱۹۴۶ء میں بی۔اے کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۴۸ء میں ایم۔اے کے بعد وہ سینٹ جانس کالج میں شعبۂ اردو فارسی میں ۱۹۶۲ء تک استاد رہے۔ بعد ازاں ان کا تقرر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ہوا اور وہ ستمبر ۱۹۶۲ء سے ۱۹۹۱ء میں اپنے ریٹائرمنٹ تک فرائض منصبی نبھاتے رہے۔ ۱۹۷۵ء میں ان کے تحقیقی مقالے "اردو شاعری میں قومیت کا تصور" پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری سے نوازا گیا۔

مغیث الدین فریدی ایک پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ وہ انتہائی ملنسار، خوش گفتار مہذب، نستعلیق اور علم دوست تھے۔ ان کی صحبت میں کوئی بھی شخص گھنٹوں بیٹھ کر لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ گفتگو میں تازگی، شگفتگی، بذلہ سنجی کے ساتھ ساتھ علمی ادبی معلومات کا بڑا ذخیرہ ہوتا تھا۔ بعض ذاتی وجوہ کی بناء پر وہ گوشہ نشیں ہو گئے تھے لیکن دہلی اور بعد میں جاج مئو کے قیام میں بھی ان کے پرستار اور معتقدین ان کے گھر پر حاضری دینا اور گفتگو کرنا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔

فریدی صاحب تقریباً ۴۳ سال درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ آج ان کے شاگردوں کے شاگرد بھی ہندستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھا رہے ہیں۔

ڈاکٹر مغیث الدین فریدی کی تصنیفات و تالیفات میں انتخاب دیوانِ غالب مع

تنقیدی مقدمہ و تشریح اشعار، انتخاب مثنویات اردو مع مقدمہ، انتخاب قصائد اردو مع مقدمہ، انتخاب غزلیات حافظ مع فرہنگ (بلاغت اور عروض کے تشریح حوالے) کے علاوہ ایک شعری مجموعہ "کفر تمنا" بھی ہے۔ یہ مجموعۂ کلام ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعۂ کلام وہ مرتب کر ہی رہے تھے کہ علیل ہو گئے۔ گزشتہ چند سالوں سے وہ مختلف امراض کا شکار رہے اور اس طرح ان کے کئی علمی ادبی کام منظر پر نہ آسکے۔ تاریخ گوئی پر مشتمل ایک مجموعہ بھی مکمل نہ ہو سکا۔

فریدی صاحب بنیادی طور پر شاعر تھے۔ انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی۔ فن تاریخ گوئی اور تضمین نگاری میں انھیں بلا کی قدرت حاصل تھی۔ ان کے شعری مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ

"یہ مختصر مجموعہ عہد حاضر کی ایسی آواز ہے جس نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ جو عصر حاضر کا کرب، سماج کی بے چینی، سیاست کی منافقانہ پالیسی، ان سب کا اظہار غزل کے پیرایہ میں جس خوش اسلوبی سے ہوا ہے اس نے غزل کی معنویت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ان کا لب ولہجہ شعر میں ایک کیف پیدا کر دیتا ہے......"

فریدی صاحب مختلف علمی ادبی انجمنوں اور اداروں کے رکن رہے۔ اردو مجلس، اردو سروس آل انڈیا ریڈیو، دہلی اور لکھنؤ سے متعدد ادبی موضوعات پر تقریریں نشر ہوئیں۔ وہ مشاعروں میں کم جاتے تھے۔ انھوں نے جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، قمر بدایونی، حفیظ جالندھری ساغر نظامی، روش صدیقی مجاز لکھنوی، جاں نثار اختر، نشور واحدی، معین احسن جذبی، راز مراد آبادی شعری بھوپالی، شکیل بدایونی، اختر الایمان، علی سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری جیسے شعرا کے ساتھ آگرہ، کانپور، ممبئی، الہ آباد اور دہلی کے مشاعروں میں شرکت کی۔ ان کا کلام ہمیشہ سنجیدگی سے سنا گیا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ان کے کلام کی بنیادی خصوصیت کلاسیکی روایات کی پاسداری کے ساتھ جدید لب ولہجہ اور عصر حاضر کی ترجمانی ہے۔

فریدی صاحب نے اپنے استاد حامد حسن قادری کے بعد تاریخ گوئی میں جو شہرت حاصل کی وہ کم ہی شعرا کے حصہ میں آئی۔

اپنے قارئین کی دلچسپی اور مطالعہ کے لیے ہم یہاں ان کی غزلوں کے منتخب اشعار کے علاوہ چند تاریخی قطعات بھی شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

غزلوں کے منتخب اشعار

جلتے ہوئے غم کے کنول، بجھتی ہوئی شمع وفا
شہر تمنا آج کل آباد بھی ہے سونا بھی ہے

کسی غزال میں بھی اب نہیں رم وحشت
ہم اپنے سحر تمنا سے کس کو رام کریں

پھر سر شاخ آرزو کھل کے مہک اٹھی کلی
درد کی فصل ہو چکی، داغ کے دن گزر گئے

جہاں اُگتی ہیں فصلیں خنجروں کی
وہیں بارش بھی ہوتی ہے سروں کی

بکھرے ہوئے انسان سے کیا پوچھ رہے ہو
میزان جنوں عقل کا معیار کہاں ہے

ہم اپنا سر کہاں جا کر چھپائیں
چھتیں ٹوٹی ہوئی ہیں سبھی گھروں کی

جبیں پر شکن ہے، نہ دامن پر دھبا خرد کا ہر اک وار ہنس کر سہا ہے
جہاں سے ملا ہم کو سنگ ملامت وہیں ہم نے اک آئینہ رکھ دیا ہے

ذہن کو ماؤف کر دیتا ہے لفظوں کا طلسم
مدعا کہہ دیجئے جادو بیانی پھر سہی

اس دور تجارت کے دستور نرالے ہیں
آئینے سے تابانی اب آئینہ گر مانگے

کس سے محنت کا اپنی صلا مانگتے، ذرہ ذرہ ہمارا ہی محتاج تھا
دشتِ امکاں کو ہم نے مہک بخش دی جھوم کر آہوئے مشک بو کی طرح

ہے فریدی عجب رنگ بزم جہاں، مٹ رہا ہے یہاں فرق سود و زیاں
نور کی بھیک تاروں سے لینے لگا آفتاب اپنی اک اک کرن بیچ کر

کسی نے زبانِ تمنا نہ سمجھی غلط فہمیوں سے بڑھی بے نیازی
ذرا جس کو چشم عقیدت سے دیکھا وہی رفتہ رفتہ خدا بن گیا ہے

رفتہ رفتہ یہ قفس بھی آشیاں ہو جائے گا　　اور کچھ دن تک قفس کو آشیاں کہتے رہو

تیز ہیں خنجر ابھی بازوئے قاتل شل نہیں　　قتل گاہوں کو مگر دار الاماں کہتے رہو

رات محفل میں وہ تھا دیدہ و دل کا عالم　　جیسے چلتی ہوئی تلوار سے تلوار ملے

اک بار اپنے آپ سے ملنے کی حسرت ہے مجھے
ہستی مری اس شہر میں کھوئی ہوئی آواز ہے

زمانہ اس پہ تلا ہے، خرد کی بات رہے　　ہمیں یہ ضد ہے کہ اونچا جنوں کا نام کریں

سنگِ ملامت لے کے تم جس کو چلے ہو توڑنے
اے ناصحو! تم نے کبھی وہ آئینہ دیکھا بھی ہے

ہمیں اس انقلاب دہر کی دعوت نہ دو جس میں
نہ پھولوں کی مہک بدلے نہ کانٹوں کی چبھن بدلے

تیر تو سب تمہارے خطا ہو گئے توڑ دو اب یہ خالی کماں دوستو
آؤ بڑھ کر گلے سے لگا لو ہمیں ورنہ پھر تم کہاں ہم کہاں دوستو

کیسے اک دوسرے کو سمجھتے بھلا، گفتگو سے بڑھا اور بھی فاصلا
ہم تھے بے ربط سی داستان وفا تم تھے مبہم سا طرزِ بیاں دوستو

اس دورِ تجارت میں قلم جس نے نہ بیچا　　کہہ دو یہ فریدی سے وہ فن کار کہاں ہے

بس گئی ہیں اب اس میں بستیاں جہالوں کی　　آئینہ تو آیا تھا ان کے روبرو تنہا

مزہ تو یہ ہے جنوں سے ہے آگہی کا بھرم　　بہک نہ جاتے تو سب راز کہہ دیے ہوتے

دل توڑ کے ہنس دینے والے دنیا میں فریدی لاکھوں ہیں
جو غیر کا غم بھی اپنا لے اس دہر میں ایسا کوئی نہیں

جب تک رہے ہوش میں ہم اپنے طعنے سنے ہم نے چار سو سے
جتنی بھی جنوں میں عمر گذری گذری ہے وہی بس آبرو سے

جو لمحہ نشاطِ آگہی تھا اُس لمحہ نے مجھ کو ڈس لیا ہے
صحرا کی پناہ چاہتا ہوں اٹھ کر تری بزم رنگ و بو سے

ہم تیری تلاش کے بہانے پہچاننا چاہتے تھے خود کو
کھو جائے جہاں وجود اپنا باز آئے ہم ایسی جستجو سے

تاریخ وفات دردناک
رحلت پروفیسر رشید احمد صدیقی (۱۹۷۷ء)

دل ظرافت کا سوگوار ہے آج — طنز کی آنکھ اشکبار ہے آج
اُٹھ گیا ناقدِ حیات و ادب — قلب اُردو کا داغ دار ہے آج
گل فشاں تھے جہاں رشید احمد — رخصت اس باغ سے بہار ہے آج
قدر تہذیب ان کے دم سے تھی — روحِ تہذیب بے قرار ہے آج
جس زباں میں وہ بات کرتے تھے — اُس زباں کا جگر فگار ہے آج
دفن ہوتا ہے لطف طنز و مزاح — بذلہ سنجی تہہ مزار ہے آج
نکتہ دانی کا آج ماتم ہے — ذوقِ تنقید اشکبار ہے آج
کان میں گونجتی ہے اُن کی صدا — دامن ہوش تار تار ہے آج
"آہ" (۶) کے ساتھ لب پہ ہے تاریخ — "رحلت فخر روزگار ہے آج"
۱۹۷۷ = ۱۹۷۱ + ۶

قطعۂ تاریخ انتقال ۱۹۷۷ء
محسن ہند فخر الدین علی احمد صدر جمہوریۂ ہند (۱۹۷۷ء)

فخر ہندوستان کا ماتم ہے — ملک کے پاسباں کا ماتم ہے
کارواں ہے غبار کی صورت — رہبر کارواں کا ماتم ہے
جس سے تھی آسماں زمین وطن — اُسی عظمت نشاں کا ماتم ہے

خاک اُڑاتی ہے ہر روش پہ صبا | باغ میں باغباں کا ماتم ہے
جس طرف دیکھئے اندھیرا ہے | شمعِ بزمِ جہاں کا ماتم ہے
سرِ دہلی ہے شامل تاریخ | "فخر ہندوستاں کا ماتم ہے"
۴ | ۱۹۷۷ = ۱۹۷۳ + ۴

اس مصرعہ تاریخ میں دہلی کے سر یعنی پہلے حرف دال کے چار عدد شامل کیے جائیں گے، سال وفات ۱۹۷۷ء بر آمد ہوگا۔

۴+۱۹۷۳=۱۹۷۷ فخر الدین علی احمد صاحب کا سال وفات ہے۔

رحلتِ جناب محمد طاہر فاروقی (۱۳۹۸ ہجری)

اے محسنِ اُردو زبان! اے شمعِ علم، اے دیدہ ور
آئینہ دار آگہی، رنگِ رُخِ فکرو نظر
تو، جامعہ کی شکل میں اردو زباں کو دے گیا
حسن فروغ انجمن، نورِ چراغ رہ گزر
تیرے بغیر اس بزم میں سب بے سروپا ہوگئے
"حرف و سخن ، لطف وعطا، عفوووفا، نقدونظر"
ر خ ط ط ف ق ظ
۲۰۰ ۶۰۰ ۹ ۹ ۸۰ ۱۰۰ ۹۰۰

یہ تاریخ مومن کے انداز میں کہی گئی ہے ان حروف کے عدد جمع کیے جائیں تو ۱۹۷۸ سال وفات ہوتا ہے۔

تاریخ وفات
پروفیسر ڈاکٹر یوسف حسن خاں

محرم رمز حافظ و اقبال | یوسف مصر فن ہوا رخصت
رحلت ایسے ادیب و ناقد کی | علم کا بانکپن ہوا رخصت

اُٹھ گئی ہے بساط اردو سے | آج اک ایسی شمعِ فکرو نظر
دفن ہے جس کے ساتھ ذوق جمال | اور نقدِ ادب ہے خاک بسر

جس پہ نازاں رہی ہے صنفِ غزل ایک عالی دماغ تھا نہ رہا
ہو کے بے "بس" کہا ہے سالِ وفات "بزم میں اک چراغ تھا نہ رہا"

مصرعہ تاریخ اپنی جگہ مکمل ہے مگر اس کے اعداد ۲۰۴۱ ہوتے ہیں جب کہ سال وفات ۱۹۷۹ء ہے شاعر نے اپنی اس بے بسی کو اس طرح دور کیا کہ لفظ بس کے ۶۲ عدد مصرعے سے خارج کر دیے جس کا لطیف اشارہ شعر میں موجود ہے۔

تواریخ سخنداں

ماتمِ مرگ شیریں کلام (۱۴۰۲ھ)

بحر علم و دانش جوش ملیح آبادی و فراق گورکھپوری

۱۹۸۲ء

۱۹۸۲ء میں جوش اور فراق کا انتقال ہوا تھا اس لیے دونوں کی تاریخ وفات ایک ساتھ ایک ہی مصرعے میں آ گئی ہے۔

اُٹھ گیا دنیا سے دونوں باکمال
لُٹ گیا اُردو زباں کا طمطراق
ہے دلوں پر نقش تاریخ وفات
"عزت افزائے سخن جوش و فراق"

۱۹۸۲ء

نام کتاب: مجروح سلطانپوری: مقام اور کلام
مرتب : ڈاکٹر محمد فیروز
صفحات : ۴۰۰
قیمت : ۳۵۰ روپے
مبصر : کفایت دہلوی
ملنے کا پتہ: ساقی بک ڈپو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶
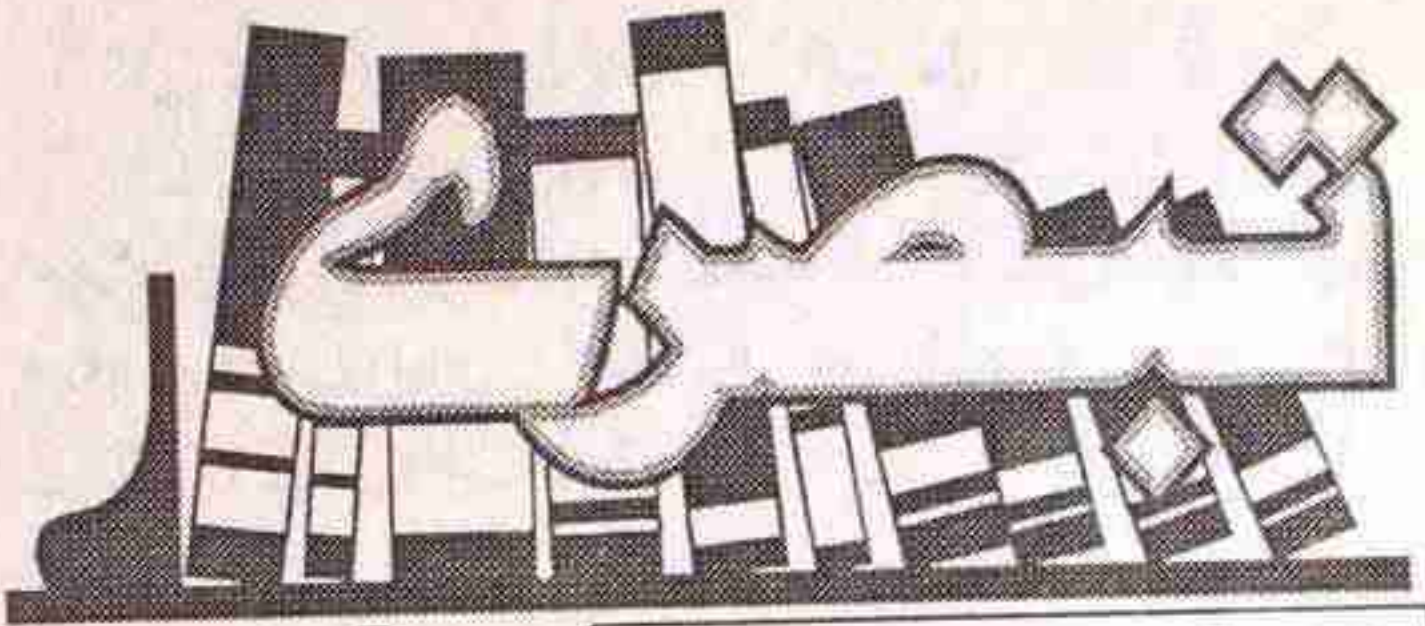
* مجروح سلطان پوری بیسویں صدی میں اردو کے طرح دار غزل گو تھے، یہ طرح داری اور بجیلاپن ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ اس مبصر کو ان سے کئی بار ملاقاتیں کرنے اور سننے کے مواقع ملے۔ مجروح صاحب کا مجموعہ کلام "مشعل جاں" راقم الحروف ہی کی نگرانی میں شائع ہوا تھا۔ کتاب کی اشاعت کے دوران خط و کتابت بھی ہوتی اور فون پر گفتگو بھی...... ان معاملات نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ جو بانکپن اور طرح داری مجروح صاحب میں ہے وہ اس دور کے دوسرے شعراء میں نہیں ہے۔

زیر تبصرہ کتاب مجروح صاحب کے انتقال (۲۵ مئی ۲۰۰۰) کے بعد شائع ہوئی ہے لیکن مرتب نے مجروح سلطانپوری کی حیات میں ہی اس پر کام کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کے لیے مجروح صاحب سے مراسلات بھی ہوئی۔ کتاب میں ۲۱ شخصی، تاثراتی اور تنقیدی مضامین، تین انٹرویو اور مجروح صاحب کی تحریر کے علاوہ ان کی نمائندہ غزلیں اور نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ کتاب کی ترتیب اور اشاعت کے تعلق سے مرتب ڈاکٹر محمد فیروز لکھتے ہیں:

"کتاب مرتب کرتے وقت بی۔اے اور ایم۔اے کے طلبہ پیش نظر رہے ہیں۔ ایسے طلبہ جواب رسائل اور کتب کا مطالعہ کم سے کم کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انھیں ضروری مواد یکجا کسی ایک کتاب میں مل جائے۔ اہل قلم، اہل نظر، نقاد حضرات مطالعہ کرتے وقت یہ نکتہ ذہن نشیں کر لیں کہ اشاعت کا اولین مقصد طلبہ کی "ضرورت" ہے۔"

پہلی نظر میں کتاب طلبہ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے شائع کی گئی لیکن مضامین اور کلام کا انتخاب نہ صرف یہ کہ مجروح سلطانپوری کے مزاج اور معیار پر پورا اترتا ہے بلکہ ان کے فکر و فن کے بعض ایسے ... سامنے آتا ہے جو ابھی تک اوجھل تھے۔ کتاب میں ایسی نظمیں اور ایک غزل بھی ہے جو

مجروح صاحب کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ اس طرح یہ کتاب مجروح کے چاہنے والوں اور ادب کے باذوق قارئین کے لیے علمی ادبی تحفہ ہے۔ بالخصوص ان ریسرچ اسکالرز کو ڈاکٹر محمد فیروز کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو مجروح سلطانپوری پر تحقیق کام کر رہے ہیں کیونکہ اب انھیں اپنے تھیسس کے لیے بیشتر مواد ایک ہی کتاب میں دستیاب ہو جائے گا۔ ایک ہی کتاب میں تنقیدی مواد بھی ہے اور کلام بھی۔ اور کلام کے ساتھ یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ پہلے مجموعہ کلام "غزل" سے اور آخری مجموعہ "مشعل جاں" کے متن میں جہاں جہاں اختلاف یا ترمیم و اضافہ ہے ان کی نشاندہی حاشیے میں کی گئی ہے۔

اتنی عمدہ کتاب مرتب کرنے کے لیے ڈاکٹر محمد فیروز ہم سب کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ آئندہ بھی وہ ایسی کتابیں مرتب کریں گے جو طلبہ اور ادب کے قارئین کے لیے مفید ثابت ہوں گی۔ اختر الایمان مقام اور کلام کے بعد مجروح سلطانپوری پر مرتب کی گئی اس کتاب نے ثابت کر دیا ہے کہ ڈاکٹر فیروز ایسی کتابیں مرتب کرنے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ کتاب کی عمدہ کمپوزنگ اور نفیس طباعت، دلکش سرورق نے کتاب کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کتاب کی قیمت زیادہ ہے۔

اقبال انصاری کی "عورت"

مبصر: ڈاکٹر فاروق صدیقی

ملنے کا پتہ: محمد شیراز، ایف 176، پانڈو نگر، دہلی۔ 91

❁ "عورت" اقبال انصاری کے 18 افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کے دو افسانوی مجموعے "جنگل" اور "آدمی" منظر عام پر آچکے ہیں۔ اس طرح اردو کے ایک نامور افسانہ نگار کی حیثیت سے انھوں نے اپنی شناخت بنالی ہے۔ پیش نظر مجموعہ کسی پیش لفظ، دیباچہ اور مقدمہ وغیرہ سے پاک ہے۔ یعنی مشک اپنا تعارف کرانے کے لیے کسی عطار کی رہین منت نہیں ..... کتاب کا صفحہ ۳ ایک خوبصورت اقتباس سے مزین ہے جو اسی کتاب میں شامل افسانہ "سمندر" سے ماخوذ ہے۔ اس سے عورت کی خداداد عظمت، شرافت، نفسیات اور افتادِ طبع پر روشنی پڑتی ہے۔

ان افسانوں کے مطالعے سے ایک مجموعی تاثر یہ ابھرتا ہے کہ افسانہ نگار واقعی ایک تخلیقی فن کار ہے۔ جدید افسانہ نگاری کے فن اور تکنیک سے اس کی گہری واقفیت ہے۔ موضوع، زبان اور پیرایہ بیان سب میں تازگی اور اللہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے مشاہدے میں وسعت اور بوقلمونی ہے۔ اس نے عصری زندگی کے تناظر میں "عورت" کو بہر رنگ دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ نگار نے کسی ازم، تحریک، یا سکہ بند رجحان کی نمائندگی کرنے کے بجائے اپنی بصارت اور بصیرت پر بھروسہ کیا ہے اور افسانوں کے موضوعات اپنے گرد و پیش کی چمکتی دمکتی زندگی میں ڈھونڈے ہیں۔

اقبال انصاری بنیادی طور پر تاریخ کے آدمی ہیں، لیکن جدید علوم و فنون پر بھی ان کی دسترس ہے۔ مثال کے طور پر ان کا افسانہ "سمندر" دیکھیے۔ اس میں انھوں نے Sea Life سے متعلق جتنی باریک اور تازہ ترین معلومات فراہم کردی ہیں وہ ان کو علم الحیوانات کے ایک اچھے پروفیسر کی حیثیت سے متعارف کرانے کے لیے کافی ہیں۔ اس طرح "مریض قلب" میں قلب کے جملہ امراض پر ماہرانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ "مائگریٹری برڈ" میں پرندوں کے جملہ اقسام اور اس کے عادات و خصوصیات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ ساری باتیں اتنے فن کارانہ انداز میں کرداروں کی زبانی ادا ہوئی ہیں کہ کہیں بھی افسانے کا فن مجروح ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے فطری حسن کی چاندنی کہیں ماند پڑتی نظر نہیں آتی اور ہر افسانہ صحت و سلامتی کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔

"عورت" میں اقبال انصاری نے عورت سے متعلق جن مسائل و معاملات پر روشنی ڈالی ہے ان کا تعلق کسی خاص ملک و ملت یا جغرافیائی حد بندیوں سے نہیں، بلکہ وہ آفاقی اور عالمگیر ہیں اور بلا قید زمان و مکان وہ مسائل موجود رہے ہیں۔ لیکن عصری زندگی ان سے کچھ زیادہ ہی متاثر اور لہولہان ہے۔ یہاں سارے افسانوں کا تجزیہ ممکن نہیں۔ افسانہ "سمندر" جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے وہ عورت کی اس فطرت کا مظہر ہے کہ مرد کتنا ہی وجیہ و شکیل اور علم کا پہاڑ کیوں نہ ہو اگر وہ مردانہ صلاحیتوں سے محروم ہے تو اپنی بیوی کو مسرور و مطمئن نہیں رکھ سکتا۔ ڈاکٹر آباد فارسی، جو بحری علوم کے ماہر تھے، انھوں نے ڈاکٹر تاثیر (جو ادب کی اچھی طالبہ تھیں) سے شادی کی مگر ان کی نا اہلی کی وجہ سے ازدواجی زندگی کامیاب نہ ہو سکی۔ انھوں نے گلو خلاصی کے لیے ایک جال پھیلایا جس میں خود پھنس گئے۔ اس طرح کا تجربہ اور مشاہدہ آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے افسانہ نگار نے تخیل کی تتلی پکڑنے کے بجائے اپنے فن کی اساس بالکل حقیقت اور واقعیت پر رکھی ہے۔

افسانہ "عظیم" سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ عورت فطری طور پر ایثار قربانی اور محبت و ہمدردی کا مجسمہ ہوتی ہے جیسا کہ ڈاکٹر سعدیہ اور عظیم بانو کے کردار سے مترشح ہے۔ اس طرح کے ایثار کی مثالیں اگرچہ ہمارے اس خود غرض اور خود پرست معاشرے میں کم ملتی ہیں، مگر ملتی ہیں، یہاں بھی افسانہ نگار نے کسی ماورائی دنیا کی کہانی سنانے کے بجائے ارضیت کی خوشبو سے اپنے افسانوں کو بسایا ہے۔ جذبہ حب الوطنی پر روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر اقبال ہندوستان سے تاشقند یونیورسٹی کی دعوت پر وہاں پہنچتا ہے۔ وہاں ایک ازبک لڑکی سے اس کی گہری شناسائی ہو جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگتے ہیں مگر جب شادی کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو اقبال کی پیش کش پر حمیرا جواب دیتی ہے کہ شادی کے بعد مجھے تمہارے ملک جانا ہوگا اور یہ میں کر نہیں سکتی۔ اس جواب میں اقبال کہتا ہے "اگر تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں تو میں تمہارے ساتھ رہوں گا" اس کے جواب میں حمیرا کی زبانی جو کچھ کہلوایا ہے اس کو اگر آب زر سے لکھوایا جائے تو بھی اس کی صحیح قدر و قیمت کا تعین نہیں ہوگا۔ ملاحظہ ہو۔

"جو شخص ایک عورت کے لیے اپنے ملک جیسی عظیم ترین شئے کو چھوڑ سکتا ہے وہ کل اپنے کسی مفاد کے لیے اپنی عورت کو بھی چھوڑ سکتا ہے۔"

میرے خیال میں حب الوطنی کے موضوع پر اس سے موثربات اور کوئی نہیں کہی جا سکتی۔ افسانہ "ایک بیہودہ سفر" میں ایک بیہودہ صفت انسان عدیل صباحی کے کردار کو پیش کیا گیا ہے جو طلاق دینے اور نئی شادیاں کرنے کو ہی حاصل زندگی سمجھتا ہے۔ اس تناظر میں عرب شیوخ کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں جن کی زندگی کے محبوب مشاغل یہی رہ گئے ہیں۔ کہ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

اس افسانے کی ہیروئن ثریا مطلقہ ہونے کے بعد عدیل صباحی سے بڑا خوبصورت انتقام لیتی ہے اور آج واقعی ہمارے معاشرے کی ان مظلوم خواتین کو، جو مردوں کے استحصال کی شکار ہیں، اس طرح کے کردار کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ جس کا درس اس افسانے سے ملتا ہے۔

ڈاکٹر مانوی ایک ماہر فن لیڈی ڈاکٹر ہیں انسان دوست ہیں۔ ایثار واخلاق کا مجسمہ ہیں مگر ان خوبیوں کی کوئی قدر نہیں۔ مردوں کی حریصانہ اور بوالہوسانہ نگاہوں نے ان کے دامن عصمت کو تار تار کر ہی دیا۔ اور جب شریف پور میں، جہاں ان کی پوسٹنگ تھی، ایک بھیانک بیماری پھیلی تو انھیں ظالموں نے ان سے اپنا علاج بھی کرایا۔ ڈاکٹر مانوی چاہتی تو زہریلا انجکشن دے کر تمام گاؤں والوں کو ختم کر سکتی تھیں مگر ان کی فطری رحم دلی نے ایسا سخت قدم نہیں اٹھانے دیا۔ اس کردار کے ذریعے افسانہ نگار نے بتلانے کی کوشش کی ہے کہ عورت فطری طور پر نہایت نرم خو اور ہمدرد ہوتی ہے۔ اس کا انتقام بھی شدید ہوتا ہے لیکن ایسا شاذ ونادر ہی ہوتا ہے اور کبھی کبھی کی لہر کو دریا نہیں کہتے۔

اس مجموعے کے تمام افسانوں پر تبصرہ ممکن نہیں۔ بحیثیت مجموعی عورت کی نفسیات کے بوقلموں پہلوؤں پر اس سے اچھا افسانوی مجموعہ بیسویں صدی کے آخری ربع میں نہیں آیا ہے۔ اس کے لیے اردو ادب میں اس کو ایک قیمتی اضافہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اقبال انصاری اس لیے ہم سب کی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

کتاب کا نام	: ذکر محفوظ
مرتب وناشر	: کمال جعفری، معرفت ہارون رشید 114/A، مدن موہن برمن اسٹریٹ، کلکتہ۔7
صفحات	: ۱۰۴
قیمت	: ۳۵ روپے
مبصر	: مشتاق انجم

❁ خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر محفوظ الحق کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ "ذکر محفوظ" کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس کا سہرا بلاشبہ کتاب کے مرتب جناب کمال جعفری کے سر جاتا ہے۔ کمال جعفری کا شمار اردو کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے ان کے دو شعری مجموعے "عکس تمنا" اور "حرف دلنواز" شائع ہو کر شرف قبولیت خاص وعام حاصل کر چکے ہیں۔

زیر نظر کتاب "ذکر محفوظ" میں کمال جعفری نے پروفیسر محفوظ الحق کی حیات و خدمات کا مختصراً جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد ترتیب وار پروفیسر صاحب کے علمی اور تحقیقی مضامین کو پیش کیا ہے جس سے اردو کے طلباء استفادہ کر سکتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ دنیا میں کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے علمی اور تحقیقی کارناموں پر دنیا ناز کرتی ہے۔ پروفیسر محفوظ الحق ان اہم ہستیوں میں سے ہیں جن سے علم و ادب کے شائقین ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔ پروفیسر محفوظ الحق اپنی تصانیف مقالات فارسی اور اردو کے حوالے سے ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔

امین رازی کے تذکرہ ہفت اقلیم۔ دتاسی کے تذکرہ شعراء اردو، زیب النساء اور دیوان مخفی سے متعلق ان کے مقالات ہمیں چونکاتے ہیں۔ دیوان کامران، مجمع البحر، ہفت اقلیم اور رباعیات عمر خیام کی ترتیب و تدوین کا کام بڑے سلیقے سے انہوں نے انجام دیا ہے۔

ان تحقیقی و تدوینی کاموں کے علاوہ پروفیسر محفوظ الحق نے اردو اور انگریزی میں بہت سے گرانقدر علمی اور تحقیقی مقالات سپرد قلم کئے۔ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ذہین اور سچے محقق تھے۔ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے مختلف ذرائع سے معلومات فراہم کر کے اطمینان کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مقالات علمی اور معیاری تحقیق کا نمونہ ثابت ہوئے ہیں۔

کتاب کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ پروفیسر محفوظ الحق کی پیدائش ۱۹۰۰ء میں ضلع پٹنہ کے موضع سعد اللہ پور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے والد عبدالحمید کے ساتھ کلکتہ چلے آئے۔ مدرسہ عالیہ سے یونیورسٹی تک کے سارے تعلیمی مراحل کلکتے میں طے کیے۔ ہمیشہ اپنے درجات میں اول آنے والے محفوظ الحق اپنی علمی استعداد اور خداداد ذہانت کی وجہ سے بہت جلد برسر روزگار ہو گئے۔ پہلے رپن کالج، اس کے بعد پریسڈنسی کالج میں عربی فارسی اور اردو کے صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے اسلامی تاریخ کے شعبے میں جز وقتی لکچرر بھی رہے۔ کلکتہ کی ایران سوسائٹی بھی ان کی خدمات سے مستفید ہوئی۔

افسوس کہ پروفیسر محفوظ الحق کی عمر نے ان سے وفا نہ کی۔ وہ ایسی عمر میں دار فانی سے کوچ کر گئے جب ان کا علمی ذوق پختہ تر ہو رہا تھا، نظر میں وسعت پیدا ہو رہی تھی۔ اپنی پینتالیس سالہ عمر میں انہوں نے ادب کی جس قدر خدمت کی اُسے کس طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

جناب کمال جعفری صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک مرحوم استاد کی یاد تازہ کرتے ہوئے "ذکر محفوظ" کو ترتیب دیا اور روایتی سج دھج کے ساتھ شائع کیا۔ اُمید ہے اردو ادب کے قارئین اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

نام کتاب : حرف دلنواز (شعری مجموعہ) مصنف : کمال جعفری	
صفحات : ۱۲۰ قیمت : ۲۵روپے مبصر : فیروز عابد	
ناشر : کمال جعفری معرفت ہارون رشید 14/A مدن موہن برمن اسٹریٹ، کلکتہ-7	

"حرف دلنواز" جانے پہچانے شاعر کمال جعفری کے شعری مجموعے کا نام ہے۔ اس مجموعے میں ایک حمد، ایک نعت، ۵۶ غزلیں، ۲۱ نظمیں، ۱۳ قطعات، اور ۷ ماہیے شامل ہیں۔ قبل ازیں ۱۹۸۱ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ عکس تمنا منظر عام پر آچکا ہے۔

کمال جعفری تقریباً ۲۵ برس سے شعر کہہ رہے ہیں، غزل ان کا بنیادی وسیلہ اظہار ہے۔ ان کے زیر نظر مجموعے کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ ان کے شعری موضوعات، فکری مسائل اور طرز احساس کے مطابق ترقی پسند ہیں۔ فلیپ پر اعزاز افضل، نثار احمد فاروقی اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی آراء شامل ہیں۔ کمال جعفری دور حاضر کی معاشرتی، سماجی اور سیاسی نشیب و فراز کا ادراک اور شعور رکھتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا کمال جعفری ترقی پسند ہیں وہ ذہن و دل کی آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔ معاشرے کی بے حسی کا منظر نامہ ان کے بہت سارے اشعار میں عیاں ہے۔

بقول اعزاز افضل "کمال کے دل و دماغ کے نشو و نما میں صوفیائے کرام کے معتقدات و نظریات نے اہم کردار ادا کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس جوان صالح کا دل قومی اتحاد، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، مذہبی رواداری اور انسانی ہمدردی سے لبالب بھرا ہے اور یہی جذبات جب فن کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو کمال کی حسین شاعری صورت پذیر ہوتی ہے۔"

کمال جعفری اصلاح نفس کے قائل ہیں۔ حرف دلنواز کی پہلی غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

انا کو خاک میں اپنی ملا کے دیکھ ذرا
فنا کی شکل میں جلوے بقا کے دیکھ ذرا
وفا کی آنچ سے پتھر بھی موم ہوتا ہے
تو سنگ دل سے بھی رشتہ بڑھا کے دیکھ ذرا
ترا وجود مہک جائے گا محبت سے
دیا خلوص کا دل میں جلا کے دیکھ ذرا

کمال جعفری سیدھے سادے بااخلاق اور تصوف کا مذاق رکھنے والے شاعر ہیں۔ وہ زمینی خداؤں سے نہیں ڈرتے لیکن اپنے رب کا ڈر ہر وقت اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

اپنے برتاؤ سے ماحول گوارا رکھئے
ذہن کے ساتھ ذرا دل بھی کشادہ رکھئے

ہم کو بچپن سے بزرگوں نے یہ دی ہے تعلیم
اپنے کردار کو ہر حال میں اچھا رکھنے
شوق سے کوئی ملنے آئے تو
اپنے چہرے کو زرد مت رکھنا

کمال جعفری کے خیال میں شاعری تزکیہ روح اور عروج انسانی کا نہایت موثر ذریعہ ہے۔

جو مانگنا تھا مانگ چکا اپنے رب سے میں
اب میرے لب پہ حرف دعا ڈھونڈتے رہو
پہلے پیدا کرے اوصاف حمیدہ خود میں
پھر کرے عزم کوئی قوم کی سرداری کا

کمال رنج و غم ہنستے ہنستے جھیل لیتے ہیں وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہیں وہ دشمنوں سے بھی دوستوں جیسا برتاؤ کرتے ہیں۔

پھول کی مانند ہر دم مسکراؤ دوستو
دیکھتے ہی دیکھتے ہر غم فنا ہو جائے گا
دشمنوں سے جو کرے گا دوستوں جیسا سلوک
شہر میں ہر شخص اس کا ہمنوا ہو جائے گا

کمال جعفری نے نظمیں بھی کہی ہیں اور قطعات بھی کہے ہیں ان کی نظمیں معاصر شخصیات پر ہیں اور قطعات بزرگ شعراء و اساتذہ کے فن اور شخصیت پر ہیں۔ بقول مناظر عاشق ہرگانوی "کمال جعفری کے اس مجموعے کی شاعری میں نئے معنوی پیرہن کی بھیگتی بوندیں زندگی کی صحت مند قدروں کا واضح تشخص یاد کی خوشبو اور شعور کی آگہی ہے۔ کمال جعفری دلنواز آدمی ہیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے شعری مجموعے کا نام "حرف دلنواز" رکھا ہے۔ کمال جعفری کا یہ ماہیا ملاحظہ کریں۔

حیوان صفت کیوں ہو / چھوڑ کے ہر فتنہ / انسان بنو لوگو!

کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔ کاغذ عمدہ ہے اور سرورق کمال جعفری کی طرح دلنواز ہے۔ امید ہے اہل اردو اس خوبصورت شعری مجموعے کا بھرپور خیر مقدم کریں گے۔

نام کتاب	: تعبیر و تشریح
نام مصنف	: محمد ایوب واقف
ناشر	: کے ۳۰۲۔ تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی ۱۱۰۰۳۱
قیمت	: ایک سو پچاس روپے
مبصر	: پروفیسر خورشید نعمانی

❋ زیر نظر کتاب "تعبیر و تشریح" محمد ایوب واقف کے سلسلۂ تصانیف کی ساتویں کڑی ہے۔ ابتداء میں سوانح و کوائف کے بعد کتاب کا انتساب اپنی اولادوں کے نام اقبال کے ابرحیات آفریں

شعر سے کیا ہے؟زندۂ مشتاق شو خلاق شو نجو ما گیرندہ، آفاق شعر پھر عصر حاضر کے ممتاز شاعر سردار جعفری کی مختصر تقریظ ہے جس میں ان کا یہ بلیغ جملہ "شبلی نعمانی کی پر نور پر چھائیں پڑی ہے.." اپنے اندر ایک جہان معانی رکھتا ہے۔ اپنے دیباچہ (۷۔۱۵) میں میں انھوں نے اپنے ادبی محرکات، فکری جہات اور موجودہ کتاب کے مضامین سے متعلق اجمالی طور پر اپنے خیالات پیش کیے ہیں جو کہ قابل قدر ہیں اور ان کے ذہن و مزاج کو سمجھنے میں ممد و معاون ہوں گے۔ ان پر یہ اقتباس قابل توجہ ہے۔

"پہلی ضروری بات کتاب میں شامل مقالات کے بارے میں مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ ان مقالات کو محض تفریح طبع یا وقت گذاری کے لیے نہیں لکھا گیا ہے بلکہ انھیں ایک خاص مقصد اور مشن کے تحت سپرد قلم کیا گیا ہے۔ اچھی اور کار آمد کتابوں کا سنجیدہ مطالعہ اور مستحسن و مشرف عنوانات پر لکھنا یہ دونوں چیزیں مشکل تو ضرور ہوتی ہیں لیکن انھیں چیزوں نے ان کی زندگی کو ہمیشہ وقار اور عظمت بخشا ہے۔ میں نے ہمیشہ سنجیدہ مطالعہ کو ترجیح دی ہے اور انھیں عنوانات پر خامہ فرسائی کی ہے جس سے آداب زندگی کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔"

"اقبال اور کلام اقبال میری نظر میں" فکر اقبال کو سمجھنے میں مدد کرے گا انھوں نے اس مضمون میں اقبال کی اہم جہت شاعری پر اجمالاً اظہار خیال کیا ہے اور ان سے متعلق معاصر کتابوں سے ہی مستفید ہوئے ہیں "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" اردو کے تاریخی کردار کو پیش کرتا ہے، غزل اردو شاعری کی آبرو رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی یہ بات ان کے مضمون "ختم ہونے کو نہ آئے گا غزل کا موسم" سے یقیناً عیاں ہوتی ہے "شبلی اور سرسید ایک نظر میں" ایک اچھا تجزیہ اور وسیع مضمون ہے جن میں انھوں نے دونوں اکابرین ملت اور ادب کا متوازن جائزہ لیا ہے، میرا سفر۔ ایک تجزیہ اور تخلیقی قوتوں کا انمول خزانہ، علی سردار جعفری، یہ دونوں مضامین سردار جعفری کے فکری وفنی نقطۂ نظر کو سمجھنے میں معید ہوں گے، واقف سردار جعفری کی تخلیقی و تجریدی صلاحیتوں کے معترف و مداح ہیں۔ اس کے نقوش زندگی ثبت رہیں گے تا ابد "ایک رپورتاژ ہے۔ بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے متعلق مولانا آزاد سمینار کا انعقاد ممبئی میں ہوا تھا جس سے مولانا آزاد کی فکری جہات اور سیاسی مسلک کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ پھر ان کے درمیان "شہر سخن کا البیلا سخن ور، اختر الایمان اور لال کو نخی کا لعل۔ واقف جونپوری کے فکر و فن کے اچھے تجزیے ہیں اور ان کے انفرادی، شعری و فنی محاسن کو خوبی سے واضح کرتے ہیں۔ ہماری زبان اور ہمارا رسم الخط میں انھوں نے اردو کے مختلف ادیبوں و شاعروں کے رسم الخط سے متعلق خیالات و نظریات پر بحث کی ہے۔ کسی سے اتفاق کیا ہے، کسی سے اختلاف کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ رسم الخط ہی کسی زبان کی شناخت ہوتی ہے۔ اس کے رسم الخط کو بدلنے کی بات لغو اور بے معنی ہے۔ "پنڈت بدری ناتھ سدرشن حیات اور فن "اردو کے اس مظلوم افسانہ نگار اور ادیب کو ایک خراج عقیدت ہے اور ۳۰ صفحات میں ان کی فکری و فنی جہات کا قابل قدر تجزیہ ہے اور مستقبل میں ان پر کام کرنے والوں کے لیے ایک اہم ماخذ بھی۔ آخر میں

ضمیمہ کے طور پر انھوں نے بعض اصناف علم، نقادانِ ادب اور اخبار ورسائل کے مختصر اقتباسات جو ان کی کتابوں سے متعلق لکھے گئے ہیں پیش کئے ہیں جس سے ان کی تحریروں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

واقف ایک کہنہ مشق ادیب و نقاد ہیں ان کی تصنیفی زندگی کی عمر تقریباً ۳۵ سال ہے۔ انھوں نے متنوع عنوانات پر لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ وہ کسی "ازم" کا شکار نہیں ہیں اپنی ایک صاحب اور واضح رائے رکھتے ہیں جو کہ ان کی تمام تصانیف اور مضامین سے عیاں ہے۔

بحیثیت مجموعی "تعبیر و تشریح" اردو کے انتقادی ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ امید ہی نہیں یقین واثق ہے کہ اسے اردو کے علمی وادبی حلقہ میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ کتاب کا ٹائٹل دیدہ زیب، کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ، قیمت بھی مناسب ہے۔

نام کتاب	: نریندر کے لیے (شعری مجموعہ)
شاعر	: جگدیش پرکاش
صفحات	: ۱۳۵ (اردو) + ۹۹ (ہندی) = ۲۳۴
قیمت	: ۱۵۰ روپے
ناشر	: ساقی بک ڈپو، اردو بازار دہلی ۱۱۰۰۰۶
مبصر	: رضیہ سلطانہ

❁ "نریندر کے لیے" جگدیش پرکاش کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ "دھوپ کی خوشبو" چھ سال پہلے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔ جگدیش پرکاش نے شاعری کس طرح شروع کی اس کے تعلق سے وہ خود کہتے ہیں!

"پیدائش لاہور میں اور وہیں چھٹی جماعت تک تعلیم اردو میڈیم سے ہوئی۔ ملک تقسیم ہو۔ اور اس کے ساتھ خانہ بدوشی اور آوارگی کے ایک نئے اور طویل دور کا آغاز ہوا۔ اردو تعلیم کا اختتام۔ مشرقی پنجاب اور اتر پردیش کے تقریباً چھ شہروں میں سکونت پذیر رہا۔ آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ کام کی ڈگری حاصل کی۔ ہندوستان اسٹیل لمیٹڈ کے انتظامیہ میں تقرر ہو جانے پر راؤر کیلا اسٹیل پلانٹ میں معمور ہوا۔ اس ملازمت کے اختتام پر شہر دہلی کو اپنی قیام گاہ بنایا۔

اردو زبان اس کی لطافت، طرز بیان اور اس کی شیرینی کا اثر، جو لاہور کی ابتدائی زندگی اور تعلیمی دور میں ذہن پذیر ہو چکا تھا اور دل کی گہرائیوں میں پیوست تھا وہ آج تک فہم و فکر کو گدگداتا رہا ہے۔ تقریباً ۲۸ برس تک راؤر کیلا میں رہا۔ زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے جذبات و احساسات کی سرزمین پر نئی نئی پرتیں چڑھتی گئیں۔ بہت سے بھرم ٹوٹے، نئے افکار کی تشکیل ہوئی۔ جذبات کو طرز عبارت ملتا گیا۔ خیالات الفاظ کا اور اشعار کا جامہ پہنتے رہے......"

اس طرح جگدیش پرکاش شاعر بن گئے۔ ان کے ایک کرم فرما انیس انصاری (جو خود شاعر ہیں) نے انھیں شاعری سے متعلق بیش قیمت مشورے دیے اور لکھنو کے مشہور شاعر والی آسی نے جگدیش پرکاش کی استادانہ رہنمائی کی۔

جگدیش پرکاش کی شاعری حالانکہ غیر شاعرانہ ماحول (راؤر کیلا کا اسٹیل پلانٹ) میں پلی لیکن ان کی ریاضت، خلوص اور اردو زبان سے غیر معمولی انسیت نے انھیں پختہ گو شاعر بنادیا۔ ان کے جذبات و احساسات ہی ان کے اشعار ہیں۔

اے زمانے تری تاریخ کا حصہ نہ سہی
گردش دہر کو غم خوار بنایا میں نے
نہ تخلص، نہ کوئی اسم گرامی نہ رسوخ
اپنے جذبات کو اشعار بنایا میں نے

چنانچہ اپنے جذبات کا اظہار انھوں نے "نریندر کے لیے" بھی کیا جو ان کے عزیز از جان دوست ہے۔ اپنے خلوص اور نریندر سے والہانہ لگاؤ کے پیش نظر مجموعہ کا نام بھی نریندر کے لیے ہے۔ جگدیش پرکاش کا کہنا ہے کہ کتاب کا یہ عنوان میری شاعرانہ کاوشوں کا آئینہ دار نریندر ہے اس لیے میرے تئیں میری اس تخلیق کا یہ عنوان ہی موزوں ہے۔ نریندر کیا ہے؟ نریندر کون ہے؟ ان سوالوں کے جواب کے لیے کتاب کا مطالعہ کیجیے۔ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے دائیں جانب سے ۱۲۵ صفحات اردو کے لیے وقف ہیں اور بائیں جانب سے ۹۹ صفحات میں اردو شاعری کو ناگری رسم الخط میں شائع کیا گیا ہے اور مشکل الفاظ کے معنی اور ہندی متبادل حاشیہ میں درج کیے گئے ہیں اس طرح اردو اور ہندی جاننے والے بیک وقت ایک ہی کتاب سے جگدیش پرکاش کی شاعری سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اردو حصے کے ابتدائی ۸۳ صفحات میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ اس کے بعد گوشہ نریندر شروع ہوتا ہے اس حصہ میں چند قطعات، نظمیں، غزلیں اور ہائیکو ہیں جو نریندر کی شخصیت کا عکس پیش کرتے ہیں۔ نریندر کے لیے کا ایک قطعہ ملاحظہ فرمائیں۔

سیاہ وقت سے لڑتا تیرا شعور رہا
میں زندگی کے تلاطم سے دور دور رہا
جدا جدا تھا ہمارا سفر مگر پھر بھی
مجھے یقیں تیری آمد کا کچھ ضرور رہا

واقعہ یہ ہے کہ جگدیش پرکاش نے اپنی دلی کیفیات کو شعری جامہ پہنایا ہے ایسا جامہ جو تن ڈھانپتا بھی ہے اور بقول حسرت موہانی

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بہ خود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیراہن تمام

بلا تخلص کے اس شاعر کے کلام کا ایک بار مطالعہ ضرور کیجیے، ممکن ہے یہ آپ کو ایک سے زائد بار پڑھنے پر اکسائے۔

کتاب "نریندر کے لیے" سرورق تا آخری صفحہ معیاری کمپوزنگ اور اعلیٰ طباعت کی آئینہ دار ہے۔ نفیس کاغذ کے ساتھ جلد بندی کا خاص اہتمام کیا گیا ہے تاکہ نازک مزاج قارئین پر اس کی قیمت گراں نہ گزرے۔

نام جریدہ	: فکر نو (ذاکر حسین کالج کا اردو ادبی جملہ)
سرپرست	: سلمان غنی ہاشمی (پرنسپل کالج)
نگران مدیر	: ڈاکٹر محمد فیروز
صفحات	: ۱۲۰
ملنے کا پتہ	: ذاکر حسین کالج، جواہر لال نہرو مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
مبصر	: ناصر دہلوی

٭ "فکر نو" طلبہ ذاکر حسین کالج (نئی دہلی) کا ادبی مجلّہ ہے جو سال میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ حالیہ تعلیمی سال (۲۰۰۰۔۲۰۰۱ء) کا مجلّہ "نامور فرزندان کالج" کے عنوان سے خصوصی شمارہ ہے۔ جس میں اینگلو عربک کالج (حال ذاکر حسین کالج) کے نامور طلبہ آغا محمد اشرف، فضل حق قریشی دہلوی، سید انصار ناصری، صادق الخیری، معین احسن جذبیؔ، علی سردار جعفری، اخترالایمان، مظفر شکوہ، جمیل الدین عالیؔ اور مسلم احمد نظامی کے زمانہ طالب علمی کی نثری اور شعری تخلیقات شائع کی گئی ہیں۔ ایسی تخلیقات جوان ادیبوں اور شاعروں نے اپنے کالج میگزین کے لیے تحریر کی تھیں۔ ان میں بعض تحریریں ستر بہتر سال پرانی ہیں۔ ان تحریروں سے متعلق فکر نو کے نگراں مدیر ڈاکٹر محمد فیروز نے اداریے (اپنی باتیں) میں لکھا ہے کہ "آج کا ذاکر حسین کالج ماضی میں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۵ء تک دلی کالج اور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۴۷ء تک اینگلو عربک کالج کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ شمالی ہند کا ایسا تعلیمی ادارہ ہے جو دہلی میں ۱۹۲۴ء میں دلی کالج کے نام سے مدرسہ غازی الدین اجمیری گیٹ میں جاری ہوا تھا۔ قدیم دلی کالج کے بعد اینگلو عربک کالج نے بڑی بڑی نامور ہستیوں کے علم کی پیاس بجھائی اور انھوں نے بعد میں اپنے کارناموں سے علم و ادب، سیاست اور صحافت میں چار چار چاند لگائے۔ یہ کالج شمالی ہند کی علمی، ادبی اور تہذیبی تاریخ کا سنہرا باب ہے۔ اس کے اساتذہ اور طلبہ نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی، مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کامیاب، کامران رہے ملکی اور غیر ملکی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔

اینگلو عربک کالج کے ایسے طلبہ جنھوں نے آگے چل کر اردو شعر و ادب میں صاحب طرز ادیب اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے اپنا مقام بنایا انھیں طلبہ کی تحریریں آپ کے سامنے ہیں..... کالج کے ان نامور فرزندوں کی تحریریں موجودہ نسل کے لیے باعث فخر و مسرت بھی ہیں اور مقام عبرت بھی۔ مقام عبرت اس لیے کہ آج کے طلبہ پڑھنے اور لکھنے سے کتراتے ہیں۔ ممکن ہے عہد ماضی کے ان نامور فرزندان کالج اور طلبہ کی تحریریں آج کے طلبہ میں حرکت و حرارت پیدا کریں۔"

واقعہ یہ ہے کہ نامور فرزندان کالج نمبر دیکھ کر شدت سے احساس ہوتا ہے کہ سردار جعفری، اخترالایمان، معین احسن جذبیؔ وغیرہ ایک دن میں شہرت کے بام پر نہیں پہنچے بلکہ ان ادیبوں اور شاعروں

نے لڑکپن میں جس قدر محنت اور ریاضت کی اور اپنی صلاحیت و ذہانت کا مظاہرہ کیا اور ہمہ وقت مصروف عمل رہے۔ یہ شہرت یہ عزت اور یہ مقام اس زمانہ طالب علمی کا نتیجہ وغیرہ ہے۔ زمانہ طالب علمی کی تحریریں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس وقت انٹر اور بی۔اے کے طلبہ کس قدر پختہ قلم نثر نگار اور شاعر تھے۔ ان تحریروں کو پڑھ کر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ "طلبہ" کی تحریریں ہیں۔ گو ان میں سے بیشتر تحریریں ان باکمالوں نے اپنی بعد میں شائع ہونے والی کتابوں اور مجموعوں میں شامل نہیں کیں مگر آج بھی یہ اس لائق ہیں کہ انھیں پڑھا اور سمجھا جائے کیونکہ یہ اپنے قلم کاروں کے بتدریج ذہنی ارتقا کا پتہ دیتی ہیں۔

سردار جعفری نے ابتدا میں افسانے لکھے اور ان کا افسانوی مجموعہ بھی شائع ہوا لیکن اختر الایمان کے افسانوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ اختر الایمان نے اپنی سوانح حیات "اس آباد خرابے میں" اپنے افسانوں کے تعلق سے لکھا ضرور ہے کہ وہ اس دور کے بعض رسائل میں شائع ہوئے لیکن وہ ان افسانوں سے مطمئن نہ تھے۔ فکر نو کی مذکورہ اشاعت میں اختر الایمان کے کئی افسانے ہیں جو اختر الایمان کی افسانہ نگاری کا ابتدائی ثبوت ہیں۔

فکر نو کا نامور فرزندان کالج نمبر اردو شعر و ادب پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے انتہائی سود مند ہے کیونکہ اس خصوصی شمارے میں متذکرہ ادیبوں اور شاعروں کی زمانہ طالب علمی کی تحریر یکجا مل جائیں گی۔

ذاکر حسین کالج کے پرنسپل سلمان غنی ہاشمی صاحب اور نگراں مدیر ڈاکٹر محمد فیروز ہم سب کی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس اشاعت خاص کا اہتمام کیا اور الماریوں میں بند اس خزانے کو عام کیا۔ امید ہے کہ نہ صرف کالج کے طلبہ استاد بلکہ اردو شعر و ادب کا مطالعہ اور تحقیق کرنے والے اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔ ●●

حلف نامہ

بابت فارم نمبر ۴

رجسٹرار آف نیوز پیپر ایکٹ کے مطابق بیان بابت ملکیت وجملہ تفصیلات:-

"ایوانِ ادب"

۱. مقام اشاعت:- ۲۹۳۶۔ کلاں مسجد، ترکمان گیٹ، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

۲. وقفۂ اشاعت:- سہ ماہی

۳۔۴. پرنٹر، پبلشر:- وحیدہ بیگم (اہلیہ حاجی انیس دہلوی مرحوم)

قومیت:- ہندوستانی

پتہ:- ۲۹۳۶۔ کلاں مسجد، ترکمان گیٹ، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

۵. چیف ایڈیٹر:- کفایت دہلوی

قومیت:- ہندوستانی

پتہ:- ۲۰۷۲-۷۳۔ گلی قطب الدین، کلاں مسجد، ترکمان گیٹ، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

۶. ملکیت میں کوئی حصہ دار نہیں ہے۔

میں وحیدہ بیگم اقرار کرتی ہوں کہ مندرجہ بالا اندراجات بالکل درست اور صحیح ہیں۔

دستخط

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر

وحیدہ بیگم

۲۸ر فروری ۲۰۰۱ء

Printer, Publisher, Owner : Wahida Begum (W/o. Anis Dehlvi Late) 2936, Kalan Masjid, Turkman Gate, Delhi-110006 Printed at Rehbar Offset Printers, 2072-73, Gali Qutubuddin, Turkman Gate, Delhi-110006

Registered with the Registrar of Newspapers for India R. No. DEL URD/2000/1304
Special Issue-2001
Vol. No. 2 Issue No. 4-5
Aiwan-e-Adab Quarterly
2936, Turkman Gate, Delhi-110006 Price Rs.60/=